پسِ حجاب

پروفیسر احمد رفیق اختر

www.bookmaza.com

فہرست

آغاز کیسے ہوا؟ 7
کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق 10
باطن میں جھانکنے کی صلاحیت 10
بھٹکنے سے بچ گئے 12
تحقیق و جستجو و اخلاص 14
تصوف کی مشکل لائن 17
مذہبی تعلیمات بمقابلہ تصوف 18
روحانیت کی طرف سفر 20
روحیت اور روحانیت 23
ذہنی اور روحانی سفر 24
تصوف اور سائنس میں ارتباط 25
مولوی اور صوفی کے مظاہر 29
بابے اور رومانٹزم 31
ذکرِ الٰہی، صورت اور اہمیت 36
وظیفہ اور تسبیح میں فرق 37
تسبیحات بلاناغہ ضروری 41
تسبیح کی رکاوٹیں 43
وظائف و اذکار پر نظرِ ثانی 45
میری تسبیحات کا انتخاب 48
علمِ باطن، خصوصی پراسس 53
علمِ نجوم، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی 55
اوراد، وظائف، چلّہ کشی 58
مراقبہ کا مقام 60
تصورِ شیخ کی حیثیت 60
فورسز بی یانڈ کی تسخیر 62
اسمائے حسنہ کا موضوع 63
متعین اسمائے حسنہ ہی کیوں 65
یکساں نام بنتا نہی کیونکر 68
اسمِ اعظم کی حقیقت 69
اسمِ اعظم کا تصرف 71
کیفیات بسلسلہ خدا 76
الجھنوں کے بھنور سے نجات 79

عشق کی تعریف 81
محبت پر غفلت کا غلبہ 81
وقت کیا ہے؟ 82
زمان و مکاں کی تخلیق 83
چھ دنوں میں پیدائش 85
زمانہء آخرت میں 87
جنت میں وقت 88
آخرت کے مختلف قوانین 90
عہدِ میثاق، اتمامِ حجت 91
روح کا وجودِ لازوال 92
مسئلہ تناسخ یا آواگون 93
آدم کی اصل 94
تخلیقِ آدم کا نظریہ 96
آدم کی برتری 99
آدھے دن کا اضافہ 101
صورِ اسرافیل کے پراسیس 102
شمسی نظام کی قیامت 102
باقی کائناتوں کی قیامت 104
یومِ حساب یکساں یا الگ 105
دوزخ میں جلنے کا عمل 106
قیامِ جنت و دوزخ 107
’’کل من علیھا فان‘‘ 109
غیب کا تصور 112
پیغمبروں کا علمِ غیب 112
غیب کے باوجود اضطراب 114
غیب جاننے کے طریقے 116
ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیاں 117
حضورؐ رحمت للعالمین 118
حضورؐ وجہِ تخلیقِ کائنات 120
احد اور احمد میں فرق 122
شرک اور اللہ کی حساسیت 125
اپنی جان سے زیادہ محبت 127
لامحدود سے ملاقات 128
قصہء نور و بشر 128
خود اپنی ذات پر درود 129
اقبال کا مکتبہء فکر 132
اعتدال کی احسن صورت 134
ذاتی اور پیغمبرانہ حیثیت 136
آزادی میں حائل خدا 140
موسیقی سننے کی آزادی 142

الیاس کے معانی 143
اعتدال، اسلام کو مطلوب 144
صدقات، اہمیت و اثرات 148
اسلام یا مقصدِ اسلام 154
اطمینان بخش آئیڈیا 156
نجات کے لیے کلمہ 159
بازیافتِ خدا بغیر علم 161
نسبت کی اہمیت 165
حقیقی راہنمائی کی طلب 166
علم اور اہلِ علم 168
گیارھویں کیوں منائیں؟ 169
بدعت کی تعریف 171
چار شادیوں کی اجازت 173
حسین بن منصور حلاج 173
فطرت کی تعریف 176
علم کی انتہا حیرت 177
ماننے والوں میں فرق 178
قبر کی بھینچ 180
تلاشِ خدا سے لاتعلقی 181
دعا مانگنے سے احتراز 182
انسانی کیمسٹری میں فرق 184
غلام احمد پرویز کا تھیسز 186
جعلی نبوت اور کامن سنس 186
تعلیم سے آراستہ کون؟ 189
تعلیمی پالیسی کیسی ہو؟ 193
دینی تعلیم، نہج اور سطح 195
آزادی، نصاب و تعلیم 196
سکول آف ایکسی لینس 198
اسلامائزیشن آف نالج 204
تعلیم میں زبان کا کردار 206
قومی زبان کا کمپلیکس 208
قومی زبان اردو یا انگریزی 209
یورپ سے علم کی واپسی 212
مرض، علاج اور خدا 213
سائیکاٹری اور روحانیت 215
علاج بذریعہ قرآنی آیات 216
طبِ نبوی کی حیثیت 217
میڈیسن، روحانیت سے انکار 218
کلینیکل ڈیتھ، سہل موت 221
میڈیسن سے زندگی کا اختتام 223

از خود زندگی کا خاتمہ 224

برصغیر کی تقسیم نامناسب 225

پاکستان، راہِ فرار 227

پاکستان کا مسئلہ 229

پاکستان، تعمیر میں خرابی 231

پاکستان، ایک نیشن سٹیٹ 234

پاکستان میں اسلام 236

پاکستان کا مستقبل 238

آغاز کیسے ہوا......؟

میرا طرزِ زندگی ذرا سا مختلف رہا ہے۔ یہ بہت عام سا نہیں ہے۔ میں نصابی کتابوں کا بہت پڑھنے والا، بلکہ بے انداز پڑھنے والا لڑکا تھا، جو اپنی کتابوں کے علاوہ یہ چاہتا تھا کہ دیمک کی طرح ہر صفحہ چاٹ جاؤں۔ میرے اندر تجسس بے پناہ تھا۔ آپ دیکھیں میرا تعلیمی ریکارڈ بڑا خراب ہے۔ میں اتنا تھوڑا سا کام کر لیتا تھا کہ ایف اے، گریجویشن اور ایم اے کر لوں۔ سوا سوا سال کلاسوں میں نہیں گھستا تھا اور اس چکر میں رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اقسام کا علم حاصل کر لوں۔

زیادہ سے زیادہ ورائٹی کا تھوڑا سا ثبوت آپ کو دے دوں۔ میں نے فرسٹ ایئر میں ڈاکٹر ژواگو کو بھی پڑھا ہوا تھا۔ بخاری کی حدیث بھی اور موپاساں کے 188 افسانے بھی پڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک وقت میں تقریباً تمام ہی علوم پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔ شاید میرا اندر عجب تھا۔ ایک انا تھی کہ مجھے دنیا کا سب سے علم رکھنے والا شخص ہونا چاہیے۔ میرے اس تنکزے خیال کا باعث تھا کہ مجھے کوئی فرد کسی بھی انفارمیشن کے میدان میں ممکنہ حد تک چیلنج نہ کر سکے۔

یہ خالی مشرق کی بات نہیں تھی۔ میں مغرب کو بھی سامنے لے کر چل رہا تھا۔ رسل، وائٹ ہیڈ، ہیگل یا برگساں ہے۔ اس میں مجھے کوئی عجیب و غریب حادثہ نہیں پیش آیا، نہ کوئی شکستہ دل کا معاملہ تھا۔ میں قدرتی علم میں تجسس کی وجہ سے اتنا کچھ پرکھ رہا تھا، تو علم ایک حد کے بعد ختم

ہوجاتا ہے۔ تھوڑا سا لٹریچر ہے میتھالوجی، فلاسفی ہے ان کو آپ پڑھ لیتے ہیں۔ سائنسز ہیں۔ یہ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ایم ایس سی فزکس کریں۔ اگر آپ کو فلسفۂ طبعیات کا پتہ ہے تو پھر آپ کو آئن سٹائن کی تھیوری جاننے کے سوال میں دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ جب فلسفہ اور سائنس ختم ہو گئے، تو میں حیران ہو گیا۔ اتنے نالج سے میرے تجسس کو جو اطمینان ملنا چاہیے تھا، وہ میسر نہیں آسکا۔ فرسٹریشن سے زیادہ میرا درد بڑھ گیا۔ یعنی جس چیز کو میں نالج ایبل Entity کہتا تھا، وہ نالج ایبلٹی نہیں تھی، وہ اشیاء کے بارے میں چند معلومات تھیں۔ یہ سچائی نہیں تھی، وہ محض تعلق کا علم تھا۔ یہ چیز اس اصول کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی بھی فطرت اشیاء کا علم نہ تھا۔ سادہ تعلق کی بات تھی۔ اس وقت مجھے بہت کرب محسوس ہوا۔

اس کرب میں میرے پاس پانچ جدید فلسفے ایک وقت میں موجود تھے اور یہ پانچوں کے پانچوں خدا کا انکار کرتے تھے۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ یہ سارے علم و تعلم انکار کو جا رہے ہیں۔ بغیر اللہ کو وقت دیئے، کسی تصور کو جانچے اور اعلیٰ فکری سطح پر اس کو پرکھے بغیر آپ اللہ کا انکار کر رہے ہیں۔ ایک دم انتھراپالوجسٹ نے بغیر تحقیق کیے کہہ دیا کہ اللہ انسان کی ضرورت نہیں۔ جس چیز کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں کی، اس کے بارے میں رائے دے دی۔ میں نے چانس لے لیا۔ آٹھ سال خدا کے تصور پر غور و خوض کیا اور آٹھ سال کے بعد میں ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔ مجھے حتمی دلائل مل گئے، جو آج تک خدا کے بارے میں ٹوٹ نہیں سکے۔ میں خدا کے فیور میں نہیں تھا۔ میں انسان کی آزادی کے فیور میں تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری آزادی اور غلامی میں ایک چیز حائل ہے اور وہ اللہ ہے۔ میں اللہ کو کیسے مان لیتا۔ مجھے سب سے مشکل، عجیب اور سب سے بڑا دشمن، جو انسان کا لگتا تھا، وہ خدا کا تصور تھا۔ اس وجہ سے میں اس تصور کے بہت خلاف تھا۔ میں نے بہت محنت اور بڑی کوشش کی، مگر میں اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے تمام اعتراضات، شکوک و شبہات اور میرے دانشورانہ تجسس میں جو شک و شبہ پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ جب یہ ایک دفعہ ختم ہو گیا، تو خدا مستحکم ہو گیا۔ یہ ایک بہت طویل دلیل کا سلسلہ اور پورا تھیسس ہے، جو آج تک میں مرتب نہیں کر سکا۔

چنانچہ سب سے پہلا لیکچر جس موضوع پر میں نے دیا، وہ تھا Allah is the top priority۔ اللہ ترجیح اول ہے۔ میں نے اس پوری تحقیق کو ایک گھنٹے میں ایک چھوٹی سی دلیل کی صورت میں واضح کیا۔ No argument against him۔ میرا اگلا فیصلہ یہ تھا کہ آیا اس کی

طرف چلا جائے کہ نہ چلا جائے۔ یہ جاننے کے بعد بھی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ادھر جانا ہے یا نہیں۔ نہ جانا ناممکن تھا۔ جانا ہی ممکن تھا۔ جب ہم جانے کا نام لیتے ہیں، تو وہ حق میں آگے بڑھنے کو متصور کرتے ہیں۔ اس کا پہلے حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف وہ تحریک ہے جس میں وکیل اور اچھی طرح خدا کو جاننے کے بعد، آپ اس کے قرب اور ہمسائیگی کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ اس کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

پہلا قدم ہے دلیل۔ ذہن کا پوری طرح صاف ہونا۔ اسے قرآن علم الیقین کہتا ہے۔ وہ علم آپ نے حاصل کر لیا، یا اس کا مظہر ہے۔ آپ اپنے طور پر اظہار کر رہے ہیں۔ اللہ کو اول ترجیح مان کر اس کے رستے میں آنے والی مشکلات کے ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں اور سب سے بڑی مشکل جو رستے میں آتی ہے، وہ آپ کی اپنی انا ہے۔ خواہشات نفس، تردداتِ اور احساسات ہیں۔ آپ کے افسانوی اور تابناک تصورات ہیں۔ آپ کا تجسس ہے۔ یہ تمام آپ کے رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ آپ ان رستوں سے گذرتے ہیں۔ اللہ کی نشانیاں اور مظاہرات دیکھتے ہیں۔ اسباب کو منقطع کیا جاتا ہے اور پروردگار اکیلے ہی آپ کو صرف اپنے وجود کی دلیل مستحکم کرتا جاتا ہے، اس کو ہم عین الیقین کہتے ہیں۔

جب خدا کے خیال سے گذر جائیں اور مشاہدے سے آپ بیزاری کا اعلان کر دیں، تو کہتے ہیں، NO more to see anything about God اب آپ یہ نہیں کہتے کہ اے پروردگار اگر پانچ کا نوٹ میرے رستے میں پڑا ہوا نظر آیا، تو میں آپ کو مان لوں گا۔ اب آپ کو مشاہدات کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک بھی مشاہدہ نہ ہو، تو بھی آپ اللہ کو اسی طرح مانتے ہیں، جیسے پہلے مانتے تھے۔ جب یہ مقام آ جائے، تو پھر حق الیقین کا مرحلہ آتا ہے۔ اس سطح پر آ کر خدا وصال سے محسوس نہیں ہوتا، فراق سے محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ کے ساتھ ہو گا، آپ نارمل ہوں گے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں ہو گا، آپ بے چینی محسوس کریں گے۔

حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو خط لکھا۔ اس نے اپنے لاؤ لشکر کو اکٹھا کیا اور کہا، مجھے ایک زبردست بادشاہ کا پیغام آیا ہے۔ کیا صلاح دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا، ہم نے تمہارے لیے پہلے بھی بہت بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور بڑی جانفشانی سے لڑے ہیں، تو حکم دے، ہم لڑیں گے۔ ملکہ سبا نے کہا کہ بادشاہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے اجاڑ اور ویران کرتے

ہیں اور اس کے امراء اور رؤسا کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا بالکل اسی طرح اللہ جس جسم میں داخل ہوتا ہے اس کو پہلے تباہ و برباد کرتا ہے اور دل میں خواہشات اور آرزوؤں کے جو بڑے بڑے امراء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سر نیچے کر دیتا ہے۔ جب وہ اس بستی کو اچھی طرح اجاڑ لیتا ہے، تو خود آپ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ بستی ازسرِنو آباد ہوتی ہے۔ پہلے اس تعمیر کو ویران کرتے ہیں، پھر اس تعمیر کو دوبارہ استوار کرتے ہیں۔ یہی کار تصوف ہے۔ یہی اللہ کا طریق ہے لیکن اس میں کوئی غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق

مکتبۂ فکر (School of thought) سے مراد یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے آغاز سے جو اعلیٰ ترین مفکرین تھے، جو تاریخ اسلام کے ہر دور میں بڑے استادوں کی حیثیت سے گذرے ہیں۔ حسنؓ ابن علیؓ سے آغاز کیجیے جو All Time Top Intellectual ہیں۔ پھر خواجہ حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے۔ اس سکول کی کوئی حدود اور کوئی چار دیواریاں نہیں ہیں۔ مگر جو ان میں عمومی انداز ہے، میں اس کو سکول کی حیثیت سے پہچانتا ہوں۔ میرے نوری شیخ سید علی عثمان ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان ساروں کی اپروچ میں بنیادی اور واضح فرق ہے۔ یہ بنے بنائے پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہ اعلیٰ ترین خصوصیات کے مالک ہیں اور بے پناہ علمی فراست اور جدوجہد کے بعد اپنے مسلک پر ایک یقینی اعتماد سے پہنچے ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں یہ تمام بزرگ خدا کے وجود پہ دلیل و برہان بنے رہے ہیں۔

باطن میں جھانکنے کی صلاحیت

کسی بھی علم کے لیے جو دنیا میں وجود رکھتا ہے، بیک گراؤنڈ ڈیٹا بے حد لازم ہے۔ حتیٰ کہ غیر معمولی علوم میں بھی جیسا کہ یہ سمجھے جاتے ہیں، زائچے، ہاتھ کی لکیریں، یہ سب کچھ چاہیے۔ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے، کوئی ماہر نفسیات تب تک اپنی رائے دے ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اپنا ہوم ورک پورا نہ کر لے۔ یہ ہوم ورک انٹرویوز، لائف ڈیٹا اور رویوں کے مطالعے وغیرہ پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی ڈیٹا جمع نہیں کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ شخصیات کے بارے میں رائے دیتے وقت میری کیا حیثیت ہوتی ہے، فیصلے سنانے سے متعلق دنیا میں اگر بہترین علم بھی موجود ہے تو اس میں بھی کم از کم تیس فیصد غلطیوں اور کمیوں کا امکان ہوگا اور ان غلطیوں کی گنجائش کسی علم کے مثبت ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے برعکس منفی اور کالے علوم میں تناسب تین اور سات کا ہوتا ہے۔ یعنی تین باتیں ٹھیک ہوں، تو سات ضرور غلط ہوں گی۔

علاوہ ازیں، جتنے بھی ارتکاز توجہ کے آرٹ ہیں، وہ زندگی کے ظاہر سے متعلق رائے دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے پرسوں آپ جہاز پر جائیں گے اور کوئی کہتا ہے کہ بھئی تیرے تو گھر میں بکری مری پڑی ہے۔ یہ ایک خارجی صورتحال کی نشاندہی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا سپیشلسٹ موجود نہ ہوگا، جو بنیادی علوم کے توسط سے آپ کے اندرون ذات سے متعلق اپنی رائے دے۔ یہ فرق ہے اس علم میں جو خدا کی طرف سے ملتا ہے اور ان علوم میں، جو دنیاوی طور پر ترقی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے حد مشکل ہے کہ اس علم کا ذریعہ کیا ہے۔ اس میں میں نے کوئی غیر فطری رویہ اختیار نہیں کیا۔ دیکھیے کہ متعدد افراد جمع ہوئے اور جو مظاہرہ ہوا ہے وہ محض مظاہرہ نہیں تھا بلکہ تمام افراد سے متعلق ایک فطری تفہیم تھی۔ اس میں شاید سو میں سے ایک غلطی کا امکان ہو کہ میں مکمل نہیں ہوں۔ علم درست سہی، لیکن میں مکمل طور پر درست نہیں ہوں۔ تھکن اور عجلت وغیرہ کے باعث کوئی بھی غلطی ممکن ہے۔

تاہم بنیادی بات، جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ یہ اللہ کا ثبوت ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک برہان قاطع ہے۔ جب خدا کسی کو علم اور شناخت دینا چاہے، تو وہ ہر حال میں دوسروں سے آگے ہوتا ہے۔ یہاں جتنے مروجہ علوم کی شناخت موجود ہے آج یا کل، پاکستان سے امریکہ تک، زمین پر کوئی بھی شخص، جس کی ذمہ داری اللہ کے توسط سے مجھ پر عائد ہوگی، وہ ضرور اس امر کی صداقت کی گواہی دے گا کہ He has been able to understand me۔ اس بات کو مختصراً یوں کہیے کہ

He has been able to know me without my knowledge

مگر بعض اوقات انسان کے حجابات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ ہم ایک شخص کو ایک بات بتا رہے ہوتے ہیں، مگر وہ انکار کیے جاتا ہے کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم ثابت کرنے کی

کوشش کریں کہ یہ بات تم میں ہے، تو سوالات کا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ But should I be so much interested in any body?

ہمیں تو غرض ہے کہ ایک بندہ اصلاح کار، اصلاح ذات اور توجہ علی اللہ کے لیے آتا ہے۔ ہمیں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرنا ہے اور اس کی اچھائیوں کی بھی، تاکہ وہ آگہی کے ساتھ آگے بڑھے۔ اس کو کہتے ہیں، من عرف نفسہ لقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہ سائنس آپ کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ ہم حیاتیاتی اور کیمیائی سطح پر ایک اکائی ہیں۔ ہم میں سے ہر ہر آدمی، آپ اور میں کوئی مختلف نہیں ہیں۔ اسی لیے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بھی شخص کی کسی بھی کی کمزوری کا مذاق اڑانے کا حق نہیں رکھتا۔ کوئی بھی وقت ایسا آ سکتا ہے کہ آپ کی کیمسٹری بالکل اسی طرح ہو جائے، جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ سو بچوں کا قاتل جاوید اقبال بھی انسان تھا اور آپ بھی۔ اگر اس کی کیمسٹری کا فرق اسے سو بچوں کا قاتل بنا سکتا ہے، تو یہ خوش ہونے کی بات نہیں، ڈرنے کی بات ہے کہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے اور باوجود اسی کی طرح کا انسان ہونے کے، میں اگر اس عادت یا حالت سے بچا ہوا ہوں، تو یہ اللہ کی مہربانی ہے، توفیق اور احسان ہے ورنہ Diabolically speaking ہم سب ایک سے ہو سکتے تھے اور ایک سے عمل کر سکتے تھے۔

بھٹکنے سے بچ گئے

علم میں ایک صفت بہت بڑی ہے۔ اگر آپ نتائج علمیہ کو دیکھیں، تو سب سے پہلے نتیجہ ہمیں یہ علم دیتا ہے کہ تکبرات اور تمام تفاخرات جہالت کی اقسام ہیں۔ علم کے مثبت نتائج آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں۔ ہماری اس زمین میں جن دو چار امراض سے میں آگاہ ہوں، ان میں ایک خود ساختہ اصطلاح Religious Schizophrenia بہت عام ہے۔ کسی کو تھوڑا سا مذہبی کلام یا دو چار مسائل آ گئے، یا کسی نے تھوڑا سا بولنا سیکھ لیا، تو ان میں سے ہر کوئی مہدی بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ تمام علماء، جو کچھ بولنے اور مسائل کو تھوڑا سا جاننے کے قابل تھے، انہوں نے اپنے ساتھ لفظ امیر لگانا اور جماعتیں بنانا ضروری خیال کیا۔ یہ تفاخرات تمام کے تمام ان کی جہالت کا حصہ بنتے چلے گئے۔ نہ صرف انہوں نے اپنے آپ کو، بلکہ اپنے ساتھ بے

شمار لوگوں کو گمراہ کیا۔

مذہب میں کسی قسم کے گروہ کی تخلیق کی گنجائش نہیں۔ میں عام لوگوں میں بیٹھ کر عام انداز میں اللہ اور رسولؐ کی بات کر سکتا ہوں۔ جب کوئی گروہ بنتا ہے اور کوئی فکری رستے علیحدہ کرتا ہے تو وہ عجب اور تکبر کے رستے پر چل نکلتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ میں تو برتر ہوں اور میرا بھائی اتنا برتر نہیں ہے۔ میں اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں یہ سوچوں کہ وہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا مذہب ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مذہب ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب ہے میں ایک ایسا مذہبی ہوں جو عجب سے کام لے رہا ہوں اور یہ کبھی میری نجات کا باعث نہیں بن سکتا۔ یہ ان تمام بڑی تنظیمات والوں میں خرابی تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو متقی کہا، حتیٰ کہ ایک جماعت والوں نے صالحین والے لفظ استعمال کیے، جو صرف اللہ نے قرآن میں پیغمبروں کو کہا۔ دوسروں کو انہوں نے باہر نکالا اور پھر ان کی اصلاح کے درپے ہوئے۔

ان سب کے پیچھے ایک مذہبی انقلاب لانے کا تصور تھا۔ ایک عام سے مغربی نے ایک بڑی خوبصورت سی بات کی ہے۔ ان تمام لوگوں کا علم اکٹھا ہو کے بھی ایک عام سے مغربی کے برابر نہیں۔ اگر ایک مذہبی عالم کو اس کا مطلب معلوم ہو جائے تو وہ یقینی طور پر ایک اچھا مسلمان بن جائے۔ اس نے کہا Nobody can stop a revolution the time of which has come. کہ کوئی شخص اس انقلاب کو نہیں روک سکتا، جس کا وقت آچکا ہے۔

قابلِ غور بات ہے کہ یہ لوگ گزشتہ ستر برس سے وہ انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں، جس کا وقت نہیں آیا۔ طاہر القادری بھی یہی کر رہے ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی یہ کرتے کرتے فوت ہو گئے اور ڈاکٹر اسرار بھی اسی لائن میں لگے ہیں۔ ان کو ایک بات سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں اس تبدیلی کا وقت مقرر نہیں کیا اور وہ وقت ابھی آیا ہی نہیں۔ وہ اللہ پر اپنی پسند و ناپسند کو مسلط کر رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو متقی ڈیکلیئر کر کے خدا سے اس کا وقت اور اس کی رضا چھیننا چاہتے ہیں۔ کم از کم کوئی سادہ سا پڑھا لکھا مسلمان اس حماقت کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تحقیق وجستجو واخلاص

میری اپروچ یہ رہی ہے کہ میں اللہ پر اندھا دھند یقین نہیں رکھنا چاہتا۔ میری مشقت اس لیے بڑھ گئی کہ میں ایک باضابطہ نظریاتی اساس اور تحقیق وجستجو کے باعث اپنے خدا کو دلائل میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا ہوا، اگر خدا نظر نہیں آتا۔ ہوا بھی مجھے نظر نہیں آتی، لیکن اس کا احساس مجھے ہے۔ اگر خدا نظر نہیں آتا، تو اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ خدا محسوس نہیں ہوسکتا، مل نہیں سکتا یا کسی اور نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ ہم بہت ساری ایسی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں، جن کا وجود نظری نہیں ہے۔ ان میں ایٹم کے ذرات وغیرہ شامل ہیں۔ انسان نے ایسی سینکڑوں چیزوں کو تسلیم کرلیا، جو کہ دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر وہ کسی نہ کسی تجربے اور مشاہدات میں آجاتی ہیں۔

اب اللہ کو اس سطح یا کسی انٹلکچوئل دلیل کے ذریعے اپروچ کرنا، ہوسکتا ہے کہ ہر آدمی کا کام نہ ہو۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب کی وجہ سے دنیا آج تک آباد چلی آرہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کے اولیاء بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوں گے اور بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا واحد کام نبوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہادت غیب ہی میں اللہ ہے۔

اسی طرح حضورؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے، تو ظاہر ہے کہ پیچھے بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ ایک ایسا خلا، جس میں ذاتی شہادتیں کم ہوگئیں۔ اس لیے امت مسلمہ کے اولیاء نے ذاتی مجاہدات اور ریاضتوں کے ذریعے وہ شہادت حاصل کی اور تاریخ ان سے بھری ہوئی ہے۔ قریباً دنیا کے ہر خطے میں جہاں مسلمان آباد ہیں، اولیاء کرام وہاں موجود رہیں گے اور قیامت اس وقت قائم ہوگی، جب زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا شخص نہیں رہے گا۔ بحران یہ نہیں کہ اولیا ءاللہ نہیں رہے، سب سے بڑا بحران اولیاءاللہ کی پہچان ہے۔ اس وقت اتنا کنفیوژن اور اتنا جھوٹ شامل ہوگیا ہے، جو ہمیں بنی اسرائیل کے زمانے میں، حضرت دانیال علیہ السلام کے دور میں نظر آتا ہے۔ وہاں ایک وقت میں سو جعلی پیغمبر اور ایک اصلی ہوتا تھا۔ نبی کی اس وقت پہچان خدا کی جانب سے خصوصیت تھی کہ کیا ملتی ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کو اس لیے نبی مانا گیا کہ انہوں نے بادشاہ وقت کے اس خواب کو بیان کیا، جو اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ میں نبی اس

کو مانوں گا، جو میرا خواب مجھے سنائے گا۔ وہ خواب میں زبانی نہیں بتاؤں گا۔ اگر کوئی نبی ہے، تو اسے پتہ ہونا چاہیے کہ میں نے کیا خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے۔ جبریل امین تشریف لائے اور حضرت دانیالؑ کو خواب اور اس کی تعبیر بتائی۔

بسا اوقات ہمارا مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بحران کا شکار رہا ہوں۔ سب سے بڑا بحران یہی ہے کہ ہم اللہ کے بندے کو پہچان نہیں پاتے۔ یہ سوال میں نے اپنے شیخ و مرشد سید ہجویریؒ کے پاس جا کر پوچھا کہ آپ نے لکھا ہے، آپ نے خراسان کی پہاڑیوں میں ۵۶۳ اولیاء اللہ دیکھے۔ اب ہم کیا کریں کہ ۵۶۳ تو کجا، یہاں جوتیاں چٹختے مدتیں گذر گئیں۔ جسے دیکھتے ہیں، اول کم علم ہے۔ دوسرا Claimant (دعوے دار) ہے، تیسرا غیر مرئی قوتوں پر مقدار علم کی بنیاد رکھتا ہے، اور چوتھا تنظیمی طاقت طلب کر رہا ہوتا ہے۔ ان سب عناصر کے ہوتے ہوئے ہم کیسے کسی پر اعتبار و اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔

یہ سوال کر کے جب میں واپس آیا، تو بے حد رنجیدہ تھا۔ دیکھا کہ ''کشف المحجوب'' سامنے پڑی ہے۔ ایسے ہی بے دھیانی میں صفحہ الٹ دیا، تو دیکھا کہ ابو سعید مخزومی کا یہی سوال موجود ہے۔ شیخ ہجویریؒ نے جواب میں لکھا ...... اور اس کو محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا ...... کہ جب ہم خدا کی تلاش میں نکلے، تو ایسے بہت سے اولیاء اللہ اور برگزیدہ بندے نظر آئے، جن سے ہم نے سبق سیکھا۔ ان کی دعائیں لیں اور برکتوں سے آشنا ہوئے۔ اے سائل ایک وقت ایسا آئے گا کہ تو زمین ڈھونڈ مارے گا اور تجھے خدا کا بندہ نظر نہیں آئے گا۔ پھر کیا تجھ پر لازم ہے کہ تو خدا کی تلاش چھوڑ جائے؟ بس اتنا یقین رکھنا کہ جس اللہ نے پچھلوں کو دیا ہے، وہ زندہ و جاوید تجھے بھی عطا کرے گا۔ اس دن کے بعد میری وہ مایوس کن کوشش، یعنی خدا کا بندہ ڈھونڈنے کی ختم ہو گئی۔

میں نے سوچا، یہ سچ ہے کہ خدا زندہ ہے۔ بندے کا حق خدا کو پہچاننا اور خدا کا حق بندے سے اپنی عبادت کی تسلی لینا ہے۔ یہ پہلی Equaltion ہے، جو ہر آدمی میں موجود ہے اور چاہے اسے استاد یا ولی اللہ ملے نہ ملے، یہ اس کا بنیادی حق اور اللہ پر یہ لاگو ہوتا ہے کہ وہ اسے عطا کرے۔ بندگی کے لیے دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک اخلاص اور ایک ذکر خدا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ولایت کے اس معیار تک نہ پہنچے، جو شیخ عبدالقادرؒ علی عثمان ہجویریؒ یا جنیدؒ بغدادی کا ہے۔ مگر وہ خدا کا بندہ ضرور ہو سکتا ہے اور مقبول ترین بندہ بھی۔

اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تعلیمی اور علمی معیار بلند ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ فرماتا ہے کہ جس کے چاہتا ہوں، درجات بلند کرتا ہوں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اساسی اور بنیادی علم موجود ہو، مگر وہ خدا کی دوستی سے محروم ہو۔ خدا کی دوستی شرط ہے۔

تصوف کی مشکل لائن

تصوف کی لائن مشکل نہیں ہے۔ یہ ایک انٹلکچوئل سوال اور ایک ذہنی اپروچ ہے۔ اس میں آپ اپنے ذہن کو تیار کر لیتے ہیں کہ میں نے خدا کا انتخاب کرنا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ تصوف کی کیا تعریف کریں گے؟ میں نے کہا کہ معقول وقت میں معقول ذرائع عقل کے ساتھ جو شخص خدا کو ترجیح اول چن لیتا ہے، اور باقی زندگی اس اجتہاد میں صرف کرتا ہے، وہ صوفی ہے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ لوگ اسے مشکل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ معیار اعلیٰ سے شروع کرتے ہیں۔ ہم شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا معیار لیتے ہیں۔ وہ قطب عالم اور غوث زمانہ تھے۔ ہم ایسی ہی اور بڑی ہستیوں سے معیار لیتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ بات یہ ہے کہ معین الدینؒ اور فرید الدینؒ نے ایک دن آغاز بھی کیا تھا۔ تب وہ معین الدین نہیں تھا۔ ایک سادہ سا لڑکا تھا، جب ابوالحسن خرقانی ان کے پاس آئے۔ لڑکے کا روشن ماتھا دیکھا، اسے کہا، انگور لاؤ۔ انگور چبایا۔ اس کے منہ میں رکھا۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک دعا دی، اے پروردگار! یہ ایک لڑکا ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ تحصیل علم دین کی طرف جائے۔ تب اس نے کام چھوڑا۔ بارہ برس سفر کیا۔ صحرا صحرا پھرے۔ علم حاصل کیا۔ ہندوستان آئے اور ہند الولی ہوئے۔

آپ لوگوں کو معراج سے دیکھتے ہیں۔ آغاز سے نہیں دیکھ رہے۔ جب ان کو آغاز سے دیکھو گے، تو آپ ان میں سے ایک ہو جاؤ گے۔ یہ بڑا آسان لگے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے قرآن میں دو ولی گنے ہیں، تیسرا نہیں۔ اللہ ولی الذین آمنو یخرجھم من الظلمات الی

النور ۔ اللہ ولی ہے اہل ایمان کا کہ ظلمتوں سے نکال کر انہیں نور کی روشنیوں میں لے جاتا ہے۔ والذین کفروا اولیھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اور اہل کفر طاغوت کے ولی ہیں۔ ان کو روشنیوں سے اندھیروں کو لے جایا جاتا ہے۔ زمین پر دو ولی ہیں اور تیسرا کوئی نہیں۔ وہ جو ظلمات سے نور کو جا رہے ہیں اور وہ جو نور سے ظلمات کو جا رہے ہیں۔ وہ جو حجاب سے کشادگی اور جو کشادِ قلب سے حجاب کو پلٹ رہے ہیں۔ تیسرا کوئی ولی نہیں ہے۔ ہر انسان کا ولایت پر حق ہے، کیونکہ انسان کو پیدا ولایت ہی کے لیے کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ انسانوں میں خدا معیار پرکھتا ہے۔ ہاں ان کو اپنے اپنے مقامات پر فکس کر دیا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی ولی ہو سکتا ہے چاہے وہ موچی ہو۔ موسیٰ کو اللہ نے کہا، میں بیمار ہوں۔ اس نے کہا، یا اللہ! تو بیمار بھی ہوتا ہے۔ ہاں ہاں جب میرا کوئی دوست بیمار ہوتا ہے تو میں بیمار ہوتا ہوں۔ تم اس کی عیادت کو جاؤ۔ موسیٰ گیا، تو اس نے دیکھا، ایک موچی ایک بڑی ساری جوتی لے کے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے، اے اللہ! میں بیمار ہو گیا ہوں۔ مجھے تیرے سائز کا نہیں پتہ۔ مگر میں نے بڑی محنت سے یہ جوتی بنائی ہے، ہو سکے، تجھے پوری آ جائے، ورنہ میری خطا معاف فرما دے۔ حضرت موسیٰ روئے اور کہا یہ واقعی اللہ کا ولی ہے۔ وہ انٹلکچوئل اور کوئی بڑا دانشور نہیں تھا۔ مگر اللہ نے اس کو احساسات کی Refined ذہنی سطح دی تھی۔ ایسے ہماری دنیا میں ہزاروں ہیں۔

ہو سکتا ہے ایک سیب بیچنے والا، جب ایک برے سیب کو اٹھانے لگے، تو اس کو اللہ کا خیال آئے اور کہے نہیں۔ اس نے اللہ کی وجہ سے گاہک کو گندہ پھل نہیں دینا، تو وہ اللہ کا ولی ہو جائے۔ ایک کمشنر جو سمجھ کر فائل پر غلط سائن کر رہا ہے وہ اولیاء طاغوت میں شامل ہو جائے گا۔ بعض اوقات ایک ناپ انٹلکچوئل انحراف کر سکتا ہے اور ایک بڑا سیدھا سا آدمی ترقی کر سکتا ہے۔

مذہبی تعلیمات بمقابلہ تصوف

روایتی میل جول مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں بھی روایتی پیٹرن شامل ہوتا ہے، میں وہ استاد نہیں رہتا، جو میں رہنا چاہتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ایک عام آدمی کا خدا پر حق ہے کہ وہ اسے چاہے اور خدا کا حق ہے کہ وہ اپنے کمزور ترین بندوں تک آئے۔

یہ میرے تصوف کا بنیادی تھیسز ہے۔ میں تصوف کو تخصیص نہیں سمجھتا۔ میرا سب سے مشہور لیکچر اس موضوع پر ہے کہ صرف تصوف ہی طرزِ زندگی طریق زندگی ہے۔ اپنی زندگی سے اسے آپ نکال نہیں سکتے۔ البتہ عمومی طور پر کبھی توبہ کی نیت سے اس لمحہ تصویف کو پرکھتے ہیں اور کبھی زندگی میں مصائب و آلام میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی تصوف ہے۔

ایک ہمہ وقتی رجوع کو آپ تصوف کہیں گے اور کبھی کبھار رجوع کو اور پھر اس کے بعد دوبارہ اپنی زندگی کے پیٹرن کو پلٹ جانا عمومی زندگی ہے۔ تصوف یہ ہے کہ آپ ہر حال میں، گناہ و ثواب اور زندگی کے شب و روز میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہی ہمارا طریقہ کار ہے۔ تصوف کبھی بھی غیر معمولی شے نہیں رہی۔ غیر معمولی شے اس میں صرف ایک ہے کہ کوئی مادی وجود والا بندہ کسی غیر مادی وجود کے ساتھ کتنا رابطہ رکھ سکتا ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم جو مادیت کی جکڑ بندیوں میں اردگرد کے آزاد اسباب میں الجھے ہوئے ہیں، ہم کیسے پروردگار عالم سے محبت کر سکتے ہیں، جو حواس خمسہ سے بہت ماورا ہے؟ ٹریپ بھی یہی ہے۔

لاہور میں ایک دفعہ انتہا درجہ کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں اس وقت تسبیح کر رہا تھا۔ میں نے اللہ میاں سے چلتے ہوئے سوال کیا کہ اے اللہ میاں! کیا تو بندوں کو بیوقوف سمجھتا ہے۔ اب تو ہی بتا کہ تو ذائقے، احساس اور نظر میں نہیں ہے۔ لوگ بیچارے کیا کریں، تجھے کہاں سے ڈھونڈیں؟ میرے دل میں خدا نے مجھے کہا کہ بندۂ خدا! اس کے علاوہ میں نے اور کیا ٹریپ رکھا ہے؟ یہی تو رکھا ہوا ہے۔ جو شخص حواس خمسہ سے ذرا سا آگے گذر گیا، مجھے پا لے گا۔ تم آخر یہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ یہ فریب اور یہ حواس جعلی ہیں۔ یہ پابندی کے حواس ہیں۔ یہ صرف وقتی طور پر زمین پر اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ اس زمین سے اوپر گلیکسیز میں، تاپ خلا میں چلے جائیں، یہ سارے حواس ختم ہو جاتے ہیں۔ وزن اور ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں غور کرتے کہ یہ تو حجاب ہیں۔ میں اس حجاب سے آگے بستا ہوں۔

حدیث قدسیہ میں خداوند کریم کا ایک ارشاد ہے۔ اس شخص کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ حرام ہوگی، جس کی آنکھ سے میرے لیے ایک آنسو بہا۔ میں نے بڑا غور کیا۔ اس آنسو کے لیے کہ جو میری وجہ سے نہ ہو۔ جو میری کسی اذیت، آرزو یا میرے کسی دکھ کی وجہ سے

نہ ہو۔ میری آنکھ سے وہ آنسو نکلے، جو صرف خدا کے لیے ہو۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ نے کتنی مشکل بات کی ہے۔ بظاہر کتنی آسان اور کتنا مشکل ہے اس پر عمل کرنا۔

مسئلہ یہ ہے کہ لوگ مجھ پر بڑی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہ کیا؟ فلاں کام کیوں نہ کیا اور فلاں کیوں نہ کیا؟ لوگوں کے اپنے تصورات ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں اس کے مطابق زندگی گذاروں، جیسے کہ یہ دوسرے مسلمان ہیں۔ سب سے بڑا قانون یہ ہے کہ It is very common to be uncommon and it is very uncommon to be common. لوگ اعتدال کے دشمن ہیں۔ لوگ اس بندے پر اعتراض کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو ایک پیٹرن میں نہیں ڈھالتا۔

ابھی میں نے سیاست میں حصہ لیا۔ ہم نے خدا کے فضل وکرم سے ضلع تک کے الیکشن کلیئر کیے۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ سیاست میں کیوں حصہ لیتے ہیں؟ سیاست تو جھوٹ ہے۔ میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے، جھوٹ ہے۔ جب میں جھوٹ بولوں گا، تو تب مجھے بتانا کہ سیاست جھوٹ ہے۔ اگر بہت ساری جگہیں اصلاح اور بہتری کے لیے ہیں، تو میرا حق بنتا ہے کہ میں ادھر بھی اپنے اور لوگوں کے لیے ایک رابطہ وضع کروں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس ملک کی اصلاح کسی جنرل میں نہ کسی سیاستدان میں ہے۔ اس ملک کی اصلاح ہم لوگوں میں ہے۔

مگر ''ہم لوگوں'' سے مراد میں یہ نہیں لیتا کہ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں ہی امیر دعوت اصلاح ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے جو خدا کے حضور سربسجود ہوں گے، ان میں اخلاص کی ایک رتی ہوگی، تو خدا ان میں سے کسی شخص کو زمین کا حکمران کرے گا، بلکہ آسمان پر بھی سرفراز کرے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ برتر کرے گا۔ کسی جنرل یا کور کمانڈر کو نہیں۔ یہ آپ سیاست اور فوج میں جو ذلت وافلاس دیکھ رہے ہیں، سارے کے سارے وہ کام کر رہے ہیں، جو انہیں نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اس کا جاب ہے، جسے خدا برکت دے گا۔

روحانیت کی طرف سفر

حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا گیا، خدا کو کیسے پہچانیں؟ فرمایا Know thyself and shall know the God (اپنے آپ کو پہچانو، خدا کو پہچان لو گے) اسی طرح کا مشہور قول من

عرف نفسه فقد عرف ربه ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ حضور گرامیؐ سے جب اللہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا، اللہ جسے اپنا علم دینا چاہتا ہے، اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔ اب اگر ہم تینوں بیانات کو یکجا کریں، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ عملی عبادات کا رستہ نہیں ہے۔ عملی عبادات کسی معاشرے میں گذر اور آشتی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ نماز اجتماعیت اور ذاتیت بھی ہے۔ اسی طرح صدقات و زکوٰۃ اگر ایک سطح پر اس کی مخلوق کو راحت پہنچا رہے ہیں، تو دوسری سطح پر وہ اس کے اپنے اندر سے بھی بخل کو دور کر رہے ہیں۔ زکوٰۃ کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بھی میل کچیل سے پاک کرتے ہیں اور اپنی اضافی رقم سے معاشرے کے ضرورت مندوں کی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مسلمانوں کا تم پر حق ہے اور اس کو ہم صدقات کہتے ہیں۔ صدقات کی وسعت اتنی طویل ہے کہ ایک اچھی بات اور ایک اچھا کلام بھی صدقہ ہے اور ایک اچھا مشورہ اور ایک اچھا خیال بھی صدقہ ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں، جن کی معاشرتی زندگی میں مسلمان مشق کریں، تو اس سے ایک ایسی بنیاد مہیا ہوگی، جس میں خدا کے چاہنے والے نکل سکتے ہیں۔ سابقون الاولون میں خدا کو چاہنے والے جب اپنی ترجیح اول اللہ کو کرتے ہیں، تو وہ اپنے اعمال کا سارا رخ اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اعمال میں عبادات کے علاوہ جو سب سے بڑا عمل ہے، وہ خدا نے خود ہی بتایا ہے۔ الـذين يذكرون الله قياماً و قعوداً و علىٰ جنوبهم کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ و يتفكرون في خلق السموٰت والارض اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔ سو یاد کرنا اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر خدا کے حوالے سے غور کرنا، یہ دو باتیں اللہ کے بہت قریب لے جاتی ہیں۔

اب یاد کرنے کا طریق کار جو اللہ نے ہمیں بتایا ہے، وہ Power intoxicant نہیں ہے۔ خدا سے شیطان نے یہ کہا کہ میں تیری مخلوق کو دائیں بائیں آگے پیچھے سے آؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا، ٹھیک ہے، تم بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرو گے، الا عباداللہ المخلصین مگر میرے مخلص بندوں کو تم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ایک حدیث رسولؐ ہے کہ قیامت کے دن جب بہت سارے بندوں کو جنت لے جایا جا رہا ہو گا، تو خدا ملائکہ کو حکم دے گا، ان کو جہنم میں لے

جاؤ۔ ملائکہ عرض کریں گے، اے پروردگار! ان کے نامہ اعمال میں خوبیاں لکھ لکھ کے ہمارے صفحات ختم ہو گئے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ ان کو جہنم میں پھینک دو؟ اللہ فرمائے گا، میرا اور میرے بندے کا ایک معاملہ ہے، جسے میں ہی جانتا ہوں۔ وہ اخلاص ہے۔ سو خدا اور انسان کے درمیان محبت کی پہچان کی کسوٹی اخلاص ہے۔ اخلاص دنیاوی محبت کی بھی بنیاد ہے۔

اب محبت کے طریق میں سب سے بڑا طریق یاد ہے۔ وصال میں کسی محبت کا تعین نہیں ہوتا۔ جب فراق اور جدائی ہوگی، تو پتہ چلے گا کہ کس کو کس سے کتنی محبت ہے۔ فراق کا اصول یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ یاد آئے گا، آپ کو اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ محبت کو جاننے کا نہیں ہے۔ آپ کے دل اور کسی کی محبت کی آزمائش ایک تو فراق میں نمایاں ہوتی ہے یا فراق میں جس کی زیادہ یاد ہو، اس میں نمایاں ہوتی ہے۔

اب محبت ہمیشہ ان پانچ حواس خمسہ سے آگے چلی جاتی ہے۔ بظاہر اداس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود آپ اداس ہوتے ہیں۔ آپ نے کھانا بھی کھایا ہوتا ہے۔ خوشبو بھی لگائی ہوتی ہے۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن اس کے باوجود آپ لوگ اداس ہیں۔ حواس خمسہ سے آگے گذرتے ہوئے ایک ریفائن ادراک کو ہم اللہ کی محبت کہتے ہیں۔ جب تک ہم حواس خمسہ کی گرفت میں رہتے ہیں، ہم پر شرع غالب ہوتی ہے اور جب ذرا آگے Intellectual Refinement میں جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اللہ بڑے واضح طور پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔

عملی طور پر بھی دیکھیں۔ جیسے لارڈ برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ When we hit a wall, there is no wall and we have no fist. ہم کبھی بھی دیوار کو مکہ نہیں مارتے۔ مگر درد اور تکلیف اور اس کا احساس تو ہوتا ہے۔ مگر سائنسدان کہتا ہے وہ دیوار تھی ہی نہیں۔ یہاں مکا ہی کوئی نہ تھا۔ یہ تو الیکٹرون اور پروٹون کا جنونی رقص ہے۔ اگر عملی طور پر پروٹون اور الیکٹرون آپس میں مل جائیں، تو چین ری ایکشن میں ایک دنیا تباہ ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا بصری اور عملی پہلو جھوٹا ہے۔ اگر ہم سائنسدانوں میں یقین کریں، کہ ہمارا بصری پہلو جھوٹا ہے اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ نہ وہاں دیوار ہے، نہ میں مکے کو مارتا ہوں۔ اس کے برعکس بڑی سخت سرکولیشن میں الیکٹرون اور پروٹون کے دائرے ہیں، جو کبھی بھی آپس میں نہیں ملتے

اور اگر یہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں، تو چین ری ایکشن ہو جائے اور شاید آدھی دنیا تباہ ہو جائے، تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ خدا کی ترجیح کو برقرار رکھنے کے لیے ہم اس کو یاد کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی یاد کا اور کوئی مقصد نہیں۔

روحیت اور روحانیت

تصوف اور باقی علوم میں ایک بڑا فرق ہے۔ تصوف میں ذات کو خدا کے حق میں نفی کیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے نفس کو مسترد کیا جاتا ہے اس کی تردید کی جاتی ہے۔ یہ اکیس بائیس جبلتوں کا ایک پیکیج ہے، سنگل نہیں ہے۔ ہماری بنیادی جبلتیں ہیں، جیسے محبت، جارحیت اور سب سے پہلی بقا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ بھوک لگتی ہے، تو بھوکا آدمی کفر کے قریب ہوتا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو ملنا چاہیے۔ ورنہ وہ ہر چیز سے انکار کر دے گا۔ مگر جب اٹھارہ جبلتیں ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہیں تو اصل نفس پیدا ہوتا ہے۔ یہ نفس انسان اتنا پیچیدہ اور مشکل ہو جاتا ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص اسے سمجھ نہیں سکتا، بلکہ ایک ماہر نفسیات بھی اسے سمجھ نہیں سکتا کیونکہ تمام سائنسز اور تصوف میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ سائنس ہے۔ یہ اعلیٰ ترین سائنس ہے، آرٹ نہیں ہے۔

تصوف ایک ایسی سائنس ہے کہ باقی سائنسز میں آپ کے احساسات شامل بھی ہو جائیں، تو نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ آپ ایک تجربہ کریں۔ چاہے آپ ناراض ہیں، بیمار ہوں، خوش یا ناخوش ہیں۔ آپ کے تجربے کی روٹین اور اس کے نتائج پر فرق نہیں پڑتا مگر تصوف میں آپ کا ایک ذرہ برابر وجود کا شائبہ اس میں شامل ہو جائے، تو آپ کی معروضیت اور آپ کے نتائج خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ اتنی پیچیدہ سائنس ہے کہ اس کے عدم توازن کو توازن میں بدلنا بڑا ہی مشکل ہے۔ اسی وجہ سے یہ علم دنیا کے مشکل علوم کے زمرے میں آتا ہے۔ بڑے سے بڑے فلاسفر بھی اس پیٹرن تک پہنچتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ چنانچہ تمام صوفیاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تصوف سحر علیمہ ہے اور قرآن حکیم میں پروردگار عالم نے کہا کہ میں نے درجات، عبادات ظاہرہ میں نہیں رکھے۔

اس علم کی حدود سے اکتساب عالم کا وجود ہے۔ اسی سے اللہ کے بندوں کے درجات

مقرر ہوتے ہیں۔ یہ جو آپ سنتے ہیں، فلاں قطب عالم اور فلاں غوث زماں ہے یہ کوئی ایسی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔ بڑی سادہ سی بات ہے کہ پاکستان کی انتظامیہ کے افسران کے مختلف درجے اور گریڈ ہیں۔ اسی طرح خدا بھی پوری دنیا کو دیکھتے ہوئے بہترین عقل و اعتدال والے بندوں کا چناؤ کرتا رہتا ہے۔ آپ پر آ کر وہ چند بندے چنتا ہے اور پھر ان کے ٹیسٹ شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ گُننا سڑنا ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح آپ کو ساری زندگی توازن کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ ایک ذرا سی تاخیر، ذرا سی سستی اور ذرا سا آنکھ کا جھپکنا شیطان کو موقع فراہم کر دیتا ہے۔

ذہنی اور روحانی سفر

یہ سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ مگر ایک قانون ہے جو شاید ابتدا میں بندہ سیکھ لے، تو وہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کے رستے میں ایک قدم بھی مشکل ہے۔ وہ یہ کہ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی حرام مطلق ہے۔ ہمارے علم میں جو خدا کو چاہتے ہیں، اپنے ساتھ کسی بھی قسم کی ہمدردی کو حرام سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ساتھ ہمدردی کریں گے اور اس میں مصروف ہوں گے، تو آپ ایک نکتہ بھی نہیں سیکھ سکتے Any Sympathetic consideration about own self will never lead you to knowledge۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کہیں کہ میرے ساتھ اس بندے نے یہ کیا، اس کا مطلب ہے کہ میں حقدار نہیں تھا۔ اگر میں کہوں کہ میں نے یہ جاب حاصل کرنا تھا، دوسرا لے گیا، تو دوبارہ اپنی ذات سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میرا حصہ تھا، میرے باپ نے نہیں دیا، تو میں Self-sympathetic ہو گیا۔ ہماری زندگی کے ہر لمحہ حیات میں یہ ہمدردی کام کرتی ہے۔ فرض کریں، آپ کے باپ نے سب بیٹوں کو دیا، آپ کو نہیں دیا اور اگر آپ نے اللہ کو کہا، اے میرے مالک! میرے باپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں شاید یہی استحقاق کرتا تھا اور جناب سے مجھے یہی ملنا تھا، تو آپ ہمدری سے گذر گئے۔

اگر آپ کے ایک دوست نے آپ کی غیبت کی اور آپ نے سمجھایا کہ اس نے تو اپنے

علم کے مطابق جو کہا، سو کہا۔ اگر میں بھی ایسا کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہے، میں بدلہ لے رہا ہوں۔ میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا، مجھ میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو سکتی ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی کرنے والا کبھی بھی خدا کی برأت کو نہیں پہنچ سکتا۔

تصوف اور سائنس میں ارتباط

میں نے دو تین اساتذہ دیکھے ہیں، جو شاید اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایران کے ڈاکٹر حسین نصر اور امریکہ میں کوئی ڈاکٹر ہیں۔ مگر میں نے وہاں ان کی کیسٹس سنیں۔ میں نے امریکہ میں تصوف کی ایک گروپ میٹنگ دیکھی ہے۔ وہاں شاذلیہ مسلک بے حد مقبول ہے، لیکن میں اس کے دروازے پر کھڑا پلٹ آیا۔ رات ایک بجے وہاں پہنچا، تو ذکر کا ایک حلقہ تھا، جس میں دف بج رہے تھے۔ چھوٹا چھوٹا ڈانس ہو رہا تھا اور اللہ ہو، اللہ ہو ہو رہا تھا۔

تقریباً ہر جگہ میں ہمہ نوع مذاق دیکھتا ہوں۔ شاید وہ اسلام میں اچھے انٹلکچوئل ہوں، لیکن دینِ اسلام کے کاز میں کمیٹڈ نہیں۔ میں گزشتہ پندرہ بیس برس استاد کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ میرے پاس پبلسٹی کے ذرائع بھی نہیں تھے اور نہ میں نے اختیار کیے۔ کئی مرتبہ مجھے ٹی وی پر آنا تھا اور اخباروں میں بھی۔ پھر جو کچھ بھی اخباروں نے میرے بارے میں لکھا، اپنے طور پر لکھا، جس میں میری کوئی مرضی شامل نہ تھی۔ بلکہ کچھ اخبار نویسوں سے مجھے گلہ بھی رہا کہ میں کچھ اور کہتا تھا اور انہوں نے کچھ اور لکھ دیا۔ As a teacher I don't want to see myself polluted by the high figures of miraculous happenings. بلکہ جو میں کہہ رہا ہوں، وہی لوگوں تک پہنچ جائے، تو میرا خیال ہے بہتر ہو گا۔

اگرچہ میں نے الہیات کی سائنسز کے طالب علم کی حیثیت سے آغاز کیا۔ تاہم، میں کبھی صاف ستھرا نہ تھا۔ تقدس کی فضا مجھ میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں جو ایک گندے، سڑے، کالے کیچڑ سے پیدا ہونے والا آدمی ہوں، اپنے آپ کو مقدس کیسے کہہ سکتا ہوں یا دعویٰ پاکیزگی کر سکتا ہوں۔ ادھر خدا بھی کہتا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ کتنے پاکباز ہو۔ اس صورت حال کے باوجود میں کم از کم ایک یکسوئی حاصل کرنے کی سعی کرتا رہا ہوں اور وہ یکسوئی شروع سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیب فرمائی۔

انٹلیکچوئل جب دنیا کے فلسفوں کے مقابل اپنا سفر شروع کرتا ہے، تو شروع شروع میں بہت نظر ثانی کرتا ہے۔ میں بھی کبھی وجودیت (Existantialism) کی جانب مڑا، کبھی کمیونزم اور شولزم کو اعتقاد و ایمان تبدیل کیے بغیر کچھ عرصے کے لیے سراہا کہ عقیدہ تبدیل نہیں ہوتا، البتہ قابل سوال ہوتا ہے۔ میں خود اپنے ایمان کا محاسبہ کرتا رہا۔ اس کی کمی وبیشی دیکھتا رہا، لیکن کبھی اس پر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ جب میں اس دلیل سلطان نصیر تک پہنچا……وقل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطاناً نصیرا اور میں نے استاد کی حیثیت سے آغاز کیا، تو قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے لیے کوئی بات کروں، تو کم از کم مجھے سلطان نصیر سے ضرور آشنائی عطا فرما۔ مشرق و مغرب میں متعدد لوگوں سے میں نے ملاقات کی، مغرب کے بڑے بڑے استادوں، یوگا کلچر کے چیف اور یہودی Oraclists سے ملا۔ ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے تسلیم نہ کیا ہو بلکہ وہ اتنے خوفزدہ ہوتے تھے کہ ڈر کر کہتے تھے، کیا تم ہمارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں ان سے کہتا کہ مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں، میرے ملک سے ایک دو کروڑ منافق مسلمان لے جاؤ، ان کو تبدیل کر لو۔ چہ جائیکہ، میں تمہارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے تمہارا کیا فائدہ؟

میں اس بارات عاشقانہ کو کیسے ضائع کر سکتا ہوں، جو خدا کی اپنی دین سے انسانوں کے دلوں میں ظہور پاتی ہے، وہ اخلاص، مروت اور محبت، جو اللہ کسی کے دل میں اپنے لیے ڈالتا ہے۔ جن آٹھ چیزوں پر دوزخ حرام کی گئی، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نوجوان، جس کی آنکھ سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلتا ہے یہ آنسو عاشقی کی بارات ہے مگر وہ آنسو اپنے لیے، اپنی اغراض، غم جاناں اور غم دوراں میں نکلتا ہے مگر غم پروردگار میں نہیں نکلتا۔ وہ آنسو اخلاص کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ایک ذرہ برابر اخلاص آپ کو خدا تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر ہم اپنا تجزیہ کیوں نہیں کرتے؟ خدا سے دوری کس لیے ہے؟ کیا ہمارے مسائل کی وجہ سے ہے؟ کیا اس میں تنگ نظری، تنگ دلی اور ہمارے ہندووانہ کلچر کا عمل دخل ہے، جو ایک گرفت ہمارے مزاجوں، ہمارے برادری سسٹم اور ہمارے تمام ماحول پر رکھتا ہے۔

ہندو ہم سے خدائے واحد نہیں چھین سکا۔ اب بھی کسی مسلمان سے خواہ وہابی ہو یا

بریلوی، پوچھ کر دیکھ لیجیے، اللہ کتنے ہیں؟ وہ کہے گا کہ ایک ہی خدا ہے۔ صرف یہ حصہ بچ گیا۔ باقی سب کچھ وہ سمیٹ کر لے گیا۔ ہماری عادات اور معاشرت ہندووانہ ہے۔ ایک ہزار سال کے مشترکہ کلچر نے ہمیں دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ ہم زندہ رہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے، وہ اتنا منافق نہیں ہو سکتا کہ ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرے۔ وہ گنیش کی پوجا نہیں کر سکتا۔ اڑتے ہوئے بادلوں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑ سکتا۔ اس سے ذرا اوپر خلا میں جانا پڑتا ہے۔ یہ وہ مابعدالطبیعیات ہے، جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی مابعدالطبیعیات نہیں رہ سکتی۔ مابعدالطبیعیات کا آخری حصول اللہ ہے اور اسلام کے سوا کسی کی مابعدالطبیعیات مکمل نہیں ہوتی۔ مسلمان کے سوا کسی کو اللہ نہیں مل سکتا۔

ہزاروں دھوکے اور فراڈ جو اس وقت جاری ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ یہ مذہب بھی خدا تک پہنچنے کی راہ ہے اور وہ مذہب بھی۔ اسی طرح سارے مذاہب اللہ تک پہنچتے ہیں۔ اگر پانچویں جماعت فائنل ہوتی، تو لوگوں کو پی ایچ ڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آدم سے لے کر محمدؐ تک مذہب، دین، ضابطہ حیات ایک ہی ہے مگر وہ کون سا عقلمند ہے جو ایم اے کرنے کے بعد اپنے نام کی تختی پر میٹرک لکھے گا؟

ترقی آگے کی جانب ایک سفر ہے اور جب مذہب اور دین مکمل ہو چکا، تو رجعت انسانی عقل کا غیر مستحکم انداز ہے۔ اسلام کی طرف کیوں نہیں آتے؟ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ اسلام کا مفسر اور اس کی تبلیغ کرنے والا معیار سے بہت ہی گرا ہوا ہے۔ میں اسلامی یونیورسٹی کے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو بتا رہا تھا کہ اس آیت کی یہ تعبیر ممکن ہے، تو وہ جواب میں مجھ سے کہنے لگا کہ ہاں، ہو تو سکتی ہے مگر ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے۔ ذرا سطحی پن کا تصور کریں۔

ادھر، جس شخص کو اللہ کے رسولؐ نے تاویل قرآن کی دعا دی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہہ رہے ہیں کہ: القرآن یفسرہ الزمان ...... ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ اگر میں اپنے علوم اور قرآن کے ساتھ کوئی مفاہمت پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر بڑھتا ہوا زمانہ قرآن سے جدید تر ہے تو خدا پرانا ہو چکا۔ اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ اگر فائیو سٹار ہوٹلز، سکائی سکریپرز اور ناسا کی لیبارٹریوں میں خدا پرانا ہو جاتا ہے تو ہمیں ایسے کسی خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر خدا تو وہ ہے جو قیامت کی پیشین گوئی کر کے کتاب بند کر کے بیٹھا ہے۔ جو ابتدا کی

خبر دے چکا ہے اور کہتا ہے تمہیں نہیں معلوم کہ زمین وآسمان پہلے ایک Mass تھے؟ پھر ہم نے جبراً، زور سے انہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔ یہاں سے وہ آغاز کرتا ہے اور آخر میں یوں بتاتا ہے۔ اذا الشمس کورت واذالنجوم انکدرت جب سورج ماند پڑ جائے گا، ستارے گدلے پڑ جائیں گے، زمین اپنی کشش ثقل سے نکل جائے گی اور چاند اور سورج پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ جو اتنی سائنٹیفک تفصیل میں آپ کو انجام بتا رہا ہے، وہ خدا کیا درمیان کی تخلیق سے ناآشنا ہوگا؟ نہیں پتہ کہ کہ انٹلکچوئل کہاں پہنچیں گے؟ کیا اسے خبر نہ ہوگی کہ کوانٹم کی تھیوریاں کیا ہوں گی؟ Relativity کیا ہوگی؟ کیا اسے پتہ نہ ہوگا American progressive thought یا Genentic سائنس دان کہاں پہنچیں گے۔

جو اللہ دابۃ الارض کی بات کرتا ہے، کیا اس خدا کو علم نہیں کہ جینٹک تجربات کہاں تک جائیں گے؟ جس کا رسولؐ یہ فرماتا ہے کہ دجال کے پاس ایک شخص جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو میرے لیے میرا بھائی زندہ کر سکتا ہے؟ وہ ہاں کرے گا اور اس کے لیے اس کا بھائی زندہ کر دے گا۔ اصحابؓ نے عرض کیا، یارسول اللہؐ کیا یہ ہی ہوگا؟ فرمایا نہیں۔ اس کی مثال ہوگا۔ اس کی بہتر وضاحت کلوننگ کے سوا کوئی اور ہو سکتی ہے؟ انسان کی کلوننگ ہونے والی ہے۔ جاؤ، اپنا مرا ہوا بھائی، بھتیجا، ماں باپ اور بچے بنوا لو۔ آپ کو اپنی Replacements مل جائیں گی۔ آخری اور تازہ ترین جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ قرآن وحدیث نشاندہی کر بیٹھے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ اسلام فرسودہ ہے؟ فرسودہ تو وہ ہے، جو اسلام کی نمائندگی کر رہا ہے، جو میٹرک فیل ہے جسے قرآن زبردتی حفظ کرایا گیا اور چار روٹی کی طلب پر لگایا گیا۔ آپ لوگ اگر قرآن اور خدا کو اپنا حصہ نہیں دو گے۔ اگر آپ کی جدت خیال خدا کی طرف نہیں مڑتی۔ آپ کی ندرت کے تصورات اللہ کو نہیں مانتے اور اگر ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں خدا نہیں پایا جاتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگ مناسب چیزوں کو مناسب وقت نہیں دے رہے۔ آپ اپنے کو اس احمقانہ پیروی کے حوالے سے چیلنج نہیں کر رہے۔

ہم تو نفس کے مارے ہوئے ہیں۔ زمانے کی ہر چیز ہم پر مسلط ہو چکی ہے۔ آپ اس میں کیا دیکھتے ہیں، جب سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں؟ سارا دن فحاشی میں گذر جاتا ہے۔ اس معاشرے کا حال اس عرب معاشرے سے بڑھ کر تو نہیں، جہاں ماؤں کو لوگ بیویاں بنا

لیتے تھے۔ جہاں ننگے لوگ گھنٹیاں بجاتے، ڈانس کرتے ہوئے طواف کعبہ کرتے تھے۔ کیا اس سے بڑھ گیا ہے یہ زمانہ؟ اگر اس زمانے میں پیغمبر آ سکتے تھے اور اس جیسے معاشرے میں پیغمبر خدا شمع ہدایت و علم روشن کر سکتے تھے، تو اب اتنی مایوسی کیوں؟ لیکن ذمہ داری میری نہیں، آپ کی ہے۔

مولوی اور صوفی کے مظاہر

یہ ایک تعلیمی ڈگری ہے۔ جیسے ایک پانچویں جماعت اور پی ایچ ڈی میں بڑا فرق ہے اسی طرح صوفیا میں کہا جاتا ہے کہ عارف ہمیشہ عالم ہوتا ہے لیکن عالم ہمیشہ عارف نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اگر میں عارف یا صوفی ہوتا، تو میں یہ دعویٰ ضرور کرتا کہ میں مذہب کی تمام شاخوں سے آگاہ ہوں۔ مذہب کم از کم آٹھ شاخوں پر محیط ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور حدیث کی پرکھ کا علم ہے؟ اس کے علاوہ سیرت اور مواضع ہے اور یہ ساری چیزیں اکٹھی حاصل کیے بغیر آپ اچھے مذہبی اسکالر نہیں ہو سکتے مگر اس کے برعکس جب ہم اپنے عالموں سے ملتے ہیں تو، انہیں تاریخ میں بہت کمزور پاتے ہیں، بلکہ ان کے ہاں خرافات کی روایات جمع ہیں۔ فقہ میں فقیہہ سرے سے ناپید شے ہے کیونکہ فقہ ایک اعلیٰ ترین اور ایک مذہب کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ خشیت کی جو تعریف ابن عباسؓ نے کی کہ محدث و عالم کثرت روایت و کثرت مذہب سے نہیں بنتا، بلکہ خشیت سے بنتا ہے۔ جس خشیت کو کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو، وہ یہ خوف نہیں ہے کہ اللہ مجھے مارے گا یا میں اللہ کو غصے میں دو سنا بیٹھوں گا۔ خشیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے، جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ آپ کو خدا سے دور کر دے گا۔ اہل دل اس کام سے ضرور ڈرتے ہیں، جو انہیں خدا کی محبت سے ذرا دور لے جائے۔ محبت کے چھن جانے کو خشیت کہتے ہیں۔

اللہ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے تین درجے رکھے ہیں۔ وہ جو کم اعمال رکھتے ہیں، جو درمیان میں ہیں اور جو خیر کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لیے سابقون الاولون کا نام استعمال کیا گیا۔ اس طرح بعض جگہ قرآن مجید نے کہا کہ الا انا اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون، اللہ کے اولیاء اور دوستوں کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خوف اور

حزن نہیں ہوتا۔ یہ لفظ صوفی صرف Lingustic addiction ہے۔ اس کو ہم بار بار اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ Being more current the modren time آپ اسے صوفی کہتے ہیں۔ اگلے بندے کے خیال میں فوری یہ ادراک چلا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں احساسات میں سپیشلسٹ ہوسکتا ہے۔ فرض کریں، اس کی بجائے آپ یہ کہیں کہ یہ ولی اللہ ہے، تو ولی اللہ زیادہ گمبھیر تاثر چھوڑتا ہے۔ ہم نے لفظ ولی کے ساتھ اتنی طاقت اور مناسبتیں تخلیق کر رکھی ہیں کہ صوفی کا لفظ بھی ولی اللہ کے لفظ کو Comensate نہیں کرتا، لیکن کسی کو کیا پتہ کہ ولی اللہ کتنی مرتبہ دن میں گناہ کرتا ہو۔

جہاں تک اللہ کے نزدیک کیٹگریز اور درجات کا تعلق ہے، اللہ نے فرمایا، نرفع درجات من نشا، جس کے میں چاہتا ہوں، درجے بلند کرتا ہوں۔ و فوق کل ذی علم علیم، کہ ہر علم والے کے اوپر علم والا ہے۔ اب تصوف میں بھی سب سے بڑے صوفی کو عارف کہتے ہیں۔ یہ لفظ عموماً غیر مستعمل ہے۔ آج تک کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا کہ جناب یہ عارف ہیں۔ یہ اتنا بڑا درجہ ہے اس میں دوسرا بڑا حجاب یہ ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو اللہ کا ولی نہیں کہلا سکتا۔ ولایت کا ادعا آدمی کے اپنے پاس نہیں ہے۔ یہ دعویٰ ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کون اس کا ولی ہے اور کون نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ساری زندگی کوئی آدمی اللہ کے ولی کے تاثر کو پورا کر رہا ہو اور ولی شیطان نکلے۔ کیونکہ شیطان کے بھی اولیاء ہیں۔ اولیاء رحمان کی طرح اولیاء طاغوت بھی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں سب کچھ بتایا ہوا ہے۔ عبادت احسان اسی کو کہتے ہیں۔ اخلاص، ایمان، احسان، تینوں تصوف کے معنوں میں آتے ہیں مگر ہم ان کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ نہیں کرتے۔ اگر ہم قرآن کے لفظوں میں کسی بندے کی سند کا ذکر کریں، تو ہم کہیں گے کہ یہ اللہ کا ولی ہے مگر وہ لفظ شاید باعث شرمندگی بن جائے، اگر وہ خود کہتے، میں اللہ کا ولی ہوں۔ حالانکہ یہ ایک عام آدمی بھی دعویٰ کرسکتا ہے کہہ سکتا ہے کہ تم شیطان کے ساتھی ہو، میں اللہ کا ولی ہوں۔ مطلب ہے میں اللہ کا ساتھی ہوں، دوست ہوں۔

مگر ہمارے معاشرے کے تناظر میں اور خاص طور پر ہمارے برصغیر کی تہذیب میں یہ لفظ اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی یا شیخ علی بن عثمان ہجویری اور معین الدین چشتیؒ سے کم کسی شخصیت پر لفظ ولی اللہ نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے اسے لفظ احترام سمجھ کر استعمال نہیں کیا

جاتا۔ جبکہ صوفی عمومی سا لفظ ہے۔ اس میں اتنا احترام انوالو نہیں ہوتا۔ حالانکہ صوفی میں بھی Sophistication ہے۔ صوفی کا لفظ چار رستوں سے آیا ہے۔ ایک تو یونان کے ٹیچر چلتے پھرتے علم دیتے تھے۔ ان کو Sophists کہتے تھے۔ بہت سارے علماء فکر کا خیال ہے کہ Sophists بعد میں صوفی ہوتے تھے۔ استاد اچھا وہی ہوتا ہے، جو بیٹھ کے نہ پڑھائے۔ گھومتے پھرتے جہاں جاتا ہے، رستے میں اس کا ہر قدم علم کا قدم ہوتا ہے۔ جہاں سے گذر جاتا ہے، تھوڑی بہت تعلیم دیتا جاتا ہے۔ تو ایک خیال یہ ہے کہ صوفی Sophists سے نکلا ہے۔

دوسرا نبی اکرم ﷺ کے دور میں جو غریب احباب تھے، ان کا بدترین لباس اس وقت اونٹ کے بالوں کا بنا ہوتا تھا۔ اس کو لباس صوف کہتے تھے۔ جو لوگ اسے پہنتے تھے، ان کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ انتہائی غریب ترین لوگ ہیں۔ مذہب میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کو بھی صوفی کہا کرتے تھے۔ تیسرے وہ ماہرین تعلیم تھے جو بالکل غریب تھے۔ وہ صبح و شام حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے تھے۔ بھاگتے دوڑتے ہوئے کام کرتے تھے اور قرآن و حدیث کا تھوڑا بہت علم رکھتے تھے۔ ان کو اہل صفہ کہتے تھے۔ یہ اصحاب اہل صفہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر اصحاب انہی لوگوں میں سے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ انہیں کفش بردار رسول کہتے تھے۔ ان کے طرز پر چلنے والوں کو صوفی کہتے تھے۔

آخری قسم کے بارے میں میرے استاد محترم سید علی ہجویر فرماتے ہیں کہ اہل صفا کو صوفی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ان کے لیے ہے، جو صفائی قلب کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ جن کی جدوجہد ہے کہ ساری زندگی وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد کے ساتھ اپنے دل کو صاف کرسکیں۔ ان میں سے کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جو غیر مذہبی یا غیر اسلامی ہو یا مذہب کے حوالے سے غیر قدرتی ہو۔ سوائے جن کو ہم یونانی فلاسفی میں Sophists کہتے ہیں، لیکن اس زمانے کے Sophists بھی مذہبی ہوتے تھے۔ ڈاؤنی سی ایس، ڈائی جی نس یا زینو ڈی سٹوئیک آف ایلیا اپنے اپنے زمانے کے اولیاء ہی تھے۔

بابے اور رومانٹسزم

مشینی دور میں بابے کا تصور ایک ذہنی سہولت ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض اوقات

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ بابوں کا کچھ زیادہ ہی ذکر کر رہے ہوتے ہیں، انہیں شاید توقع ہوتی ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر انہیں بھی کسی نہ کسی طرح بابا سمجھ لیا جائے۔ ممتاز مفتی صاحب زندہ تھے اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے اور جنت سے نوازے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے یہ بابا شاہ کاکو کی روایت غلط لکھی ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام آباد میں سکوٹر والا واقعہ بھی غلط لکھا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا، آپ نے اسے کیوں لکھا؟ مفتی صاحب پریشان ہوئے، انہوں نے اشفاق صاحب سے جا کر کہا، پروفیسر صاحب نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ یہ دونوں واقعات غلط ہیں۔ انہوں نے وہاں جا کر یہ بھی کہا کہ پروفیسر صاحب کے اردگرد ایک ہالہ (Aura) ہے۔ میں نے بے شمار مرتبہ انگلیاں ادھر ادھر ماری ہیں، مجھے تو وہ ایسا ہالہ نظر نہیں آیا۔ یہ مفتی صاحب کی اپنی سوچ ہے۔

اصل میں اس دوران پیرا سائیکوجیکل انسٹی ٹیوشن کا کچھ علم اور مذہب تصوف ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے ہیں۔ جیسے عظیمیہ سلسلے کے ایک بزرگ نے بہت ملاوٹ کی ہے۔ بہت سارے تبت کے لامائی تصورات اور افریقہ کے شامان کے تصورات اسلامی تصوف میں ملائے ہیں۔ اس سے اسلام کا عمومی تصوف کا تصور کافی مبہم ہو گیا ہے۔

ہماری اصل مشکل یہ ہے کہ ہم صوفیاء کو ان کے اعلیٰ ترین پیڈسٹل سے دیکھتے ہیں۔ ہم ایک آدمی کو اس لیے صوفی نہیں کہتے کہ وہ شیخ عبدالقادرؒ یا عثمان علی ہجویریؒ نہیں ہوتا، لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی پچاس پچاس برس کی زندگی اس کانسیپٹ تصور سے گذرتی ہیں اور اللہ ان کو مخلوقات عالم میں محبوب کر دیتا ہے۔ وہ خود شہرت کی تلاش نہیں کرتے۔ شیخ عبدالقادرؒ پچیس برس پہلے کیسے جا کر اعلان کرتے کہ میں ولی ہوں، مجھ کو مانو۔ وہ کبھی ایسا نہ کرتے اور کوئی بھی ولی ایسا نہیں کرتا۔ کوئی شخص اپنے ولی ہونے کا تشخص نہیں ابھارتا۔ یہ لوگوں اور خدا پر ہے جو کسی کی محبوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سے صوفی کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ صوفی انتہائی نا طاقت وجود ہوتا ہے۔ اگر اس کے وجود میں اثر ہے تو یہ اللہ کی مہربانی ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو ذاتی طاقتوں سے فارغ کر رہا ہوتا ہے۔ تبھی وہ خدا کے پیچھے ہوتا ہے۔ حضور کی دعا ہے، **یا حی یا قیوم برحمتک استغیث** کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے میری مدد فرما۔ **و اصلحنی شان کلہ** اور میرے تمام حالات کی اصلاح فرما **و لا تکلنی الانفسک طرفة عین** اور اے اللہ ایک نفس

جھپکنے کے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔ صوفی تو یہ دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔

اب اگر ایک صوفی یہ کہے کہ مجھ میں یہ اور وہ طاقت ہے میں یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، تو ایک عمومی معیار کے مطابق وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ جب مجھ سے مفتی صاحب نے پوچھا کہ یہ دو واقعے آپ نے کیسے جانے؟ میں نے کہا کہ یہ صوفی ازم کی لائن کے مطابق نہیں ہیں۔ صوفی کوئی پیشین گوئی نہیں کرتا اور نہ دعویٰ کرتا ہے۔ تاہم صوفیوں میں فرق دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے۔ کسی کی دعا سال کے بعد سنی جاتی ہے کسی کی چھ مہینے کے بعد، کسی کی مہینے بعد اور کسی کی منہ سے نکلتے ہی سنی جاتی ہے۔ دعا کی پہنچ ہی ان کا فیصلہ کرتی ہے۔ تصوف فی الوجود صوفیاء کے نزدیک بے معنی ہے کیونکہ خداوند کریم نے آگ کی نوعیت کو پیغمبر کے لیے تبدیل کر دیا۔

اب مجموعی طور پر صوفیاء کے روحانی اور تعلیمی معیار بھی کم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ Most top intellectual order کا سکول ہے۔ اس میں میں کسی وہم اور وسوسہ کی گنجائش نہیں پاتا۔ اس میں کسی تعویذ، دھاگے یا کسی جادو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں توحید کے بارے میں شیخ جنید کی تعریف دیکھ لیں، پوری زندگی صرف ہو جاتی ہے۔ کسی نے پوچھا، توحید کیا ہے تو فرمایا، توحید قدیم کو حاضر سے علیحدہ کرنے کا نام ہے۔ یعنی Separating the eternal from the accidental ایک ہی قدیم ہے اور وہ اللہ ہے۔ باقی سب Accidental ہیں۔ اسلام اسی توحید کا سبق دیتا ہے۔

ایک شخص گھوڑے پر بیٹھا تھا، اس کا کوڑا نیچے گر گیا۔ اس نے ایک شخص سے کہا، مجھے کوڑا اٹھا دو۔ حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا، بہتر ہوتا، اگر تو نیچے اتر کے لے لیتا۔ ایک نے مدد کے لیے کہا، تو آپ نے فرمایا، تجھے مدد تو دے رہا ہوں، مگر بہتر ہوتا تو اللہ پر توکل کرتا۔ اس طرح اللہ پر اعتبار اور اعتماد کے عملی سبق سکھائے گئے۔

حضرت برا ابن مالک کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بڑے برے حال میں آئے۔ صوف کے لباس میں تھے۔ جوتوں سے بو اٹھ رہی تھی۔ کپڑے گندے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ گرد و غبار میں اٹے بڑی دور سے آئے تھے۔ اصحاب رسولؐ کے سامنے آئے۔ حضورؐ نے یہ عالم دیکھ کر فرمایا کہ کچھ لوگ اس عالم میں آتے ہیں، بظاہر وہ بڑے غیر صاف لگتے ہیں اگر وہ قسم اٹھا لیں، تو خدا ان کی قسم ہر حالت میں پوری کرتا ہے۔ یہ وہ براُ تھے جب مسلیمہ کذاب پر

مسلمانوں نے آخری حملہ کیا، تو ہر مرتبہ براُ بن مالک سے کہا جاتا، آپ قسم اٹھائیں کہ کل فتح نصیب ہوگی۔ جب دو چار مرتبہ کہا گیا، تو براُ بن مالک نے کہا، آپ نے اللہ کے رسول ﷺ کی دعا کی، جو میرے حق میں تھی، کو مذاق بنا دیا ہے۔ میں قسم اٹھاتا ہوں کہ کل قلعہ فتح ہوگا اور میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں کل شہید ہو جاؤں گا اور دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

وہ بڑے عجیب و غریب لوگ تھے۔ ان کی ترجیحات بالکل کلیئر تھیں۔ ان کے نقش پر چلنے کے لیے عقل کے بغیر اتنی ہائی لیول Inte grity پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ اعلیٰ ترین کمٹمنٹ ہے۔ اگر قدم قدم پر معجزے ہوتے ہیں، تو انہیں آپ معجزے نہیں کہیں گے۔ یہ اصحاب کے لیے بڑی قدرتی چیز تھی۔ خدا کے پیغمبروں کے لیے تھی۔ وہاں خدا تھا اور وہ ان کے ساتھ تھا۔

سعد بن ابی وقاص قادسیہ کی فتح کو گئے۔ دریا بہت بڑا اور طغیانی پر چڑھا ہوا تھا۔ سامنے ایرانی بڑے خوش تھے۔ سعد بن وقاص نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا، کون میرے ساتھ آتا ہے۔ انہوں نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب باقی لوگوں نے دیکھا کہ سردار نے پھینک دیا ہے، تو انہوں نے بھی پھینک دیا۔ پورے کا پورا لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا، تو ایک آدمی کے پاس صرف ایک لوٹا گم ہوا تھا۔ جب پارسیوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اتنے سمندر اور طغیانی میں دریا عبور کر رہے ہیں، تو پکار اٹھے، دیواں آمدند، دیواں آمدند اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اسی طرح آج بھی ہم دعا حزب البحر پڑھتے ہیں، جو حضرت علاء الحضرمی کی ہے۔ حضر موت کی فتح کے وقت بیچ میں ایک جھیل آ گئی۔ یہ جھیل کے کنارے کھڑے تھے اور جھیل بڑی گہری تھی۔ حضرت علاء نے کہا، میں تو چلا ہوں، میں نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اپنا گھوڑا جھیل میں ڈال دیا۔ باقی سارے بھی پیچھے گئے اور یہ معرکہ بڑا مشہور ہوا۔ انہوں نے جیتا۔ اگلا اطمینان سے گاؤ خر کا شکار کر رہا تھا۔ مطمئن تھا کہ یہ لوگ کہاں جھیل پار کر کے نکل سکتے ہیں۔ اس موقع پر جو کلمے علاء نے پڑھے، یا علی یا عظیم یا حلیم یا علیم، وہ ابھی تک حزب البحر کا آغاز ہیں۔

اگر اللہ ہے اور اس کی طاقتیں وہی ہیں، جو مختلف کتب ہائے علم میں مذکور ہیں، تو کون اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، شکست دے سکتا ہے۔ یہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، تو ہمارا ایمان کمتر اور گھٹیا ہوگا۔ وہ اس درجہ اعتقاد تک نہیں پہنچ رہا۔ اسی لیے یہ ساری خرابی پیش آ رہی ہے۔ خدا خود کہتا ہے و انتم الاعلون ان کنتم صادقین مگر وہ کہتا ہے۔ ام

حسبتم تدخل الجنته تم گمان کرتے ہو کہ میں تم کو یونہی جنت میں داخل کر دوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا، یا تکم مثل الذین خلو من قبلکم اس سے پہلے بھی میں نے بہت ساری قوموں کو بڑی شدت سے مستہم الباساء و ضراء و زلزلوا، بیماریوں، دکھوں اور بہت ساری چیزوں سے آزمایا۔ حتی یقول الرسول والذین آمنو معو ایمان والے تو دور کی بات ہے، پیغمبر تک پکار اٹھے کہ متی نصر اللہ کہاں ہے تیری نصرت؟ اے اللہ تو کہاں ہے؟ تو اتنا بڑا اور اتنا پاورفل ہے یہ جو ہم چیخ چلا رہے ہیں، کب سے تیری عبادت کر رہے ہیں، وہ تیری مدد کب پہنچے گی۔ فرمایا، ان نصر اللہ قریب، بہت قریب ہے۔ صرف ایک جھمٹ کا ایریا ہی اس میں حائل ہے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون کس حد تک مجھ پر اعتبار کرتا ہے اور اگر آپ اس کے اعتبار کے دشت میں کامیاب ہو جائیں، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کسی شے کا محکوم نہیں کر سکتی۔

ذکرِ الٰہی، صورت اور اہمیت

اصول یہ ہے کہ وہ وقت ضائع سمجھا جاتا ہے، جو خدا کی یاد کے بغیر گذرے۔ مگر یہ کہنا آسان ہے لیکن تسبیح کو دل کا مائل ہونا مشکل ہے جو صبح و شام اس کو جاری رکھنا مشکل بنا دیتا ہے جب تک بڑے قدرتی طریقے سے انسان کے دل میں خواہش بن جائے وہ تسبیح بھی ایسی ہو، جو انسان ہر حال اور ہر رنگ میں جاری رکھ سکے۔ ہمیں تسبیح کا طریقہ کار کہیں سے ملا ہوا ہے۔ وہ طور طریقوں کے تحت کسی حال میں بھی جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے آپ کو ایک پیٹرن بنانا پڑتا ہے۔ ایک ماحول پیدا کرا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے بیشتر لوگ اللہ کی یاد جاری نہیں رکھ سکتے۔

دوسرے کچھ نا سمجھ، جبراً لوگوں کو خدا کی یاد سے روکتے ہیں کہ یہ اجازت آپ نے نہیں لی۔ فلاں اسم جلالی اور فلاں اسم جمالی ہے۔ خدا کو یاد کرنے والا کوئی بھی نام انسان کے لیے ضرر رساں نہیں۔ آپ اللہ کا جو نام بھی لیں اور جس حوالے سے بھی تسبیح کا ورد کریں، یہ اسماء آپ کو اللہ کی پہچان کراتے ہیں۔ فرض کریں، اسم ولی ہے۔ اس کا مطلب ہے مولیٰ، دوست، مددگار۔ اللہ کو دوست، مددگار اور اس کے ساتھ اچھی دوتی کے حوالے سے جاننے کے لیے پھر یہ ضروری ہوگا کہ خدا کے سوال کسی کو مولیٰ یا مددگار نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح اسم سلام ہے۔ یہ امن اور سکون کے حوالے سے ہے۔ اگر آپ وہ جاننا چاہیں گے، تو آپ کی ذہنی بےچینیاں اور کرب ضرور سامنے آئیں گے اور آہستہ آہستہ کم ہوں گے۔ حقیقت میں یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ آپ کے اندر کا فساد نکلے بغیر آپ کو امن نصیب ہو۔ وہ نکلے گا ضرور اگر تسبیح جاری رہے گی، تو تسبیح اس کرب اور فساد کو

ہمیشہ کے لیے ختم کرتی جائے گی اور وہ کیفیتیں دوبارہ اسی طاقت کے ساتھ آپ میں پیدا نہیں ہو گی۔

اسی کو زکوۃ کہتے ہیں۔ زکوۃ کا مطلب ہے، میل کچیل کو صاف کرنا۔ پیسہ آپ کا میل کچیل اور معاشرے میں آلائشیں، جو آپ کے ذہن اور دل میں پیدا ہوتی ہیں، انہیں صاف کرتا ہے۔ دریں اثنا تسبیح آپ کے دل کی وہ آلائشیں دور کرتی ہے جو خدا کے رستے میں حائل ہوتی ہیں اور جب یہ نکل جاتی ہیں، تو آپ کی تسبیح رکے گی نہیں۔ آپ چاہیں گے بھی، تو اسے چھوڑیں گے نہیں۔ دل اور ذہن اسے قبول کر لیتا ہے۔

زیادہ تر تسبیح کی رکاوٹیں ذاتی صلاحیت سے متعلق ہیں۔ کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ذہین لوگ ہیں۔ چوبیس گھنٹے یہ نام لینے کا کیا فائدہ۔ وہ اسے مناسب وقت بھی نہیں دے سکتے۔ تجربے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے یہ دیکھا اور میں فیل ہو گیا بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ ہم صبح و شام یہ تسبیح نہیں کر سکتے۔ تو یہ نہ ہو، تو تسبیح کا کیا فائدہ۔ حالانکہ تب بھی ہم ایک کم ڈگری زبانی ادائیگی پر قائم رہ سکتے ہیں اور یہ بھی خیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شروع شروع میں ذہن کنفیوژ ہوتا ہے۔ بہت ساری چیزیں اس میں مل جاتی ہیں، لیکن جوں جوں تسبیح آگے بڑھتی ہے یہ کنفیوژن کم ہوتا جاتا ہے۔

اس کا ایک اور فائدہ ہے کہ خدا پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ وہ وقت ہوتا ہے جب بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں، تو آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ میں ایک حقیقی وجود کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ بات جب پانچ حواس سے آگے جاتی ہے تو خدا کا احساس قریب تر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ذہانت، علم اور دانش ہے، جس سے انسان اللہ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔ جہلت خدا کی حریف ہے اور عقل و معرفت خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے۔

وظیفہ اور تسبیح میں فرق

خدا وظائف سے کبھی نہیں ملتا۔ وظیفہ اور تسبیح میں ایک بنیادی فرق ہے کہ جو وظیفہ پڑھیں گے، اس کا ایک انداز ہوتا ہے۔ اس انداز کے پس منظر میں کسی نہ کسی طاقت کا حصول ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو کوئی وظیفہ دیتا ہے کہ آپ اتنی دفعہ درود پڑھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو

حضور نظر آئیں گے، تو یہ بھی سو فیصد غلط بات ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس عمل کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، تو وہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ تقدیر کو پابند کرنے والی بات ہے۔ تعویذ، وظیفے وغیرہ سب کارِ شیطان ہیں۔ تو یہ ساحروں کی کارروائیاں ہیں، صوفیوں کی کارروائیاں نہیں ہیں۔ اس قسم کے تعویذات اور عملیات قرآن حکیم کے الفاظ میں میاں بیویوں میں فرق ڈالنا، محبتیں پیدا کرنا، جعل سازیوں کا کام ہے۔ حاضرات کا عمل، جسے جنات کی تسخیر کے اعمال کہتے ہیں، ان میں بھی آپ کسی اچھی طاقت کو نہیں پا سکتے۔ یہ منفی ماورائی طاقتیں ہمارے دماغ میں ہیں۔ انسان دو قوتوں کا بیک وقت آماجگاہ ہے۔ ایک قوتِ عقلیہ ہے جو ہمیشہ مثبت استدلال دیتی ہے اور دوسری قوت واہمیہ ہے جو منفی استدلال کی طرف جاتی ہے۔ انسان کی بہت ساری زندگی قوت واہمیہ میں گذرتی ہے۔

تسبیح کا جب تک مقصد متعین نہ ہو، تسبیح کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ تسبیح کا صرف ایک مقصد ہے کہ ہم اپنے کم تر حالات میں، جس میں ہم کھانا روز کھاتے اور لباس ہر روز بدلتے ہیں، اسی طرح اللہ کو روز یاد کریں۔ اس کے بعد آپ خدا کو کچھ کرنے دیں۔ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے اللہ سے کہا کہ تو میری زندگی کو ترجیحِ اول ہے۔ میں سانس لوں نہ لوں، تجھے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فاذکر اللہ کذکرکم آبائوکم، اللہ کو ایسے یاد کرو، جیسے اپنے آباؤاجداد کو یاد کرتے ہو، جیسے اپنے بیٹوں، بچوں، باپوں اور ماؤں کو یاد کرتے ہو۔ او اشدا ذکرا، بلکہ اور زیادہ محبت سے کرو، تا کہ اللہ کہتا ہے، مجھے یہ احساس ہو کہ آپ سب سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ لن تنالوالبر حتی تنفقو مما تحبون، تم میری محبت اور برات کبھی نہیں پا سکتے، جب تک کہ میری محبت باقی محبتوں سے کچھ بڑھ کر نہ ہو۔

اس تسبیح کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ اصول محبت وصال میں کبھی بھی نہیں پتہ لگتا۔ محبتیں وہی لازوال ہوتی ہیں، جن کے فراق کا ہمیں علم ہوتا ہے اور فراق میں جو سب سے بڑی بات آپ کو زندہ رکھتی ہے، وہ محبوب کی یاد ہے۔ ہم اللہ سے اس قدر دور چلے گئے ہیں کہ کہاں الست کا دن اور کہاں یہ دن اور یہ بیچ میں چھوٹے موٹے گیپ نہیں، صدیوں کے فاصلے ہیں۔ ہم اس گیپ کو سوائے اس کی یاد کے پر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس کی یاد میں پڑے ہوئے ہیں، تو یارب ہارب اور صدیوں کے فاصلے پر ہو جاتے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اللہ سے بندہ زیادہ رومینٹک نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ہماری رومانویت کو Fact & Figures چاہئیں۔ اللہ میں Facts & Figures نہیں ہیں۔ مگر ایک وابستگی اور وفاداری ہے جو تمام تعلقوں سے بچا کر اس سے خصوصی تعلق پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ تاکہ مرتے وقت میں کہہ سکوں کہ میں ہر قسم کے آسیب اور فتنے کی زد میں رہا۔ مگر اے پروردگار،

گو میں رہا رہینِ منت ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

صرف اتنی سی بات ہے۔ ہم مکمل نہیں ہیں اور پھر ہم متوازن بھی نہیں ہیں۔ اعلی ترین توازن کے نمونے گذر گئے۔ محمد رسول ﷺ گذر گئے۔ آپ ﷺ کیا ہستی تھے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ایک جملہ مجھے ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ فرمایا، رسول ﷺ گذر گئے۔ ہمیں اور کسی چیز کا کیا غم ہوسکتا ہے۔ اگر دیکھیں، تو یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا انتہائی ذہین Statement ہے۔ اگر ایک انسان سے اس کا پرفیکٹ آئیڈیل چھن جاتا ہے۔ ایک اعلی ترین شخصیت، ہر ویلیو کی آماجگاہ اور ہر قدر کی سردار شخصیت ہم سے جدا ہوجاتی ہے تو باقی انسانوں میں ہم کیا ادب اور کلچر ڈھونڈتے پھریں۔ کوئی اور کس طرح میرے دل اور دماغ کا امیج بن سکتا ہے۔ اب ہمیں اور کس کا غم ہوسکتا ہے؟ میرا بچہ کون سا اتنا بڑا دانشور اور عالی دماغ ہوگا کہ میں اسے روتا رہوں۔ میرے ماں باپ میں کیا غیر معمولی خوبی ہے کہ وہ اگر رخصت ہوگئے، تو میں ان کا ماتم کرتا رہوں۔ اصل رونا تو یہ ہے کہ رسول اللہ گذر گئے۔ جب وہ گذر گئے، تو اب اس قسم کا غم کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ ایک Creator of situation گیا، اب Created situation رہ گئی۔

میں عقیدت سے نہیں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ دنیا کے تمام مسائل کو ذہنی طور پر حل کرنے کے بعد بھی مجھے اگر کنفیوژن ہوتا ہے۔ ذہنی بے چینی یا اضطراب محسوس ہوتا ہے، تو میں حدیث رسولؐ سے رہنمائی لیتا ہوں۔ پوری دنیا کی کوئی کتاب، فلسفہ، خیال، حساب، کلچر نہ سائنس، کوئی اس میں کام نہیں آتا۔ میں نے محدثین کو دیکھا، مجھے حیرت ہے کہ وہ خدا کے رسول ﷺ کے

پیچھے اس ذہانت کو نہیں دیکھتے کیونکہ رسول صرف رسول نہیں ہوتا، وہ اپنے وقت کا ذہین ترین انسان ہوتا ہے۔ مگر ہمارے رسول ﷺ کی صفات عالی یہ ہے کہ وہ ہر وقت کے ذہین ترین انسان ہیں۔ میں نے اپنے مضامین میں نظریہ جمال پروردگار اور محمد رسول اللہؐ دونوں میں یہی چیز اجاگر کی ہے کہ جمالیاتی اور ذہنی طور پر بھی کسی شخصیت میں کاملیت (Perfection) قریب نظر آتی ہے تو وہ رسولؐ اللہ کی ذات ہے۔ وہ ایک اعلیٰ ترین اعتدال گذر گیا۔ ہم ایک صحابی بھی نہیں ہو سکتے۔ اصحاب رسول بھی گذر گئے۔ دوسرے درجے کا اعتدال گذر گیا۔ ہم تابعین بھی نہیں ہو سکتے۔ ہمارا یہ بھی اعتدال کا درجہ گذر گیا۔ ہم اپنی پوری کوشش کریں کہ ہم اعتدال کے قریب رہیں۔

ہمارا کاز کتنا مشکل ہے۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی خوبیاں جمع کرنی ہیں۔ **و من یعمل مثقال ذرة خیراً یره۔ و من یعمل مثقال ذرة شرا یره۔** دو چار ذرات خیر جمع کر لیں۔ شر تو ہم جمع کر ہی رہے ہیں۔ دو چار ادھر، دو چار ادھر سے خیر جمع کر کے متاعِ فقیر سنور جائے گی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ خدا ہر وقت دستیاب ہے۔ آپ اسے نہیں طلب کر رہے ہوتے، وہ آپ کی ہمسائگی کی آرزو کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے آپ کو اپنے لیے بنایا ہے۔ ہم نے اس کو اپنے لیے نہیں بنایا۔ اسی لیے جب حضرت شیخ بایزید بسطامی نے کہا کہ میں چالیس برس خدا کی تلاش کرتا رہا۔ جب میں نے اسے پایا، تو معلوم ہوا، وہ مجھ سے پہلے میری تلاش میں تھا۔

خدا ہمیں تلاش کر رہا ہے، ہم اسے ڈھونڈ نہیں رہے۔ ہم میں کوئی صلاحیت تو ہو، جسے وہ اٹھا لے۔ کوئی صحتمندی خیال تو ہو۔ ہم تو وہم اور وسوسہ کی سرزمین میں سفر کرتے ہیں۔ جسے آپ ماڈرن ورلڈ کہتے ہیں، یہ میٹرکس کی دنیا ہے۔ آسیب کا جہان ہے۔ آپ جا کر دیکھیں، سڑکوں پر جنونیوں کی طرح سیلاب پھرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم سب کمپیوٹر کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ کسی ویرانی خیال کو بڑھ رہے ہیں۔ جہاں کوئی امید، کوئی شگوفہ حیات نہیں۔ مشرق جذباتی ہے۔ مغرب معروضی ہے۔ مگر حل ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ ہماری جذباتیت ہمیں ان نالائقوں کے پیچھے لے جاتی ہے، جن کے پاس علم، خلوص اور نہ ایمان ہے۔ جو دوسروں کے خیر کے جذبات کو مسخ کرنا جانتے ہیں۔ مغرب ان چیزوں کو مانتا ہی نہیں۔ کیونکہ ہماری یہ کیفیت اس کے حساب و کتاب اور شمار میں نہیں آتی۔

مگر دونوں کے درمیان رستہ وہی اعتدال ہے کہ محبت کا جذبہ ہماری رگوں میں سلامت

رہے مگر ساتھ ساتھ ہمارا شعور ہمیں معروضیت سے بھی آگاہ رکھے۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اللہ کو مانو۔ مگر جب دنیا کے حقائق پر غور کرو، تو یہ نہ کہنا کہ یہ باطل ہے۔ بلکہ یہ کہنا کہ **سبحانک ربنا ماخلقت ھذا باطلا۔** اے اللہ! اسے تو نے باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ غلط نہیں، صحیح ہے۔ میری ہر چیز کا امتحان میری دنیا میں ہے۔ میرے اخلاق، میرے کاروبار، میری جدوجہد اور مشاغل کا امتحان میری دنیا میں ہے۔ جتنا عرصہ ہم یہاں ہیں، ہمیں اس انداز زندگی سے گذرنا ہوگا۔

تسبیحاتِ بلاناغہ ضروری

اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ وفا پسند ہے۔ یہ نہیں کہ آج پڑھا اور کل ناغہ کر لیا۔ وہ پوچھے گا ضرور کہ آج مجھ سے کیا چیز تمہیں زیادہ اہم لگی کہ تم نے ناغہ کر لیا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تسبیح میں ناغہ نہ آئے۔ باقی جیسا مرضی ہے پڑھ لیجیے۔ تھوڑا، زیادہ، رات کو، دن کو، سارا دن، ساری رات، جب چاہے پڑھ لیجیے۔ جب آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ تسبیح آپ کا جزو دل و دماغ ہو گئی ہے تو جس کو چاہیں، بتائیں۔ ہر شخص کے لیے اس کے تیکنیکی پہلوؤں کے مطابق تسبیح ہے۔ اس ضمن میں کوئی حجاب اور کوئی ستر نہیں ہے کہ اس کے اثرات افشا کیے جائیں۔ یہ پرانے زمانے کے یہودیوں کے طریقے تھے کہ کہیں دوسرا بندہ کسی چیز سے آگاہ نہ ہو جائے۔ گھٹیا پہلوان سارے گر نہیں سکھاتا تھا، تاکہ شاگرد اچھا گر سیکھ کر کہیں اسے ہی نہ گرادے۔ رازداری اور خوف پیدا کرنا Occult اور جادوگروں کا پیشہ رہا ہے، اللہ کے بندوں کا نہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ خدا کا ذکر، اس کی یاد اور اس سے تعلق عام ہو۔ مگر اہم یہ ہے کہ کسی آدمی کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق تسبیح دی جائے۔ یہ ٹیکنالوجی شاید ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔

تسبیح، مہندی کی طرح یا سبز چائے کی طرح ہے جو ہولے ہولے رنگ چھوڑتی ہے۔

اس علم میں دنیاوی علوم کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں سادہ پوسٹ گریجویٹ ہوں۔ سرکاری طور پر ہزاروں، لاکھوں پوسٹ گریجویٹ انگلش میں ہوں گے، لیکن وہ تمام شاید اسی رجحان کے مالک نہیں ہوں گے۔ اس بچے کا تصور کیجیے، جس نے پانچ سال کی عمر سے بھاری مطالعہ شروع کر دیا ہو۔ دسویں جماعت تک میں نے ڈاکٹر ژواگو اور مائیکل شولوخوف پڑھ رکھے تھے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کا مطالعہ کر لیا تھا۔ علمی تجسس آگے بڑھتا ہوا فطری استحکام تک پہنچتا ہے۔ جس کو

دعویٰ عقل اور دعویٰ جستجو و تحقیق ہو، اس کا فطری انجام اللہ ہے۔ آپ اور کہیں جا ہی نہیں سکتے اور جہاں علم رکے گا، آپ کسی کلاس کے خوگر ہو جائیں گے۔ کسی Partisanship میں چلے جائیں گے یا کسی جماعت کے پیروکار ہو جائیں گے۔ وہاں ایک بت پیدا ہو جائے گا۔ آپ کی ذہنی ترقی رک جائے گی۔ آپ آگے بڑھنے سے انکار کر دیں گے۔ سو جسے Occult کہتے ہیں، وہ جماعتوں سے پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر حال میں آزاد ہوتا ہے۔ جب مجھے خدا کے بارے میں سوچنے کی آزادی ہے، تو مجھے بس اتنا پتہ ہونا چاہیے کہ میں وہ سوال نہ اٹھاؤں، جس کے لیے میرے پاس ڈیٹا پورا نہیں ہے اور اگر میں نے سوال اٹھا لیا ہے، تو اتنا صبر کروں کہ مکمل ڈیٹا حاصل ہو جائے۔

میرے ذہن میں خدا کا سوال ہمیشہ سے رہا ہے۔ لیکن میں صبر سے وہ تمام ڈیٹا جمع کرتا رہا، جو خدا کے بارے میں لازم اور ضروری تھا۔ میری ساٹھ سال سے اوپر عمر ہے۔ آخر کار میں نے وہ دلیل پائی، جو آج تک مجھ سے نہیں ٹوٹی، مجھ سے رد نہیں ہو پائی۔ اللہ کو پانے کے لیے میں نے جو دلائل کا طریق کار وضع کیا ہے، وہ آج تک کسی فلاسفر سے رد نہ ہو سکا نہ کسی عملی مثال سے ٹوٹا ہے۔ اپنے پہلے لیکچر میں، میں نے اس دلیل کا صرف نقش اور خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کی بنیاد حقائق پر ہے تصور پر نہیں۔ میری دلیل کی بنیاد فلسفے اور کسی انکوائری سے نہیں مل سکتی کہ Allah is the top priority اس کی بنیاد صرف ایک اصول پر قائم ہے اور چار سوالات ہیں۔

ایک تو مجھے اپنے بارے میں یہ سوال کرنا ہے کہ میں آزاد ہوں یا غلام۔ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ اللہ ہے یا نہیں ہے۔ میری آزادی یا میری غلامی میں صرف اللہ حائل ہے۔ اگر اللہ حائل ہے، تو انسانی آزادی کے چیمپئن کے طور پر اللہ مجھے پسند ہوگا یا نہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہوگا سو جب آپ اللہ پر گفتگو اور بحث کرنے چلتے ہیں، تو یہ بنیادی عنصر ہے کہ خدا آپ کی آزادی کا سب سے بڑا حریف ہے۔ اس کو نہ ماننا عین فطرت ہے اور ماننا مشکل۔ اس لیے یورپ اس کو نہ ماننے میں آسانی سمجھتا ہے۔ ان کے آزادی کے نظریات کا سب سے بڑا حریف مذہب ہے اور مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہوا اللہ ہے۔ مگر ان بے وقوفوں نے ایک سوال حل نہیں کیا کہ اللہ ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال جس کا سامنا ہمیں تمام تر فلسفوں میں کرنا پڑتا ہے، یہی ہے کہ اللہ ہے یا

نہیں۔ بقول برٹرینڈ رسل، مسلمان کے پاس ڈیٹا ہے۔ مگر یہ ان کی حماقت ہے کہ وہ ڈیٹا نہیں جانتے۔ مگر جس شخص کے پاس پوری 365 صفحے کی کتاب ہو، اور دعویٰ کر رہی ہو کہ میں اللہ کا ڈیٹا ہوں۔ شاید آپ نے قرآن کریم کو اس حیرت سے نہ دیکھا ہوگا، جو غیر مرئی قوت زمین و آسمان کے ادراک سے بالاتر ہے، اس کے الفاظ اس 365 صفحات کی کتاب میں درج ہیں، مرقوم ہیں اور اس کی ایک آیت کو چیلنج کر دینے سے ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ آپ کی فکر کے لیے میں ایک اور تجویز پیش کروں کہ میں ہزار جھوٹ بول کر بھی انسان رہ سکتا ہوں، لیکن خدا ایک غلطی کر کے بھی خدا نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ آپ قرآن میں ایک غلطی کی نشاندہی کریں اور آپ آزاد ہیں مگر آپ ایسا نہیں کر پاتے، تو پھر آپ کو خدا کی ذات پر ایمان لانا ہوگا۔

تسبیح کی رکاوٹیں

اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو میں تسبیح دیتا ہوں، یہ نفس پر بوجھ ہے۔ کسی بھی نئی عادت کا اختیار نفس پر بوجھ ہوتا ہے۔ کسی نئے کام کا بیڑا اٹھانا، کسی بھی نئی عادت میں ڈھلنا اور خاص بات یہ کہ اس عادت کو اپنانا بہت گراں ہوتا ہے۔ جس کے مخالف بہت ہوں۔ اللہ کی یاد کے آگے تو بہت سارے حصار یا دشمن ہیں۔ اس میں ایک تمہارا اپنا نفس ہے، جو صبح و شام نئے طرز معاشرت کے بہانے کرے گا۔ نئے راستے نکالے گا۔ کاہلی و سستی کی دعوت دے گا اور دوسرا شیطان رجیم ہے۔ وہ کیسے پسند کر سکتا ہے یا کرے گا کہ آدمی ذکر الٰہی میں مصروف ہو جائے۔ شیطان جانتا ہے کہ جس نے ذکر خدا شروع کر دیا وہ اس کی قید اور حدود وا ختیار سے باہر نکل گیا۔ شیطان ہر کام کر سکتا ہے مگر کسی آدمی کے اخلاص کو اللہ کی یاد کی راہ نہیں بتا سکتا۔ یہ ناممکن بات ہے کہ وہ اللہ کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ ہم پر مختلف دباؤ ڈالے گا۔ شیطان اس پر زور دے گا کہ اسمائے الٰہیہ بار بار دہرانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ قینچی مارنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کہ ایک دن نہ پڑھی، تو اس سے کیا نقصان ہوگا۔

تیسرا یہ اعتراض کرے گا کہ گنتی کا کیا فائدہ ہوگا۔ بے حساب پڑھو۔ اگر وہ تمہیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ بے حساب پڑھو۔ کیوں گنتی کر کے پڑھتے ہو یا Counting کرتے ہو۔ اسے اچھی طرح پتہ ہے کہ فطری طور پر یہ اس قابل نہیں ہے کہ لگاتار پڑھ سکے۔ پہلے تین سو پڑھتے ہو،

پھر سو پر آ کر رکتے ہو۔ پھر تینتیس پر ٹھہرتے ہو اور آخر کار تسبیح صفر ہو جاتی ہے۔

مشورہ وہ صحیح دے رہا ہے کہ بے حساب یاد کرو مگر انسانی عادات کا اس سے زیادہ کوئی فہم نہیں رکھتا۔ وہ کئی ارب سالوں سے ہمارا دشمن ہے۔ اس کے دفاتر میں ہماری فائلوں پر فائیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اسے از بر ہیں کہ انسان کس طرح کا سلوک کرتا ہے۔ کس طرح کا طرز عمل اختیار کرتا ہے یا کس طرح پیش آتا ہے۔ شیطان کے عملے سے زیادہ ذی روح انسانی جبلتوں کی اتنی واقفیت و آگہی کوئی نہیں رکھتا۔ کوئی ذی روح اس سے زیادہ ہم سے شناسا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میں بہت عقلمند اور مدلل سوچنے والا انسان ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ اس کم بخت کے پاس مجھ سے بہتر ڈیٹا موجود ہے۔ یہ وہی امریکہ والا حساب ہے۔ میں کتنا بھی ذہین و فطین بن جاؤں۔ میرے پاس اتنے سپر کمپیوٹرز نہیں ہیں۔ ہم یہاں حیران رہ جاتے ہیں کہ امریکہ بہادر ہمارے بارے میں ڈیٹا فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کتنی اطلاعات ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کتنے واقف ہیں۔

یہی شیطانی طریقہ کار ہے۔ ہر وہ انسان، جو خدا کی طرف راغب ہونے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس کی تمام عادات و اطوار اور اس کے تمام نظام سے واقف ہے۔ اس کے بھی کمپیوٹرز کام کر رہے ہیں۔ اس کے پاس ڈیٹا موجود ہے وہ کہتا ہے کہ صاحب کہاں جائے گا۔ فلاں قدم پر میں اسے اچک لوں گا۔ اگلے قدم پر پکڑ لوں گا۔ انسان ایک عورت کی حد تک ہی نہیں رکتا، اس نے تو چھ عورتیں لائن میں لگائی ہوتی ہیں۔ چلو اس عورت پر کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس پر نہیں پکڑا جاتا تو دوسری عورت پر ضرور ڈھیر ہو جائے گا۔ اس کی یہ کمزوری ہے۔ یہ ماں سے بڑی عورت کے ساتھ ٹریپ ہو جائے گا۔ اسے ہر نفسیاتی اعداد و شمار کا علم ہے۔ جہاں کہیں آپ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں، مارے جاتے ہیں۔

سوائے ایک چیز کے اگر آپ تلاش حق میں مخلص ہیں، تو وہ زیادہ دیر تک مکر و فریب اور دھوکہ دینے کے قابل نہیں ہوگا۔ اسی بات کو اللہ نے قرآن مجید میں شیطان کے بالمقابل کہا ہے **فاغوینا** کہ میں ان کو ضرور اغوا کروں گا۔ اوپر سے، نیچے سے، دائیں سے، بائیں سے۔ اللہ نے فرمایا کہ تو ضرور کرے گا، مجھے علم ہے **الا عباد اللہ المخلصین** مگر تو ان بندوں کا کچھ نہیں کر سکے گا، جن کا ذرہ برابر اخلاص بھی میرے ساتھ ہوا۔

بے حساب پڑھو، جتنا اپنی مرضی سے پڑھ سکتے ہو، لیکن مجھے اتنا علم ہے کہ اگر تمہاری عادت تین سو بار پڑھنے کی راسخ ہو جائے، تو پھر تم آگے بڑھ سکتے ہو۔ تمہیں چھوڑتے وقت بہت ناگواری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت اور وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ بہت کم استقامت رکھتے ہیں۔ اگر آپ پرانے بزرگوں کی طرف دیکھیں، تو میری تسبیح ان سے کہیں زیادہ ہے، جو میں دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر سیدنا خواجہ مہر علی گولڑہ شریف کے پاس عام آدمی جو بھی آتا، آپ اسے دس دفعہ کلمہ، درود شریف اور استغفار کا ذکر دیتے۔ یہ کافی ہے۔ اگر کسی نے دس مرتبہ ہی پڑھ لیے، تو یہ کافی ہے، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وقت تبدیل ہو گیا۔

وظائف واذکار پر نظر ثانی

یہ کوئی ایسی خصوصی سٹیج نہیں ہے بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ تسبیح کے فوراً بعد انسان مستحکم ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے فوائد مل گئے ہیں۔ واقعتاً اسے فوائد مل گئے ہوتے ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد صورتحال بدل جاتی ہے۔ نیا بحران آتا ہے۔ اس کے لیے باڈی اور مائنڈ تیار نہیں ہوتا۔ آپ کے ذہن میں آتا ہے میں اب پریشان ہوں تو نئے چیلنجوں اور نئے بحرانوں کے لیے آپ رجوع کرتے ہیں۔ استاد کا صرف یہی کام ہے کہ وہ نئے چیلنجوں کے درپیش آپ کو اللہ کے اسمائے حسنیٰ تجویز کرے۔ اللہ کو یہ پسند ہے کہ یہ شخص مجھے زیادہ یاد کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو کوئی اور مصیبت ڈال دیتا ہے تا کہ آپ کا رجوع تیز تر اور طاقتور رہو۔

ایک کام جس کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں ٹاسک دیا گیا، وہ کام ہے جو تخلیق کا باعث ہے اور جس میں خدا نے ہر ممکنہ ہمیں سہولت دی ہے۔ تعیشات اور بیویاں دیں۔ رزق اور کاروبار دیا۔ یہ سارے کے سارے کام سہولت ہیں۔ ان میں سے کوئی ہمارا کام نہیں۔ ان کاموں کو نکال کر آپ اس ویران اور بنجر پوری دنیا کی زمین پر ایک آدھ آدمی کی پیش رفت دیکھیے، جو شواہد و آثار سے جہنم جاتا ہے یا جنت کا راستہ بتاتا ہے۔ اس کی بقا ہر وقت داؤ پر ہے۔ اس کو خوف و وحشت اور تنہائی سے آزادی کا کیسے ایک لمحہ بھی مل سکتا ہے کہ وہ اللہ سے رجوع کرے۔ اب قدرتی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب، محبت، شناخت اور پہچان کے لیے بہت پہلے سے ہماری Arrangement کر دی۔ حدیث رسولؐ ہے کہ قلم خشک ہو چکا، پچاس ہزار سال

پہلے، جو لوگوں کی تقدیریں بناتا ہے۔

اگر تقدیریں بن چکی ہیں تو یہ سارا ڈھونگ اور سب فراڈ سا لگتا ہے کہ ہم Repeated Circumstances سے گذر رہے ہیں۔ ایسے جیسے کہ ہمیں جہنم اور جنت کی مشق کرائی جا رہی ہو۔ مگر ایسا ہے نہیں۔ جنت اور جہنم کے حالات زندگی ہوتے نہیں۔ دنیا کی کامیابی یا ناکامی، وہ تمام حالات ہیں، جنہیں کسی ذات کے لیے خصوصی طور پر ایسی سہولتیں سمجھا جائے گا، جو اسے اپنے مقصد تک بہتر پہنچا دیں۔ اگر مصائب کی زندگی میں نے گذاری ہے تو میں اسے مصائب کی زندگی سمجھتا ہوں۔ مگر اوپر بالائے کائنات سائنسی طور پر کام کرنے والا میرا کمپیوٹر اسے مصائب نہیں سمجھے گا۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کا رزق نہ ہو، تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کسی کا زیادہ ہو، تو وہ کافر ہو جاتا ہے کسی کو غربت کافر کر دیتی ہے کسی کو امارت کافر کر دیتی ہے۔ قدرتی طور پر اوپر بڑا ہی سائنسی اعتبار سے طے کر دیا گیا ہے کہ اس شخص کی بہترین ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں گی، اگر یہ حالات ہوں گے وہاں اچھے برے نہیں دیکھے جاتے، وہاں صرف بہتر جگہ پاتے ہیں، اس کو اللہ کی رحمت کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کے حالات اگر اس کی وجودی استطاعت کے مطابق ہوں۔

ایک آدمی بڑا ظالم، سرکش اور جنون والا ہے۔ اس کے معاملات میں سختی زیادہ لکھی ہے تاکہ اس کو بار بار مار پڑے، ناکامیاں ہوں، اس کی ذات کی طاقت ٹوٹے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو کہ مجھ سے بھی بڑا کوئی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے مضبوط اور اٹل ارادے والے شخص بھی کہتے ہیں کہ میں نے خدا کو اپنی ناکامیوں سے پہچانا اور ارادوں کی شکستگی سے شناخت کیا۔

اس سطح پر جب میں سوچتا ہوں، تو لگتا ہے کہ خدا کو شاید پانا، یاد کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ اس میں کوئی پیچ نہیں۔ جن لوگوں نے بھی پچھلے صوفیا کو پڑھا ہے، ان میں کوئی رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ یہ برصغیر کے طور طریقے ہیں۔ جنید، شیخ عبدالقادر جیلانی میں کوئی Mannerism نہیں ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں انہوں نے سختیاں ضرور اٹھائیں اور یہ سختیاں انہوں نے خود اختیاری کے تحت اٹھائیں۔ یہ نہیں کہ ان پر مسلط کی گئیں کہ بھوکے مرو۔ جب کوئی چیز بندے کا چوائس بن جائے تو اس کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کی نوعیت چوائس کے مطمح نظر پر ہے۔ فرض کیجیے، میں نے سرکاری نوکری کبھی نہ کرنا چاہی۔ اگر نہیں کی یا نہیں کرنا چاہی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں

کسی قیمت پر بھی حکومت کی Wishful thinking کا حصہ نہیں ہونا چاہتا۔ میں ٹیچر بننا چاہتا تھا اور میں اپنے تمام کیریئر میں ٹیچر ہی رہا۔

اب وہ میرا چوائس تھا۔ شروع میں مجھے چوائس دیا گیا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر انڈسٹری یا ڈی سی ہو جاؤ۔ اگر میں ابتدا میں کوئی ایسا فیصلہ کرتا، تو میں اس وقت سیکرٹری انڈسٹری یا ڈائریکٹر جنرل ہو جاتا۔ یہ ہو جاتا، وہ ہو جاتا وغیرہ۔ مگر اپنی چوائس استعمال کرنا میرا مطمحِ نظر ہی نہیں تھا۔ سٹیٹس، دولت، نہ کرپشن۔ میں نے ٹیچر بننے کو ترجیح دی۔

اب میں نے ٹیچر بننا کیوں پسند کیا؟ کیونکہ میں زیادہ سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ سے اور خدا سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، میں کلیئر ہوں۔ میرا خیال یہ تھا کہ زندگی کے انجام تک پہنچنے کے لیے آئیڈیل بڑا ہونا چاہیے۔ میں نے حساب لگایا، کیا عورت آئیڈیل ہو سکتی ہے؟ اندازہ ہوا، بالکل نہیں ہو سکتی۔ دو چار سال میں اسے بڑی شدت سے پیار کروں گا، پوجوں گا، تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔ میری انا اس قسم کی ہے کہ میں ساری زندگی ایک عورت کی پرستش نہیں کر سکتا نہ اسے چاہ سکتا ہوں۔

جب میں نے دولت کے بارے میں غور کیا، میں نے کہا، اگر اتنے سارے پیسے ہو بھی گئے۔ خدا نے دے بھی دیئے تو کیا میں انہیں خرچ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہلکان کرتا رہوں گا؟ میں نے تو مرنا ہے اور میں کتنے بھی وسائل کا مالک ہو جاؤں، میں نے اسے دوسروں کے لیے چھوڑ کر جانا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پیسہ ویسے بھی ایسی چیز ہے کہ جو سوچتا نہیں ہے۔ سوچتے تو آپ رہے ہیں اور پیسہ اکٹھا کر کے پھر بھی آپ نے سوچنے کی طرف مائل ہونا ہے تو کیا آپ صرف پیسے کے بارے میں سوچو گے کہ اسی کو اکٹھا کرنا ہے؟ اسی کو جمع کرنا ہے؟ مجھے Shylock اپروچ نظر آئی۔ پیسے والے لوگ دیکھے تھے۔ ان کی بھری دیکھی۔ آزمائش بھی دیکھی تھی، تو اس نے مجھے اپیل نہیں کیا۔ میں جتنا کچھ چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے گذر اوقات کے لیے وسائل دے، اس سے زیادہ کبھی کہا نہیں۔

تیسری چیز تعلیم اور نالج ہے۔ یہ مجھے لالچ تھا کہ میں ایک اچھا دانشور رہوں۔ کافی عرصہ تک میں انائے علمیہ کا شکار رہا۔ میں نے خیال کیا کہ لٹریچر، زبان اور سائنس میں حرفِ آخر ہونا کیا ہی بات ہو سکتی ہے اور اس کے لیے بے اندازہ مطالعہ آپ کو مطمئن کر سکتا ہے، لیکن میں

نے سوچا کہ اس سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ اگر پھر بھی مجھے لوگوں کے توسط سے دیکھنا اور سوچنا ہے اگر میں نے یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی Appreciation میرے لیے کیا ہے تو ساری زندگی میں ایک ناجائز اور ناقص پروجیکشن کے لیے جدوجہد کروں گا۔

میری تسبیحات کا انتخاب

میری تسبیح کے انتخاب میں کہیں عملیاتی قدرت کا ماحول نہیں ہے۔ واحد وجہ یہ تھی کہ میں خدا کو ہر اچھے انداز میں یاد کروں۔ ان میں کچھ پیغمبرانہ لہجے بھی تھے جو مجھے بے حد پسند تھے وماابری نفس نفس سے بری چیز کیا ہے ان النفس لا مارة بالسوء نفس تو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے الا ما رحم ربی کہ جب تک اللہ رحم نہ کرے ان ربی غفور رحیم بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ حضرت یوسفؑ کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیغمبروں کے لہجے میں بڑی حسن وخوبی ہوتی ہے کہ وہ عام آدمی یا خارجی افراد کی طرح بات نہیں کرتے۔

مجھے پیغمبروں کا طرز تکلم بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اس جیسا لب ولہجہ جو قرآن میں موجود ہے، وہ تمام میری تسبیحات بن گئیں۔ حضرت شعیبؑ قرآن مجید میں جب گویا ہوئے ان ربی علی کل شی حفیظ کہ بیشک میرا رب ہر چیز کی حفاظت پر قادر ہے۔ میں نے اس کا بھی انتخاب کرلیا۔ حضرت سلیمان علی شان نے فرمایا ان ربی غنی کریم بے شک میرا رب غنی وکریم ہے۔ یہ تسبیح بھی میں نے اچک لی۔ یہ بارہ کی تعداد میں تسبیحات ہیں۔ اسی طرح حضرت ہودؑ کی تسبیح ہے ان ربی علی کل شی علیم کہ میرا رب ہر شے کا عالم ہے۔ جتنی بھی تسبیحات میں نے قرآن کریم سے حاصل کیں، یہ میرا پیکج ہیں۔

حسبی اللہ ایک جملہ ہے اور عام طور پر سارے لوگ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ اللہ کافی ہے۔ یہ معتبر انداز ہے۔ مگر اس کے پانچ انداز ہیں۔ ایک حدیث کا، جبکہ چار قرآن مجید کے انداز ہیں۔ میرے سوا شاید یہ کسی کی کم ہی تسبیح ہوگی حسبی اللہ علیہ یتوکل المتوکلون کہ اللہ کافی ہے اور تمام بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنی پیاری اور خوبصورت بات ہے۔ میں کبھی اسے نہیں چھوڑ سکا۔ حضور گرامی ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ حسبی اللہ حسیب اللہ تمہارے لیے بہت کافی ہے، جو اچھا حساب کرنے والا ہے۔ اگر تم یہ تسبیح پڑھتے ہو، تو

پھر حساب کے جھنجھٹ سے آزاد ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے حسبنا اللہ و نعم الوکیل یہ بھی تسبیح ہے حسبی اللہ لا الہ الا ھو توکلت علیہ و ھو رب العرش العظیم یہ عرش کے ملائکہ کی تسبیح ہے اور یہ بھی میرے پاس ہے۔ پھر ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کو جب دہکتی آگ میں ڈالا گیا، تو جبرائیل نے عرض کی آپ کو کیا میری معاونت درکار ہے؟ تو ابراہیمؑ نے کہا کہ کیا میرا میرا رب مجھے نہیں دیکھ رہا؟ تو یہ ارشاد فرمایا حسبنا اللہ و نعم الوکیل. یہ حسبی اللہ کے پانچ انداز ہیں۔ چونکہ مجھے بہت پسند ہیں، لہٰذا شروع ہی سے یہ پانچوں میری تسبیحات ہیں۔

اگر آپ میں جمالیاتی حس موجود ہے، تو پھر اس اندازِ تعریف سے آگے نہیں نکل سکیں گے لا الہ الا ھو رب العرش الکریم کیا انداز ہے اللہ کا! اللہ خالق کل شی و ھو الواحد القہار، اللہ خالق کل شی و ھو علی کل شی وکیل یہ وہ انداز و ادا ہیں کہ آپ اللہ کی بزرگی و عظمت کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے انداز میں اپنی حمد و ثنا کے لیے فرماتے ہیں، تو وہ بڑی تابناک اور حیرت انگیز ہے۔ کیسا خوبصورت اندازِ تکلم ہے! زبان و بیان کے حوالے سے کیا جمالیاتی عنصر ہے لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین اس میں کس قدر خوبصورتی بیان ہوئی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ تسبیح ضروریات کے تحت بھی کی جاتی ہیں مگر ذوقِ تسبیح کچھ اور ہے۔ ایک دفعہ میں تسبیح پڑھ رہا تھا کہ مجھے سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی انگوٹھی پر لکھا ہوا جملہ پڑھنے کو ملا نعم القادر اللہ، مجھے وہ اتنا دیدہ زیب لگا کہ اس دن سے میری تسبیح ہے۔ مجھے تو ہر وہ انداز دلکش لگتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو نعم القادر اللہ کا مطلب ہے سب سے بہترین طاقتوں میں سے بہترین طاقت رکھنے والا اللہ ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے وظائف دیکھتے ہوئے ان کا ایک جملہ بڑی فصاحت سے نظر آیا یا مولائے یا قادر یا مولائے یا غافر یہ جوں جوں اور جس جس انداز میں مجھے علم ہوتا گیا، انہیں میں اپنی تسبیحات میں شامل کرتا گیا۔

جب صبح ہوتی ہے اور میں یہ تسبیحات شروع کرتا ہوں، تو میں ان جملوں کی دلکشی سے مخمور ہو جاتا ہوں سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون و سلام علی المرسلین

والحمد لله رب العلمین مجھ پر نشہ چڑھ جاتا ہے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں۔ یہ تسبیحات میری اللہ سے شدید محبت کی میراث ہیں۔ اب بھی مجھے چند ایک تسبیحات اتنی پرکشش اور خوبصورت لگتی ہیں، لیکن میں ان کو اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ شاید میں انہیں اس طرح انجوائے نہ کرسکوں۔ جیسے جیسے میری لوگوں سے مصروفیات وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں، میرے لیے روٹین سے گذرنا مشکل ہوگیا ہے۔ پہلے ہزار کے اوپر تسبیحات کرتا تھا۔ اس سے نیچے مجھے تشفی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب میں تین سو کے قریب تسبیح کرتا ہوں۔ ان تسبیحات میں سورۃ اخلاص ابھی بھی ایک ہزار مرتبہ سے کم نہیں کی۔ میرا ایک گھنٹہ صرف ہوتا یہ بلکہ کبھی دو ہزار مرتبہ پڑھتا ہوں، کبھی تین ہزار تک پہنچ جاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قول برحق ہے کہ یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ جب آپ سورۃ اخلاص پڑھنا شروع کردیتے ہیں، تو اس کے پڑھنے کی عادت مضبوط اور راسخ ہو جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے، لوگ اللہ کی یاد اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور غرضوں کے لیے تسبیح ضائع کردیتے ہیں۔ یہ سچی بات ہے کہ تسبیح کے بعد کوئی غرض نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر اور خوبصورت چیز عطا کردیتا ہے۔

میں ڈیڑھ سو کے قریب دعائیں پڑھتا ہوں۔ دعا تو میں نے اپنے ایک نالائق شاگرد سے سیکھی۔ وہ روز مجھ پر کوئی طنز آ کر کرتا تھا۔ ایک دن تشریف لایا، تو دعاؤں کی کتاب پکڑی ہوئی تھی۔ زبان میں لکنت بھی تھی۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا کہ پروفیسر صاحب! یہ کیا آپ تسبیح اور دم درود کرتے رہتے ہیں؟ یہ تو فضول باتیں ہیں۔ آپ کو نہیں علم کہ دعا کے وقت کوئی تسبیح کام نہیں آتی۔ یہ دیکھو! رسولؐ کی کتنی اچھی دعائیں ہیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے بھی ایک بار یہ کتاب پڑھ لینی چاہیے۔ میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کیا اور اس کی کہی بات پر غور کیا۔ مجھے احادیث میں وہ دعائیں نظر آئیں۔ اللہ نے اپنا خاص کرم فرمایا۔ محمد بن شیخ عبدالرحمان الجذری کی کتاب احادیث سے استفادہ کیا، جس میں صحاح ستہ کی کتابوں سے دعائیں اخذ کر کے ترتیب دی گئی ہیں۔

ایک عادت شروع سے یہ رہی ہے کہ میں نے زندگی میں غیر مصدقہ کوئی وظیفہ کیا نہ کوئی دعا پڑھی ہے۔ میرے اندر کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ پیروں، فقیروں کے وظیفے ایک وقت میں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جب تک تمہارا ڈائریکٹ کب موجود ہے ان کا فائدہ ہوتا رہتا ہے۔ آپ کوئی رسالہ دیکھ کر کسی کو وظیفہ بتا دیں، اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا بلکہ الٹا تم پر مشقت پڑے

گی۔

احتساب کی بنیادی صفت تو یہ ہے کہ خود اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اب صبح جب میں تسبیح شروع کرتا ہوں، تو وہ تقریباً ڈیڑھ سو دعائیں ہیں، نبی کریم کی جو میں پڑھ کر آگے چلتا ہوں۔ ''فوا والفوائد'' میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جب بھی اپنے شاگرد کے ہاں تشریف لاتے، اس کو کچھ تسبیحات عطا کرتے اور ان کے فوائد سے آگاہ کیا کرتے۔ اس میں کسی قسم کی پردہ پوشی، حسد یا خلوت کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے بندوں کے ساتھ کوئی راز نہیں ہے۔ وہ احمق پیر ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی باتیں دوسروں تک نہ پہنچیں۔ راز چھپانا کس بات کا؟ رازداری کس لیے ہے؟ رازداری تو سب سے بڑی قرآن میں ہونی چاہیے تھی۔ قرآن ہی تسبیحات کا مرکز ہے۔ قرآن کا پیغام ہی یہی ہے **سبح اسم ربک الاعلی** بڑے اور عظیم رب کی تسبیح کرو **فسبحان اللہ تمشون و حین تسبحون** اللہ ہی کی تسبیح کرو صبح اور شام **وعشی وانا تظهرون** عشا کو کرو اور ظہر کے وقت تسبیح کرو۔ کیا انداز ہے! **اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشا و تعز من تشا و تزل من تشاء**

میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ اگر مجھے اتنی ہی رازداری قائم کرنی ہے تو مجھے لوگوں سے فرار اختیار کر لینی چاہیے۔ پھر تو مجذوبیت اور تنہائی بڑی شے ہے۔ میں لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میں اٹھا ہی اس لیے ہوں کہ خدا کی یاد کا ان کو احساس دلاؤں اور ان کو اوصاف عطا کروں۔ میں ان کا اللہ کی طرف کوئی رخ متعین کر سکوں۔ میں کیوں چھپا کے رکھوں؟ البتہ اتنا سا راز ضرور ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ الحمدللہ! جو لوگ میرے ہاں چاہے دین کے لیے آتے ہیں یا دنیا کے لیے، انہوں نے اللہ کے ساتھ بہت وفا کی ہے۔ وہ لوگ جنہیں میں نے بیس سال پہلے تسبیح دی تھی، ابھی بھی وہ ان تسبیحات پر عمل پیرا ہیں اور بڑے ثابت قدم ہیں کیونکہ وہ ان سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

دوسری بڑی سنجیدہ بات یہ ہے کہ لوگ صوفیاء، اولیاء اور بزرگوں کی کرامات ضرور بتاتے ہیں۔ اگر آپ اس قسم کی کتاب نوٹ کرنا شروع کر دیں، تو میرا خیال ہے بے شمار کرامات مل جائیں گی۔ اس دوران میرے ساتھ لوگوں کی وابستگی رہی۔ یہ میرا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔ یہ

صرف ان کا اخلاص اور اللہ کی تسبیحات کا کریڈٹ ہے جو انہیں پہنچا ہے۔ اس کا صوفی ازم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خواجہ مہر علی کے پاس ایک شخص آیا کہ تم اللہ کو بہت یاد کرتے ہو۔ کیا اللہ بھی تمہیں یاد کرتا ہے؟ فاذکرونی اذکرکم کی کیا تفسیر ہے؟ چار دن کی تسبیح کے بعد ہم لوگ مر جاتے ہیں۔ اللہ زندہ اور قائم و دائم ہے۔ قیامت تک کے لوگ اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دیتے رہیں گے۔ تسبیحات وہاں جا کر کرتے ہیں۔ تلاوت قرآن ہوتی ہے اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے اللہ انہیں موت کے بعد یاد کر رہا ہے۔ یہ اللہ کی یاد ہی ہے۔ کون سا ایسا صوفی نہیں ہے آپ جس کی قبر پر جائیں اور چوبیس گھنٹے اس کے مزار پر ذکر و تسبیح نہ ہوتی ہو؟ قرآن شریف پڑھ کر ثواب نہ بخشا جا رہا ہو؟ اس سے بڑھ کر کیا ثواب دارین ہوتا ہے۔ یہ کسی مرے ہوئے کے لیے کتنا ثواب کا کام ہے۔

اس میں میتھوڈسٹ بڑا بخیل ہے۔ اگر وہ پیسہ روٹی پر نہیں خرچ کرنا چاہتا، تو نہ خرچ کرے، لیکن خیرات کا مخالف تو نہ بنے۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ انتہا درجے میں چلے گئے ہیں۔ میں نے ان میں کسی کو بھی کشادہ دل نہیں دیکھا، جو صدقات و خیرات کا خیر خواہ ہو۔ اعتراض کریں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فائدہ مردے کا تم نے قرآن و حدیث کی رو سے دیکھنا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس اسے ثواب پہنچنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ مگر جب میں صحیح مسلم و صحیح بخاری کا مطالعہ کرتا ہوں، تو مجھے ایسی حدیث کی صداقت نظر آ جاتی ہے۔

باب الصدقات کا آغاز ہی حضرت سعد کی اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ان کی والدہ رحلت فرما گئیں اور وہ مدینہ سے باہر تھے۔ لوگوں نے اسے دفنا دیا۔ واپس آئے۔ سیدھے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یا رسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئیں اور میں مدینے سے باہر تھا۔ اب میں اس کے لیے کوئی خیرات و صدقہ کروں، تو کیا اسے ثواب پہنچے گا؟ فرمایا نعم نعم۔ دوسرا کوئی لفظ اس حدیث میں نظر نہیں آتا۔ فرمایا، اے نبیؐ! گواہ رہیے، میں نے اپنا فلاں باغ اپنی ماں کے لیے صدقہ فرما دیا۔ یہ بخاری کی متواتر حدیث ہے۔ چونکہ یہ آپ کی مرضی کے خلاف ہے، آپ کہیں کہ فلاں راوی کمزور ہے، اس کی سند مستند نہیں ہے۔ ایک طرف آپ بخاری کو صحیح الصحیین کہتے ہیں کہ اس کے بعد حدیث کی کوئی صحیح کتاب نہیں ہے، لیکن جب آپ کی مرضی کے خلاف

کوئی بات ہو، اس وقت جاہلانہ رسم و رویے کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی حدیث پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ذرا غور کریں کہ معیار کس نے بنائے ہیں؟ اگر معیار روایت کے محمد بن اسماعیل نے بنائے ہیں اور وہ تمام احادیث کو پرکھ رہے ہیں، تو آج کے زمانے میں ان کی احادیث میں مداخلت کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں۔ آپ اس زمانے میں کہتے کہ یہ راوی صحیح نہیں ہے اور وہ راوی کذب بیانی سے کام لیتا ہے۔ آپ کو تو کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ آپ کو اسماء الرجال کا علم ہی نہیں ہے جبکہ چیکنگ سسٹم وہی ہے، جو بخاری شریف کا ہے، تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کمزور ہے؟

ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری ماں نے حج کی نیت کی تھی اور اب اگر میں اس کے لیے حج کروں، تو اس کو اس کا ثواب پہنچے گا؟ کتنا خوبصورت جواب حضور عالی مرتبت نے دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر تیرے باپ کا قرض ہوتا اور وہ مر جاتا اور تو ادا کرتا، تو اس کا قرض ادا ہوتا کہ نہ ہوتا؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! بالکل ہو جاتا۔ فرمایا، تیری ماں کی نیت تجھ پر قرض ہے۔ اگر تو حج کرے گا، تو اس کو ثواب ضرور پہنچے گا۔ کتنا فصیح و بلیغ جواب ہے؟ آپ حد درجہ بخیل ہیں۔ اپنی خفت، تنگ نظری اور خجالت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذمے کیوں لگاتے ہیں؟ یہ ہے سب سے بڑا مسئلہ۔

علمِ باطن، خصوصی پراسس

اس کے لیے ایسی کوئی سپیشلسٹی اور پیچیدگی نہیں ہے۔ میرے بعض شاگرد لوگوں میں بھی یہی جذبہ تھا کہ وہ سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہت سارے مسائل میں ان کی توجیہات بڑی واضح تھیں۔ وہ سیکھنا اور جاننا چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ کچھ نہ کچھ سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہتا۔ تمام علم سوال سے ہے۔ ان میں باقی لوگوں کی نسبت کافی Clarity ہے اور وہ بڑے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں کہ خالی ڈگری حاصل ہو جائے بلکہ وہ اچھا سوچنے والے تھے۔ ان میں سے بعض امریکہ، فرانس وغیرہ میں ہیں۔ میرے ایما پر Nature of God and Reality پر لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ تسبیحات اور توکل کے سبب ہی بڑھتے رہے

ہیں۔ یہ بڑی دشواریوں اور مشکلوں سے گذرے ہیں۔ مگر خوش لوگ ہیں۔

عمومی طور پر ذہن کو تین خصائص میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جبلی، جو جبلت میں ہیں۔ وہ بقا کے لیے اعلیٰ ترین ذہانت پیدا کرتی ہیں۔ پھر انسان کا علم ہے جو اسے عالمانہ سربلندی دیتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی مکمل کمٹمنٹ اور یکسوئی ہے، جو اسے وجدان دیتی ہے مگر یہ جو ذہانت، دانش اور وجدان کا علم ہے، یہ اگر خدا کے ریفرنس میں چلا جائے، تو یہ الہامی کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ اس کا کسی تخصیص سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بڑی قدرتی سی علمی تحریک ہے۔ اس میں کوئی بندہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔

ہاں ایک رہنمائی ضرور کر سکتا ہے۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی کا قول مبارک ہے کہ کبھی ہم تمہیں کچھ نہیں دیتے۔ ہم تمہیں لا کر اس چوراہے پر کھڑا کر دیتے ہیں اور باقی رستے کاٹ کر تمہیں وہ راستہ بتا دیتے ہیں، جو خدا کی طرف جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی آدمی کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہاں جب آدمی اللہ کی بندگی میں جاتا ہے۔ اپنی عادات، حرکات اور اپنے خیالات سے صحیح ہوتا ہے، تو ایک فطری سی بات ہے کہ اگر کوئی اللہ ہے، تو پھر اسے وہ سیراب کرتا ہے۔ اس کی خالی جگہ پر کرتا ہے۔ اگر خالی جگہ اللہ سے پر ہو گئی تو ظاہر ہے پھر وہ آدمی محترم تو ہو ہی جائے گا۔

یہ حقیقی بات ہے کہ ساری دنیا ایک طرف ہو اور اللہ کا ایک معمولی بندہ ایک طرف ہو جیسے اس نے موسیٰؑ سے کہا کہ 300 برس کا مستحکم معاشرہ پوری دنیا کے لیے Maniac ہے۔ اسے جا کر پڑھا۔ موسیٰ نے کہا، کیسے جاؤں، میں نے بندہ مارا ہوا ہے۔ ڈر رہا ہوں۔ اللہ نے کہا لا تخف۔ ڈرتے کیوں ہو، میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ پھر دنیا اور تاریخ نے دیکھا کہ اس شخص کی وجہ سے فراعنہ مصر کا تمام جاہ و جلال نیل میں ڈوب گیا تو خدا کو تالائٹ لینا بڑا مشکل ہے۔

ہمارے خدا کے بارے میں نظریات بڑے محدود ہیں۔ ایک تو ہم خدا کو ایک جذباتی سا وجود سمجھتے ہیں، جو فتوے پر سارے گناہ ثواب کے فیصلے دے دیتا ہے۔ وہ ایسی تمام باتوں سے ماورا ہے۔ اس کی ذات گرامی بڑی عظمت والی ہے۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند و بالا ہے۔ اگر میں آپ کو سائنٹیفک تجربے کی ایک جھلک دے دوں، تو آپ خوف سے کانپیں گے کہ خدا تک پہنچنا ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ یہ جو ملین، بلین آف گلیکسیز کا سسٹم ایک دوسرے میں بنے ہوئے سٹائل میں

رکھا ہوا ہے۔ جو نت نئے قوانین اور آفاق پیدا کر رہا ہو۔ جو کہتا ہے کہ ہر لمحہ اگر ساری کائنات کے درخت قلم بن جائیں، تو بھی میری باتیں لکھنا ممکن نہیں۔ ہم اس خدا کو بڑے محدود زاویے سے دیکھ کر فیصلہ دے دیتے ہیں۔

انسان کو تفاخر اللہ نے کیا دیا ہے کہ ہر انسان اسے اپنا خدا کہتا ہے۔ وہ کسی کا بھی نہیں۔ وہ صمدیت اور بے نیازی میں لم یلد و لم یولد و لم یکن له کفوا احد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے تم میں سے کسی کی ضرورت ہے نہ کسی کا بگاڑ مجھے کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے، تم عبادات کر کے مجھے خوش کرتے ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو پروویجرز ہیں۔ یہ تمہارے اپنے لیے ہیں۔ اچھے کام کرو گے، تمہیں فائدہ پہنچے گا۔ برے کرو گے، تمہیں نقصان پہنچے گا۔ مجھے تمہارے سوائے ایک لمحہ اخلاص کے، جس میں ساری دنیا سے خالی ہو کے تم میری طرف چہرہ کرتے ہو، اور کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ نہ میں گوشت کی پروا کرتا ہوں نہ ہڈیوں کی کرتا ہوں۔ میں تو اس جہاں میں صرف وہ لوگ دیکھ رہا ہوں، جن کے دلوں میں ذرا برابر اخلاص میرے لیے شامل ہے۔

شیطان نے کہا، اے میرے سرکار! ٹھیک ہے، میں راندۂ درگاہ ہوں۔ میں ذلت سے آشنا ہوا۔ مگر تو نے جن لوگوں کی وجہ سے مجھے ذلت بخشی ہے، میں تجھے دکھاؤں گا، یہ کتنے کمتر لوگ ہیں اور تیرا اندازہ غلط ہے۔ میں انہیں اوپر سے، نیچے سے، دائیں اور بائیں سے آؤں گا۔ میں انہیں تھوڑا سا ٹچ کروں گا، یہ تیرے رستے سے بھٹکتے ہوئے کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔ خدا نے کہا، تو ایسا کرے گا، تو جو تیرا اور تیرے ساتھیوں کا حصہ لکھا ہوا ہے، اس سے جہنم کو بھر دوں گا۔ **الا عباد الله المخلصین** سوائے میرے ان بندوں کے، جو میرے لیے ذرا برابر اخلاص رکھتے ہیں، ان کا تو کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔

علمِ نجوم، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی

علم نجوم، علم الاعداد، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی وغیرہ یہ تمام علوم اس علم اور اس شناخت کے برابر نہیں آتے، جو خدا بندے کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ آپ کو حیرت کی بات بتا رہا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنی حد تک کوئی حیران کن واقعہ نہیں دیکھا بلکہ میں حیران ہو کے سوچتا ہوں کہ اس دنیا میں جہاں بھی میں گیا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے پاس حیران کن علم ہے۔ حالانکہ میں

سمجھتا ہوں کہ میرا علم بھی حیران کن نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کے بارے میں بغیر دیکھے کہوں (سائیڈ پر بیٹھے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہ اداس طبیعت کے بندے ہیں۔ بہت حساس اور ان کی ذات کی پیچیدگیاں جڑی ہوئی ہیں، تو لوگوں کو یہ حیرت کی بات لگتی ہے مگر میرے لیے یہ ایک علم کا پہلو ہے، جس میں کوئی حیرت انگیز پہلو نہیں۔ کسی بندے کو میں نے انسان کی اندرونی فطرت پر اتنی مکمل شہادت دیتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں سمجھتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر کی نوازش اور کرم سے میں جس منہج اور جن خطوط پر سوچ رہا تھا، یہ سب اس کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔

میں اپنے علوم کو پرکھنے کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا ایک قول مبارک دہراتا ہوں کہ ہم دھوکہ نہیں دیتے، مگر دھوکے کی ہر قسم جانتے ہیں۔ یہ جو ہمارے اندر حیرت کا عنصر یا انکشافات کو قبول کرنے کی حسرت ہے، اس کو چیک کرنے کے لیے میں نے تمام پراسرار علوم کا مطالعہ کیا۔ اس میں حصول سحر بھی ہے، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی وغیرہ تمام علوم کا اکیڈیمک مطالعہ شامل ہے۔ حتیٰ کہ لاماز کے جو Lavitational processes ہیں، ان کی میں نے بڑی تحقیقات کیں اور جتنے بھی یوگا وغیرہ کے حیرت انگیز واقعات ہیں، ان کا سائنسی طریقے سے جائزہ کیا۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی بندہ، جو کراٹے کا ماہر ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک ہاتھ سے دس اینٹیں توڑ لیتا ہے۔ واقعی توڑ دیتا ہے۔ آپ کے سامنے توڑے گا، لیکن آپ کو یہ نہیں پتہ ہوگا کہ یہ اینٹیں کون سی اور پراسس کیا ہیں۔ اصول وہی سائنسی ہے کہ پہلی ضرب دوسری تک پہنچتی ہے۔ دوسری تیسری تک اور بھربھری میٹریل کی اینٹیں ہوتی ہیں۔ اس (سیمنٹ کی ایک اینٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو کسی کراٹے کے ماہر کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس پر جان بھی توڑ دے، وہ اس سے نہیں ٹوٹے گی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر علم کے پیچھے اس کی ایک خصوصی عملیت ہے جس کی وہ بنیاد ہوتا ہے اور بہت سارے لوگوں کے تجربے کے پیچھے وہی سائنسی مشاہدہ ہے۔ ڈیوڈ کاپر فیلڈ دنیا کا سب سے بڑا شعبدہ باز ہے مگر شعبدہ باز ہوتا ہی فریب کار ہے اور وہ آپ کو فریب دے رہا ہوتا ہے۔ سوائے وہ آلات، جو اس کی بنیاد اور اس کے باطن سے نکلتے ہیں، وہ سچ ہیں اور یہ جھوٹ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل کو خدا کیا چھینتا اور کیا دیتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر میں اپنی ذہانت اور اپروچ کو

بحال رکھتا ہوں، تو یہ وہ چیز ہے جو مجھ سے چھینی نہیں جا سکتی۔ ایک جگہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب بڑی تندی اور تیزی سے مجھے پیچھے سے گھور رہے تھے۔ کیا ہوا کہ جی میں آپ کا علم سلب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی ہنسی آئی میں نے کہا، گدھے! کیا میرے ساتھ وہ سال بھی سلب کرے گا، جو میں نے تحصیل علم میں رات دن ایک کیے ہوئے ہیں؟ تیری استعداد ہوئی تو تو ایسا کر سکے گا۔

اس طرح کے اور مجاہدات کے ہمارے ہاں جتنے بھی علماء ہیں، ان میں اور مجاہدے میں یہ فریب آتا ہے۔ لوگ مجاہدات کی زیادہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ پانی میں بارہ سال کھڑے رہے۔ میں ایک قدرتی سوال کروں گا کہ کیوں کھڑے رہے؟ بزرگان دین نے چلے اس لیے نہیں کیے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک آدمی کہتا ہے مجھے بڑی بھوک لگتی ہے۔ جب تک یہ بھوک نہیں مٹے گی، میں خدا کے رستے پر چل نہیں سکتا۔ چنانچہ میں نے فاقہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میرا پیٹ پکارتا رہا، کھانے دو۔ میں نے کہا نہیں دوں گا۔ مجھے اللہ سے پیار ہے۔ میں چونکہ اللہ کی جانب بڑھنا چاہتا ہوں، اس لیے میں تجھے نہیں بڑھنے دوں گا۔

بسا اوقات کسی فقیر کے دل میں ایک وہم سا پڑ جاتا ہے۔ ادھر اللہ کی چاہت ہے اور ادھر وہ خامی ہے، جو اس چاہت کی راہ میں حائل ہے۔ ایک آدمی بہت سیکس محسوس کرتا ہے وہ کہتا ہے، یار جب میں محلے سوسائٹی میں ہوتا ہوں، تو میں بہت سیکس محسوس کرتا ہوں۔ میں تو سفر کرتا ہوں، کہیں قیام ہوگا، نہ کہیں محبت ہوگی نہ نظر بازی ہوگی۔ مسافروں کی طرح گذر چلو اور دیکھتے جاؤ۔ وہ بارہ بارہ، چودہ چودہ برس مسافرت اختیار کر لیتا ہے۔

وہ انفرادی طریق کار ہے۔ اپنے تو ساٹھ سال ہو گئے ہیں، سوسائٹی سے ایک قدم باہر نہیں نکل سکا، جو کچھ بھی جانچا پرکھا، اسی سوسائٹی ہی میں دیکھا۔ اپنے ایک ایک تعلق اور اپنے زندگی کے ایک ایک مقصد کو اسی سوسائٹی میں جانچا ہے۔ یہ الٹ پھیر، جو زندگی کے کیریئر میں میرے ساتھ گذرا ہے، وہ عوام کے اندر ہی ہوا ہے۔ جہاں جہاں میری آزمائش کے عناصر ہیں، وہاں وہاں میں پرکھا گیا ہوں۔ بہت سی ایسی جگہیں تھیں، جہاں میں ناکام ہوتا رہا ہوں اور بہت سی ایسی بھی تھیں، جہاں میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب بھی بڑی خامیاں باقی ہیں۔

اوراد، وظائف چلہ کشی

جب کوئی بڑی تعلیمی تحریک ان پڑھوں اور کم علموں کے ہاتھ آتی ہے، تو اس میں کچھ پیشہ ورانہ رویے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تعویذ دھاگے پیشہ ورانہ طور طریقے ہیں۔ اسلام میں صرف بچوں کو تعویذ دینے کا حوالہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بچوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ بچے عقلی اور عملی طور پر نابالغ اور وہ تسبیح الٰہی کا شعور نہیں رکھتے۔ جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو ابن عباس انہیں اعوذ بکلماة الله تامة من شر ما خلق کا تعویذ دیتے تھے۔ تعویذ سوائے بچوں کے ہمارے پرانے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ جو تعویذ دھاگے برصغیر میں نکلے ہیں، ان کا وجود اہل تصوف کے ہاں پہلے نہیں تھا۔ برصغیر میں سحر اور عملیات بہت تھے۔ اقوال کی ایک فہرست ضرور موجود ہے، جس کی وجہ سے خصوصی عملیات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے حاضرات جنات کے لیے ہر چیز کو ایک پیٹرن دیا گیا ہے جس کے اندر آپ اس چیز کی پیروی کرتے ہیں اور اسے قابو کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عملیات توجہ کے ہیں۔ آپ ایک خاص پہلو پر ارتکاز کرتے ہیں اور آپ کا سارا وجود ایک نکتے پر سمٹتا ہے۔

یہ جتنے بھی جنات کے عمل ہیں، یہ ہمارے اندر کے عمل ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ پراسیس کے دوران پہلے ایک سانپ آئے گا۔ پھر جناب ایک چیل آئے گی۔ اس سے اگلے دن ایک جن آئے گا، جو حصار توڑتا ہوا نکل جائے گا۔ یہ پہلے سے مرتب شدہ کچھ اعمال ہیں اور ذہن اس کے لیے پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ جب آدمی ارتکاز میں جاتا ہے، تو وہ ایسی چیزیں خود تخلیق کرنی شروع کر دیتا ہے۔ چالیس دن کا چلہ ہے، تو دس دن کے بعد میں سوچتا ہوں کہ سانپ میرے حصار سے نکلے گا۔ یہ جو حصار ہے، یہ انٹلکچوئل حصار ہے۔ اگر مجھے حصار کی لائن پر اعتماد ہے تو سانپ اندر نہیں گھسے گا۔ اگر دو یقین اکٹھے پیدا ہوں، ایک مثبت اور ایک منفی، تو مثبت میں استاد یہ کہہ رہا ہے کہ اس حصار کے اندر سانپ، جن یا بھوت وغیرہ تب تک نہیں آئے گا، جب تک تو عمل کر رہا ہے۔ اگر تھوڑا سا غور کریں، تو آپ کو اس تمام حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ استاد یہ جو لائن کھینچ رہا ہے یا وہ اپنے لیے حصار کھینچ رہا ہے وہ اس کی Positive intellect ہے کہ اگر میں اس دائرے میں رہا، تو میں محفوظ ہوں اور باہر میرے لیے آسیب ہیں۔ اگر اس کا عقیدہ کمزور ہو گیا، تو

جونہی وہ آدمی حصار سے آگے گذرے گا، پاگل ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنے ہی عقیدے میں اعتماد کھو بیٹھا ہے اور اپنے تمام وجود کی نفی کر گیا، اس چیز کے لیے جو اس نے خود ہی تخلیق کی۔

یہ سارے کے سارے کام فضول ہیں۔ اتنی ساری زندگی ہو گئی ہے بطور کریڈٹ کے نہیں بتا رہا کہ اتوار کو جو لوگ آتے ہیں، وہ مجھے اپنے بارے میں ایسی کرامات سناتے ہیں جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ میرے خیال میں خداوند کریم کی طرف رجوع کرنے ہی میں نجات ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں مجھے کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ نہ مجھے امریکہ نظر آتا ہے نہ برطانیہ۔ مجھے صرف ایک بات کا پتہ ہے کہ جس نے اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع کیا، اس کی ساری زندگی معجزاتی ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے اور ان تمام کے ساتھ بھی، جو حقیقی طور پر خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعض لوگ خدا پر شرطیں رکھتے ہیں۔ چار دن کی تسبیح کے بعد پلٹ کے آئیں گے، کہیں گے، وہ تو نہیں ہوا۔ بھئی نہیں ہوا، تو میں کرنے والا تو نہیں ہوں۔ پڑھتے رہو۔ کچھ لوگ آئیں گے کہ جی پندرہ دن پڑھتا رہا، نہیں ہوا، میں نے چھوڑ دیا۔ اس قسم کے احمقوں کا، جو پہلے سے توقعات لے کر آ جاتے ہیں کہ معجزہ رونما نہیں ہوا میرے پاس علاج ہے نہ اللہ کے پاس وقت ہے۔ معجزے ہوتے ہیں، لیکن معجزے ہونے کی ہر وقت توقع رکھنا غلط ہے۔ میں سب لوگوں کو کہتا ہوں کہ جہاں تک امن و سکون کا تعلق ہے وہ تمہیں اللہ ضرور دے گا۔ جہاں تک معاملات کی درستگی ہے، یہ بھینچی ہوئی دنیا ہے۔ ذہنی کائنات وسیع ہے۔ جب اس کا خلل دور ہو گا، تو امن آ جائے گا مگر دنیاوی معاملات بھینچے ہوئے معاملات ہیں۔ یہ ایک ایک پل آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ اس میں تبدیلی اسباب کے توسط سے ہے۔ یہ ایک کھلی کائنات ہے جس میں تغیر اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ اسباب بنیں گے، تو تغیر آئے گا اس لیے باہر ذرا حرکت آہستہ ہوتی ہے۔ ہمیں بھی آپ دیکھیں دس پندرہ ارب سال کی زندگی ساٹھ سال میں گذاری ہے۔ پچھلا ریکارڈ تین ارب سال کی زندگی کا ہے۔ اب اسے ہم ساٹھ سالوں میں گذارتے ہیں۔ تصور کریں کہ کس قدر دباؤ کا شکار زندگی ہے۔ اس میں تبدیلی آسانی سے نہیں آتی۔ آتی ہے، لیکن آہستہ اور بتدریج لوگ مصائب سے نکلتے ہیں، لیکن جو توقعات ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں۔

مراقبہ کا مقام

مراقبہ (Meditation) تصوف کے پورے تصور میں کوئی وجود نہیں رکھتا۔ مراقبہ سوچ کے عمل کے ساتھ ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اندھوں اور بہروں کی طرح ایک جگہ بیٹھ جائیں اور ایک خیال پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں، جب خیال کا ارتکاز ہوتا ہے تو آپ کا Inner-self خود اپنے آپ کو محدود کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس الہیات میں بے حد وسیع مطالعہ سے ذہن کو اس اعتدال کی کیفیت پر لانا ہوتا ہے کہ جس سے اسے از خود کسی منفی خیال کی اکساہٹ نہ ہو۔ قرآن میں اللہ تبارک و تعالیٰ کہتا ہے **فالھمہا فجورھا و تقوھا** ہم نے انسان کے ذہن پر فسق و فجور اور تقویٰ الہام کیے۔

تو سب سے بڑا مراقبہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ وہ انسٹرومنٹ پیدا کریں، جن سے فسق و فجور کا خاتمہ ہو اور الہام باقی رہ جائے۔ پھر فسق و فجور کو قطع کرتے ہوئے بھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کہیں تقویٰ کے فریب میں نہ آ جائیں۔ نیکیوں کی الجھنوں میں نہ پڑیں۔ یہ مکمل اعتدال کی جدوجہد ہے۔ مراقبہ شاید اس میں آپ کی جز وقتی کچھ مدد کر جائے، لیکن بالآخر یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ آخر میں اس کا فائدہ نہیں، نقصان ہے۔ بلکہ جو لوگ بھی مراقبے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ فریب نظر پر جا کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ مراقبے کا کیا مطلب اور مقصد تھا، جس کی وہ جستجو کرتے رہے ہیں۔ شیخ ہجویر نے بڑے قول فیصل میں مراقبہ کے بارے میں فرمایا کہ تو چلتے پھرتے اللہ ہی کے بارے میں سوچ اور اسی کی تفریق اور تقسیم میں رہے۔

تصور شیخ کی حیثیت

ایک آدمی کہتا ہے کہ پہلے تصور شیخ ہے۔ اس کے بعد تصور رسول اللہ ہے۔ اس کے بعد تصور اللہ ہے۔ میرے خیال میں ان سلسلے والوں نے جان بوجھ کر لفظوں کو کنفیوژ کیا ہے۔ Misnomer پیدا کیے اور فراڈ کیے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تصور شیخ سے قطعاً یہ مراد نہیں تھا کہ آپ شیخ کی تصویر لے کر اس پر بوجھ ڈالتے پھریں یا اس کو نظروں میں لا کر اس کے چکروں میں پڑ جائیں۔

گویا تصور شیخ نہ ہوا، کسی نا دیدہ محبوب کا تصور ہو گیا۔ یہ ایسے ہی ہے، جس طرح بندہ کسی عورت کے ساتھ جسمانی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس میں ارتکاز کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک تصور شیخ سے مراد ممکن ہے، ہم آہنگی شیخ ہو۔ جیسے کسی کو اپنا شیخ بہت پسند ہے تو وہ اپنی عادات و خصائل میں اس کے قریب تر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے عادات و فضائل کی ہم آہنگی اس کے لباس اور اس کے انداز کی ہم آہنگی بھی ہو جائے۔ ہاتھ اٹھائیں گے، تو اس طرح جیسے شیخ اٹھاتا ہے، انداز ہیں، تو ویسے ہی، جیسے ان کے شیخ نے اپنا رکھے ہیں۔ تو کسی اور شخص کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کو ہم تصور شیخ کہتے ہیں۔

ایک طرح فرض کریں، ایک شخص قرآن و حدیث میں ڈوبا ہوا ہے۔ رسول اللہؐ کے انداز میں سوچ رہا ہے۔ ان کو ان کے اسوہ اور عادات و خصائل سے اتنا انس ہو گیا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے، اس کی تمام عادات رسول اللہؐ کی طرح ہو جائیں۔ وہ بہت کوشش کر رہا ہے کہ اپنے انداز، فکر اور سوچ میں پیغمبر کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کر لے۔ اسے ہم فنا فی الرسول کہیں گے۔

اس سے آگے اللہ کی ذات آتی ہے۔ رسولؐ اور اللہ کی ذات میں تفریق آسان نہیں ہوتی۔ رسول وہی کچھ کرتے ہیں، جو اللہ چاہتا ہے۔ وہ قرآن کے حامل ہیں۔ جو فنا فی الرسول ہو گا، وہ بالآخر فنا فی اللہ ضرور ہو جائے گا۔ اللہ کی عادات کو اپنانا فنا فی اللہ، رسول اللہؐ کی عادات و خصائل میں ڈھلنا فنا فی الرسول اور استاد کی عادات کو اپنا فنا فی الشیخ ہے۔ اس سے ہٹ کر ذہن میں تصویریں آپ میں اندرونی طور پر بندگی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ غیر اللہ کے تصور کے حوالے سے ان کے پاس فضول دلائل ہیں۔ وہ پر پیچ رستوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ادھر سے ہوتے ہوئے ہم وہاں پہنچیں گے اور وہاں سے ادھر جا نکلیں گے۔ سوال ہے کہ اگر نہ پہنچو تو؟ تو کیا آپ ایک وقت کی بت پرستی میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔

مراقبہ شیخ جو لوگ کرواتے ہیں، وہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مکمل تسلط چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پیروکاروں میں مکمل سپردگی پیدا کر دیں۔ ایک ایسی ذہنی صورتحال میں ملوث کر سکیں، جس میں ان کے لیے کوئی دوسرا رستہ کھلا نہ رہے۔ یہ اپنے اپنے آرڈر اور ڈسپلن کھڑے کرتے ہیں اور اس چیز سے خوفزدہ ہیں کہ کھلی اور صاف ستھری عقل انہیں کسی دن بھی تبدیل کر دے گی۔ مثال کے طور پر ہری پور میں بہت سے سلسلہ عظیمیہ کے لوگ تھے۔ الحمدللہ انہیں جوں ہی عقل

اور فراست کی روشنی ملی، وہ سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا کوئی ڈر نہیں کہ کل میرا کوئی دوست اٹھ کر کہیں اور چلا جائے اور وہ تبدیل ہو جائے۔ بیشک ہو جائے، اس کو بہتر چیز مل گئی ہے اور وہ تبدیل ہو رہا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

مگر جن لوگوں نے آرڈر، سکول اور آئیڈیاز کے جنگل اگا رکھے ہیں، ان سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذہنوں کو محکوم کرنے کی سازشیں ہوتی ہیں، ان کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خدا کی بندگی میں حائل ہو سکتی ہیں، ان کی طرف راغب نہیں کر سکتیں۔

فورسز بی یانڈ کی تسخیر

تسبیحات کے مقابلے میں وظائف کی دنیا میں چاہے مقصد نیک ہو، اس میں جگہ، وقت، پوسچر وغیرہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے۔ مگر جہاں بھی ارتکاز توجہ کی مشقیں آئیں گی اور انسان اپنے اندر سے تمام شکوک وشبہات اور وساوس نکالنے کی کوشش کرے گا، وہ زیادہ طاقتور ہو کر ان کے سامنے آئیں گے۔ بہت سارے لوگ وظائف میں دیوانے ہو گئے۔ ڈر کے نکلے یا ان کی صحت پر ان کے منفی اثرات پڑے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں، جو اپنے اعصاب کھو بیٹھے۔ کیونکہ ارتکاز توجہ میں باہر سے ایک جھٹکا لگ جائے تو وہ Damage ہو جاتے ہیں۔

تسبیح اور وظائف میں بڑا فرق ہے۔ **فاذکر اللہ قیاماً و قعودا و علی جنوبہم** کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل اللہ کو یاد کرو۔ کوئی پوسچر ہے، رولز نہ کوئی ریگولیشن ہیں۔ ہر حال میں، ہر موسم اور ہر رنگ میں کر سکتے ہو۔ یہ ایک فری اور قلبی یاد بن جاتی ہے۔ جب کہ وظائف کے طور طریقوں میں قید ہو کر لوگ اپنا مقصد کھو بیٹھتے ہیں۔

اسمائے حسنہ کا موضوع

اس دور میں ہم تسبیح کرتے ہیں، درود نہیں پڑھتے۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ آپ جو کام بھی شروع کرتے ہیں، اس کے پیچھے ہلکی ہلکی ارتکاز پیدا ہوتی اور ترویج پاتی ہے اور ہر کلمے کے پیچھے ایک Reactive Negative Reaction ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں سلام پڑھو گے، تو آپ کو آزمانے کے لیے کہ سلام کا کیا فائدہ ہے، اللہ آپ کی بےچینیاں بڑھا دے گا۔ اصولاً کچھ عرصے کے لیے آپ کو پتہ تو چلے کہ سلام کا فائدہ کیا ہوا۔ اگر وہ کلمہ آزمایا ہی نہیں گیا تو کیا فائدہ۔ گاڑی کتنی بھی اچھی ہو، بریکیں تو بار بار لگا کر دیکھنا پڑے گا کہ واقعی جتنے دعوے کیے جا رہے ہیں کیا وہ درست ہیں۔ یہ جو اللہ کہہ رہا ہے کہ سلامتی اس میں ہے آخر کچھ آزمایا جائے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ پہلی بےچینیوں میں میرا اضطراب اس طرح کا تھا۔ اب بھی بےچینی موسم کی طرح آتی ہے اور خزاں اور بہار کی طرح گذر جاتی ہے، لیکن میں نہیں بدلتا۔ جب آپ تسبیحات شروع کرتے ہیں، تو آپ کی بڑھی ہوئی بےچینیاں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب درود پڑھا جاتا ہے، تو ہر منفی کیفیت علیحدہ علیحدہ رجسٹر ہوتی ہے۔

بہت سارے لوگ مرتکز ہو جاتے ہیں۔ اکثر جعلی حکماء اور جعلی پیروں کی وجہ سے تسبیح کو طور طریقوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں قدرت اللہ شہاب جیسے لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں ...... کہ ایک جگہ چن لو، وہاں سجدے کرو، تسبیح کرو۔ مچھلی کے پیٹ میں کون سی مخصوص جگہ تھی کہ حضرت یونس تسبیح کر رہے تھے؟ شجر و حجر میں کون سی جگہ ملتی ہے؟ زمین و آسمان میں تسبیح کے لیے

وقت اور مقام کا تعین کیسے اور کیونکر ممکن ہے؟ اس طرح تو تسبیح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ ہر وقت کی یاد کہاں ممکن ہے۔ وہ پرندے کہ فضاؤں میں پر کھولتے ہیں، تسبیح خداوند بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمومی سرگرمی میں ایسا کرتے ہیں۔ پھر وہ پتھر، جن کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسانوں سے کم سنگ والے ہیں۔ خوف خدا سے کانپتے ہیں اور ان سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ خدا نے کیا شاعرانہ خوبصورت بات کہی ہے کہ جو پتھروں سے پھوٹتا پانی ہے گویا خشیت الٰہی کے آنسو ہیں۔ اگرچہ اللہ شاعر تو نہیں، پھر بھی مجازی شاعری کا انداز ملاحظہ کیجیے۔ تخلیق شعر تو اسی کے بس میں ہے۔

قرآن حکیم میں بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ آپ چلتے پھرتے **فاذکرو الله قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم**، میرا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے، پہلو کے بل لیٹے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ سے حدیث بخاری اور مسلم میں موجود ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے باب جنابت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا رسول اللہؐ اس عالم میں ذکر کیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، وہ ہر حال میں خدا کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

عورتیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ ہم ''مخصوص دنوں'' میں تسبیح کرلیا کریں؟ میں نے کہا، نہ کیا کرو۔ بشرطیکہ تم اگر اللہ کا نام سرے سے لیتی ہی نہیں۔ اگر ان پانچ سات دنوں میں اللہ کا نام نہیں لیتیں، تو نہ کیا کرو، مگر دن میں دس مرتبہ تو تم اللہ کی قسم اٹھا رہی ہوتی ہو۔ جھوٹ بولنے کے لیے اللہ کا نام لے رہی ہوتی ہو، تو اللہ سے بڑھ کر متبرک کیا نام ہو سکتا ہے۔ تسبیح کے لیے اللہ نے کوئی قید نہیں رکھی۔ آپ جس حال میں جہاں کہیں بھی ہوں، تسبیح بیان کیجیے، صبح، دوپہر، شام، چلتے پھرتے، بیٹھے، پہلو کے بل لیٹے...... اور یہ میں آپ کو بتا دوں کہ وہ پیر اور فقیر جو لوگوں پر تسبیح کے رکھ رکھاؤ مسلط کرتے ہیں، وہ دراصل خدا سے دشمنی کر رہے ہوتے ہیں، دوستی نہیں۔

جہاں تک پیچھے دیوار پر لٹکے ان اسمائے حسنہ کا تعلق ہے تو لوگوں میں ایک علم چلتا ہے جسے جفر کبیر کہتے ہیں۔ ایک جفر مارل ہے۔ کچھ لوگ جفر کبیر میں اللہ کے تمام اسما کو لکھتے ہیں۔ وہ لکھنے کے ساتھ دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ لکھتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ یہ کراچی کے ایک صاحب ہیں، جو میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک کام کرتا ہوں، اسمائے الٰہیہ لکھتا ہوں، پھر وہ بہت سے اس قسم کے لکھے ہوئے کاغذ مجھے دے گئے۔ جب کبھی وہ آتے پندرہ بیس کاغذ لے آتے، وہ ان

کا شوق تھا۔ میرا شوق تھا کہ میں ان کو آگے بانٹ دیتا تھا۔ یہ آخری رہ گیا ہے، جو ادھر لگا ہوا ہے۔
ایک صاحب راولپنڈی میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں انہوں نے جفر کبیر میں بہت مرتب اسمائے الٰہیہ لکھے ہیں۔ ان کو یہ مشکل پیش آتی کہ ان کے خیال میں جفر کبیر میں خاص قسم کے فائدے ہیں، جو بعد میں کبھی انہیں ملیں گے۔ ایسا کوئی ان کو فائدہ ہوا نہیں۔

متعین اسمائے حسنہ ہی کیوں

ایک وجہ یہ ہے کہ زمانے کا ایک کی نوٹ (Key note) ہوتا ہے۔ اس زمانے کا کی نوٹ ڈر اور ذہنی انتشار ہے۔ ہسپتال بھرے پڑے ہیں۔ دوائیاں بازاروں میں موجود ہیں، لوگ اچھے نہیں ہیں۔ مزید بیمار ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ تیس برس کے دوران بیماری میں ایک اور پہلو کا اضافہ ہوا ہے اور اس کا تعلق ان کی جسمانی بیماری سے نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس پہلو میں ایک بڑی تیز رفتاری آئی ہے۔ مثلاً میں اب لاہور جاتا ہوں تو کہتا ہوں کہ صبح دس بجے چلیں گے۔ اس طرح ٹائم آگے چلا گیا ہے۔ وہ صبح چار چھ بجے جاگنے والی مخلوق ناپید ہوگئی ہے۔ اس طرح زمانے میں ایک اضافی عنصر تیز رفتار رومانویت ہے۔ پوری زندگی کی جدوجہد میں ایک تیز تر رومانویت آگئی ہے ہر چیز اور ہر اپنچ میں عجلت آگئی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تصوف میں سنجیدگی اور متانت کم ہوگئی ہے۔ اب آپ جدھر بھی تصوف میں جائیں، آپ کو ایک دم لگے گا کہ لوگ جذب و مستی کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ صبر نہیں ہے۔ بے صبری میں انسان مضطرب اور بے چین ہے۔

تصوف میں متانت کیا ہوتی ہے؟ سیدنا عبدالقادر جیلانی جامعہ بغداد میں درس دے رہے تھے۔ چھت سے سانپ ان کی گردن پر آ کے گرا۔ سارے لوگ وہاں سے اٹھ کر بھاگے۔ شیخ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ سانپ گردن سے اترا، پاؤں میں آیا۔ پاؤں سے نیچے چلا گیا۔ جب وہ نیچے اتر گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ شیخ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا، تو سانپ نے پلٹا کھایا اور آواز دی۔ اے عبدالقادر! میں نے مقام تمکنت میں بڑے اولیا کو آزمایا۔ کچھ ظاہراً مطمئن تھے لیکن تیرے سوا کوئی ایسا نہ تھا، جس کا باطن متغیر نہ ہوا ہو۔ شیخ نے جواب میں کہا، اے بدبخت، تو قضا و قدر کے ہاتھوں میں ایک کیڑا ہی تو ہے، تجھ سے کیا ڈرنا۔

ہم شیخ عبدالقادر جیلانی کو اس حوالے سے زیادہ نہیں جانتے۔ ہم ان کی کرامات کے

توسط سے انہیں جانتے ہیں۔ مگر وہ علم میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ آج کے دنوں میں اس کے باوجود کہ میں مذہب اور معلم کے اعتبار سے بہترین علم کا حامل ہوں، ان کے مقام متانت کو دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو کہیں کا نہیں پاتا۔ ہم اس بحران سے گذرے ہی نہیں ہیں۔ ہم بقا کے شدید سٹیٹس سے نہیں گذرتے۔ اتنے اطمینان سے آگے نہیں بڑھتے۔ تصوف ایک ذہنی حالت سے دوسری ذہنی حالت کو جاننے کو کہتے ہیں۔ ہماری ذہنی حالت موجودہ دور میں اختیار، دولت اور حیثیت سے آگے نہیں نکل رہی۔ خدا تک کون پہنچے گا۔ خدا تک جائیں گے تب ہی سارے کے سارے یہ نچلے پیٹرن ختم ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں تسبیحات میں خاص طور پر خدا کے وہ نام شامل کرتا ہوں، جیسے سلام اور مومن ہیں۔ اس میں سلام واحد اسم ہے جو مکمل ہیجان کو توڑتا ہے۔ ذہن میں بے چینی آگ کی طرح ہے۔ جیسے باہر آگ لگی ہوئی ہو، اسی طرح آپ کے ذہن میں بے چینی بھڑک رہی ہے۔ حتیٰ کہ جب نارِ نمرود کے شعلے بلند ہو رہے تھے، تو اللہ نے آواز دی کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔ اپنی فطرت چھوڑ دے، تو اس میں بھی اسم سلام ہے۔ اسم سلام سے بندے کی فطرت بے چینی پر اثر پڑتا ہے اور وہ اس کی فطرت کو تبدیل کر دیتا ہے۔ خدا کے سوا کوئی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

حدیث مبارک ہے کہ اگر کوئی یہ کہے، احد سونے میں بدل گیا ہے تو مان لینا، لیکن کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص کی فطرت بدل گئی ہے تو یہ نہ ماننا۔ اس کے لیے آج کے دنوں میں مختلف طریقوں سے مقامی اثرات کو بیلنس کیا جاتا ہے۔ پڑھائی لکھائی سے کلچر ٹھیک کرلیا جاتا ہے۔ کچھ عاداتِ ظاہرہ بدل لی جاتی ہیں۔ مگر ہم اپنی جینیات کو تبدیل نہیں کرتے۔ نہ ان کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کرِ دوسوم کی خاصیت تبدیل ہوتی ہے اور یہ کام صرف اللہ کی یاد کر سکتی ہے۔ شب قدر کا بھی بنیادی رول سلام ہے۔ سلامھی حتی مطلع الفجر. اس دن ملائکہ عالیہ اسم سلام کے سائے تلے اترتے ہیں اور یہ رات فیصلے کی رات ہے۔ جس بندے میں ذرا سا بھی خلوص پایا جاتا ہے، جبرئیل امین اسے مس کرتے ہیں۔ اس کی صلاحیت بڑھا دیتے ہیں اور اس کے اثرات اس کے بدن پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بدن میں مقناطیسی چج پیدا ہوتا ہے، جو آپ کی آئندہ زندگی کو بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔

مومن اور مہیمن حفاظت قلب کے لیے ہیں۔ دل جو اضطراب کی آماجگاہ ہے۔

جو کبھی بھی عقل کی کم ہی سنتا ہے، اس کے اپنے اندر کی سپیس ہے۔ دل سپیس پر قائم ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں کسی کو چھوٹے اور کسی کو بڑے دل والا کہتے ہیں۔ دل کی سپیس کشادہ نہیں ہوتی، جب تک آپ کے اوپر مشقتیں نہ آئیں۔ جیسے کوئی شخص پہلے دن بیمار ہوا، تو اس کا ردعمل کچھ اور تھا۔ اس کا واویلا تھا، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جلدی نجات ہو۔ تین سال بعد بھی وہ اسی بیماری میں ہوتا ہے اور اسے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔ شور اسی طرح مچا رہا ہوتا ہے کہ اس کی سپیس ہی نہیں بنی۔ اس کا صبر اس قابل نہیں ہوا کہ وہ احساسی طور پر اس سٹیج کو حاصل کر سکے، جہاں وہ اپنے درد اور المیے سے آگے جا سکتا۔

اللہ کا یہ ارشاد بجا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا. کہ ہم کسی جان پر اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ جس انسان کو جو مسئلہ بھی ہو، اس کی برداشت کرنے کی صلاحیت اس کے پاس ہے لیکن بالعموم لوگ اسے بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ پھر اللہ نے کہا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب. تم ہر چیز میں مال، خواہشات اور سٹیٹس پا سکتے ہو، مگر دل کا اطمینان نہیں پا سکتے۔ یہ میرے ذکر اور میری یاد کے بغیر ممکن نہیں۔ دل کا ذکر اس کی حفاظت ہے۔ اسم مومن اور مہیمن کے دونوں الفاظ حفاظت قلب کے لیے ہیں۔

تیسرا کلمہ یا رحمٰن یا رحیم یا کریم ہے۔ بنیادی طور پر میں بڑا خودغرض سا بندہ ہوں۔ اگر مجھ سے خدا نے کوئی وعدہ کیا ہے تو میں اسے بار بار یاد کراؤں گا۔ میری دانشمندی یہ ہے کہ میں اپنا بال خدا کی کورٹ میں پھینک دوں، نہ کہ اس کا بال میری کورٹ میں ہو۔ میرا فرض تھا اللہ کو دیکھنا، سمجھنا اس کو یاد کرنا اور وہ میں کر رہا ہوں۔ اب میں اللہ سے کہتا ہوں کہ اب آپ اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس کا وعدہ بڑا صاف ستھرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تمھیں پیدا کرنے سے پہلے ہی ایک چیز اپنے اوپر لازم کی تھی کتب علیٰ نفسہ رحمہ. میں نے قرآن حکیم میں یہ معاہدہ لکھ کے دیا کہ اے حضرت انسان! میں ہر حال میں تم پر رحم کروں گا۔ اب اگر اس نے مجھے لکھ کر دیا ہوا ہے، تو میں تو اسے روز یاد کراتا رہوں گا اور کہوں گا کہ اے اللہ آپ نے تو یہ لکھ کے دیا ہوا ہے There is no way out, you have to be very very kind چنانچہ تسبیحات میں یا رحمٰن یا رحیم یا کریم کے اسما معاہدے کے الفاظ ہیں۔

تیسری تسبیح ہر فرد کی انفرادیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی کے لیے یـــــا

ذوالجلال ولاکرام تو کسی کو یا ولی یا نصیر دیا جاتا ہے۔ یہ ہر فرد کی نیچر میں فرق کے اعتبار سے ہے۔ وہ انفرادی ٹیلنٹ، جو میرے خیال میں زیادہ مضبوط ہو کے رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، کسی شرارت کو افزا کرتا ہے یا کسی کمال کو بڑھا رہا ہے، تو تیسری تسبیح انفرادی اور اسی پہلو سے متعلق ہوتی ہے۔

یکساں نام ہنشا ندہی کیونکر

دنیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم سب ایک ہی کیمسٹری رکھتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، ہم سب کی کیمسٹری ایک ہے۔ اگر کوئی مجرم بن گیا ہے، تو میں اس سے نفرت نہیں کر سکتا۔ بس خوف کھاتا ہوں کہ اے پروردگار! میں بالکل اس جیسا ہی تھا۔ پھر اس کو راہ راست سے بھٹکنا پڑ گیا اور میں نے کون سا ایسا کمال کیا تھا کہ میں بہتری کو آ گیا۔ سو کسی بھی دوسرے بندے سے ہم غیریت نہیں برت سکتے۔ اجنبیت کا کوئی ایسا کام صوفی کے پاس نہیں ہوتا، نہ کسی قسم کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی برتری کا تصور کسی صوفی کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے میں بطور استاد یہ جانتا ہوں کہ میری اور اس کی ترکیب اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے کرم اور نوازش سے میں اس طرف آ گیا، وہ اس طرف چلا گیا۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی نے مروت کی تعریف میں فرمایا کہ تو پہلے خدا کا شکر کر کے اس طرف آ اور پھر اس کے لیے دعا کر کہ وہ بھی اس طرف آ ئے۔ یہ ہمارے تئیں مروت ہے۔

نام ایک جیسے ہو کے بھی علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ صرف چودہ بنیادی اقسام ہیں جو اسمائے الہیہ میں آتی ہیں، جن کو آپ حروف مقطعات کہتے ہیں۔ وہی گروپس ہیں۔ ان کے علاوہ زمین پر کوئی پندرھواں بندہ، کوئی پندرھویں شے نہیں ہے۔ اب ان کے مزید جوڑ ہیں۔ جیسے 32 16+16 = شطرنج کے مہرے ہوں گے۔ چالیس بلین میں جاتی ہیں۔ اسی طرح بنیادی انسانی اقسام یکساں ہیں۔ جب یہ آپس میں ملتی ہیں تو یہ بکھرتے اور پھیلتے ہیں اور اپنی شکلیں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر سارے انسان صرف تین قسم کے ہیں۔ ہم بلیو آنکھوں والے اور وہ جو گھنگھریالے بالوں والے حبشی ہیں، چوتھا کوئی بندہ نہیں ہے۔ جتنا آپ پیچھے جائیں گے، اشیاء کی اصل سادہ ہوتی جائے گی۔ البتہ اگر مجھے مزید کوالیفکیشن طلب کرنی ہو تو میں جینیات میں چلا

جاؤں گا۔ کسی سے ماں یا باپ کا نام پوچھ لوں گا۔ جیسے اس خاتون کا کہنا تھا، وہ ایسی نہیں ہیں۔ اگر میرے پاس اپنی ججمنٹ نہ ہو، تو لوگ مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔

انسان بنیادی طور پر اپنی ذات کے ساتھ رحم کھانے والا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو اس خطا کے لیے خود کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا، جو وہ کرتا چلا آیا ہے اس لیے ہم دوسروں کے ورژن پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اس کا مقصد دوسروں کو متاثر یا کنفیوژ کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی مدد کرنا ہے کہ یہ بنیادی نقص ہے اور اس کے لیے یہ علاج ہے۔ بالفرض ایک آدمی خدا واسطے میرے پاس آتا ہے۔ اس کا اپنے بارے میں گمان ہے کہ میں بہتر ہوں۔ تو میرا یہ حق نہیں بنتا کہ میں اس سے الجھوں اور اس سے بحث کروں۔ ہاں اگر کوئی فرد اکیڈیمک کے لیے آئے گا تو پھر ہم اس کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ میرے پاس دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے بوسنیائی، سعودی اور ایک سوڈانی آیا ہوا تھا۔ ان کے مسائل تھے۔ ان سے مسائل اور فقہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اگر لوگ اس کے لیے آئیں گے، تو میرے پاس اس کی اتھارٹی ہے۔

بندگی میں صوفی اور ٹیچر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر ہیں اور آپ گیارہویں یا بارہویں کی سطح کی کلاس پڑھا رہے ہیں تو آپ واضح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ لڑکے تم غلط ہو، میں ٹھیک ہوں۔ یہ ہماری معلومات اور ہمارے پس منظر پر ہے کہ جو کچھ میں نے اور اس نے حاصل کیا ہوا ہے اس میں ابھی اس نے مجھے کراس نہیں کیا۔ کہ وہ کہے، میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ اسی لٹریچر کے فریم ورک میں مجھ سے پوچھ رہا ہے یا بتا رہا ہے، جو کہ میں بطور ٹیچر اسے کہہ سکتا ہوں کہ تم غلط ہو۔ یہ تکبرات میں نہیں آتا۔ ٹیچر جب اپنے کسی شاگرد کو بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ غلط ہے، تو وہ متکبر نہیں ہوتا۔ مگر جب صوفی کسی کو غلط کہے گا کیونکہ صوفی نام ہی اس بات کا ہے کہ دوسرا بندہ خطا کار ہے، تو پھر اس کا تکبر اس سے بڑی خطا کاری کرتا ہے۔ جتنا خدا سے خدا کے قریبی لوگ ڈرتے ہیں، دور کے لوگ نہیں ڈرتے۔

اسم اعظم کی حقیقت

اس میں خدا کے حوالے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ اسمائے الٰہیہ جو باقی اسمائے الٰہیہ کی تقسیم بندی کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، ہم صفاتِ الٰہیہ کو مختصر کرتے جائیں تو ہم نے دیکھنا ہوتا ہے

کہ وہ اسما کون سے ہیں جو دوسرے تمام اسما کی اقسام کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جب حضور گرامی مرتبت ﷺ سے اسمِ اعظم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اسے سورہ بقرہ اور سوہ طہ میں ڈھونڈو۔ سورہ بقرہ میں دو ہیں اور سورہ طہ میں ایک ہے۔ سورہ بقرہ میں ایک، الھکم الہ واحد، لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم اور دوسرا ہے، اللہ لا الہ الا ھو، ہو الحی القیوم۔ تو یہ دونوں اسمائے اعظم ہیں۔ سورہ طہ میں دیکھیں ایک نظر آتا ہے۔ و عنت الوجوہ للحی القیوم یہ بات طے ہے کہ حی اور قیوم اسمائے اعظم ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ جو پہلے اسما ہیں، آیا وہ بھی ہیں کہ نہیں۔ چنانچہ بنیادی چار سب سے بڑے اسما رحمٰن، رحیم، حی اور قیوم ہیں۔ ان کے فنکشن دیکھیے، تو آپ کو بالکل وضاحت ہو جائے گی۔

ایک کام اللہ کا تخلیق اور ایک سپروژن ہے۔ تخلیق کرنے کے لیے انتظامی فیکلٹی استعمال کرنا اور ہے اور تخلیق کو جنم دینا اور ان کے سائنسی قوانین بنانا اور ضوابط رکھنا اور کام ہے۔ ان اسمائے الہیہ کو امورِ ثمانیہ کہتے ہیں۔ آٹھ آٹھ پاورز دونوں اسما کی ہیں۔ متذکرہ دونوں اسمائے اعظم ہیں، لیکن ان کے فنکشن جدا جدا ہیں۔ الھکم الہ واحد لا الاہ الا ھو الرحمٰن الرحیم. یہ اسمِ اعظم ہے۔ آگے خدا وضاحت کرتا ہے۔ ان فی خلق السموات والارض و اختلاف الیل و النھار. اب دیکھیے، یہ شب و روز کے اختلاف سارے سائنسی قوانین ہیں۔ والفلک التی تجری فی البحر اور یہ پانیوں پہ چلتی کشتیاں، و تصریف الریح والسحاب لمسخربین السماء والارض. یہ جو ہوائیں مسخر ہیں اور جو بادل پانیوں سے لدے ہیں، اوپر نہیں جاتے۔ کششِ ثقل سے نیچے ہی رہتے ہیں۔ لایات القوم یوقنون اہل عقل و تدبر کے لیے ان سب میں بڑی واضح نشانیاں ہیں۔ ان فی خلق السموات والارض و اختلاف الیل و النھار والفک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السماء من ماو احیابہ الارض بعد موتھا و بسافیھا من کل دابۃ و تصریف الریح والسحاب المسخربین السماء والارض لا یات القوم یوقنون. یہ تمام سائنسی قوانین ہیں۔ پیدائش، کششِ ثقل اور تخلیق کے وہ قوانین، جن پر اسم رول کرتا ہے۔ تمام تخلیقی مراحل کو جو اسم رول کرتا ہے، وہ و الھکم الہ واحد لا الا الہ ھو الرحمٰن الرحیم ہے۔

اب میں آپ کو دوسرا سناتا ہوں کہ وہ تمام انتظامی صلاحیتیں کیا ہیں۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذ سنتة و لا نوم لہ ما فی السموات و ما فی الارض من ذالذی یشفع عندہ الا باذن یعلم مابین ایدیھم و ما خلفھم و لا یحیطون بشی من علمہ الی بما شاوسع کرسیہ السموات والارض ولا یودہ حفظھما و ھو العلی العظیم. اب عمومی بندوں کو، جنہیں اتنے سارے سائنٹفک علوم سے واسطہ نہیں ہے۔ جو تدبر نہیں چاہتے، ان تمام کے لیے اسم اعظم یہ ہوا، اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم. مگر جن لوگوں کو علمی شوق اور تجسس ہے اور وہ دانشوری کے خبط میں پڑتے ہیں، وہ دوسرے علم کو چاہیں گے۔ وہ تدبر، سائنٹیفک لاز اور سوچنے سمجھنے کو جائیں گے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مجھے خداوند کریم نے سوچنے کی صلاحیت بخشی اور اپنی نوازش سے شوق تحسین بخشا ہے تب سے میں دونوں اسما کی تسبیح کر رہا ہوں۔

اسم اعظم کا تصرف

جیسے کمپیوٹر کے بہت سارے کوڈز اور اس کے بے پناہ ادارے ہیں اور ان اداروں کو بہت سارے کوڈز کور کرتے ہیں۔ آپ جتنی مرضی کوشش کر لیں، اگر کوڈ صحیح نہیں ہے تو اس تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر صحیح ہو، تو اس تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اب کسی کو یہ پتہ نہیں کہ کتنی بار پر رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی نے اسم اعظم کی تعریف کی کہ ایک مرتبہ کہنا بھی اسم اعظم ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ جب تو دل سے لفظ اللہ کہے، تو اس وقت تیرے دل میں اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ ایک تو یہ اسم اعظم ہے۔

دوسرا آپ ایک اسم کی تلاوت شروع کرتے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں ہوتا کہ اسم کس رینک پر پہنچ کر کوڈ بن جائے گا۔ فرض کیا، ایک شخص ایک کروڑ مرتبہ پڑھتا رہے اور کہے، میں نے بڑے اخلاص سے پڑھا، مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کو یہ نہ پتہ ہو کہ ایک کروڑ ایک مرتبہ پڑھنے سے کوڈ مل سکتا ہے۔ حضرت سلیمان کے دربار میں ایک شخص آصف بن برخیہ موجود تھے۔ لوگ خدا کی کتاب کے بارے میں کتنے کنفیوژ ہیں۔ بے شمار لوگ صبح و شام قرآن پڑھتے ہیں، مگر ان میں آصف بن برخیہ کوئی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک جن نے کہا، اے شاہ والا! مجھے آپ

اجازت دیں، میں تین چار ہزار میل دور سے تخت سبا آپ کی نشست برخواست ہونے سے پہلے لا دیتا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس شخص، جس کو کسب کا علم عطا ہوا تھا، نے کہا حضرت والا! مجھے اجازت دیں، میں پلک جھپکنے سے کم وقت میں یہ لا سکتا ہوں۔ اب بظاہر یہ بہت چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ آصف بن برخیہ کو اسم الٰہیہ میں اتنی کمان حاصل تھی کہ وہ اس کوڈ پر قادر تھا۔ کوڈ کریک کیا تھی؟ Defusion اور Fusion۔ اس پر جواب آپ زور لگا رہے ہیں، وہاں حضرت آصف بن برخیہ نے اشارے کنائے سے ڈی فیوز کیا اور یہاں اسے دوبارہ یکجا کر دیا۔ سائنس، جسے بڑی مشکل سے پا سکتی ہے، خدا سے لگے ہوئے لوگوں کو اتنی آسانی سے ملتی ہے کہ ان کا اشارہ کنایہ بھی ڈی فیوژن اور فیوژن کا عمل کر دیتا ہے۔ آئن سٹائن نے جب پہلی مرتبہ کانسپٹ دیا تھا کہ تمام مادہ انرجی میں اور انرجی مادہ میں تبدیل ہو سکتا ہے تو اس کا Defusion چند سالوں میں ہی ممکن ہو گیا تھا، لیکن Fusion آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔ قانون درست ہے۔ کہیں پچھلے چار پانچ سالوں میں ایک چھوٹے سے میٹریل کو انہوں نے Defuse کیا ہے۔ اب قانون عمل میں آ رہا ہے۔

دنیا صرف اس وقت تک ہے، جب تک قرآن انٹرپریٹ ہو رہا ہے، اس سے آگے دنیا نہیں جا سکتی۔ قرآن کے متشابہات اس وقت لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتے۔ جیسے سلیمان نے چیونٹی سے خطاب کیا، آپ کا انٹلیکچوئل اسے تسلیم نہیں کرتا۔ رب کعبہ کی قسم! Decoding سے جینیات تک پہنچیں گے اور ایک دن کہیں گے کہ ہاں ہم چیونٹیوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن میں تخت کے پہنچنے کا ذکر ہے، تو آپ تخت کے پہنچنے کا اصول سیکھیں۔ وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ متشابہات محکمات میں بدل جائیں گی۔ آپ کم از کم اس کی دلیل رکھتے ہیں۔ ایک عام سا بندہ ڈی فیوژن اور فیوژن کر سکتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ رب کبیر اپنے کسی بندے کو یہ الاؤنس دے سکتا ہے۔ یہ قرآن ہی پورا ہو رہا ہے۔ قرآن سے آگے کوئی زندگی نہیں۔ یہ بلیک ہول کیا ہیں؟ گلیکسیز کا گرد و غبار ہضم کرنے کی ٹوکریاں ہیں، تاکہ رفتار سیارگاں متاثر نہ ہو۔ جو کمزور ستارہ نظام شمسی میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے وہ ڈسٹ بن کے قریب گذرتے ہی اس کی نذر ہو جاتا ہے چیزیں بڑی سہل ہیں۔

میں نے جب پہلی دفعہ کثیر کائناتی نظریے کا تصور پیش کیا تھا تو مجھ پر بھی لوگ ہنستے تھے لیکن آج کثیر کائناتی نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن کہتا ہے

کہ میں نے سات زمینیں بنائی ہیں، تو ایک آدھ زمین کا سراغ ضرور آپ کو ملے گا۔ ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم مغرب سے علم لے کر دباؤ اور خوف میں ہیں۔ ہمارا سائنسدان اس لیے قرآن نہیں پڑھتا، کہ اس کے ساتھ عمومی کمپلیکس وابستہ ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے پتہ نہیں کیا کچھ پڑھا ہوا ہے۔ کیا پتہ کوئی بات قرآن میں سے غلط نکل آئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں کو نہ پتہ ہو کہ آخر سائنسز کہاں تک پہنچیں گی یا فکر و جال کیا کچھ نہیں کر سکے گی۔ اللہ تو اس آیت سے شروع کرتا ہے کہ اولم یرل الذین کفرو تم کیسے میرا انکار کر سکتے ہو، ان السموات والارض کانتارتقا ففتقنھما، تم مجھے کیسے جھٹلا سکتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے، شروع میں زمین و آسمان اور ہر چیز یکجا تھی، پھر ہم نے انہیں بزور قوت الگ کر دیا۔ یہاں سے شروع کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے۔ اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت سورج ماند پڑ جائے گا اور ستاروں کی روشنیاں ختم ہو جائیں گی۔

اگر خدا آغاز کائنات سے لے کر انجام کائنات تک آپ کو ایک خبر دیتا ہے تو آپ کا خیال ہے کہ اس کو یہ نہیں پتہ ہوگا کہ بیچ میں ہونس نے کیا کہا ہوگا۔ ڈبلیو ہیلیکس کتاب لکھے گا۔ یہ جو نئے سکائی سکریپر بن رہے ہیں، اور جو شٹلو آ جا رہی ہیں، اسے ان کا علم نہیں ہوگا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا انٹلیکچوئل بنی نوع انسان کی تمام دانش کا احاطہ نہیں رکھتا ہوگا؟ یہ سوچنا کتنا احمقانہ سا لگتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے آپ خدا کو نہیں مانتے۔

شروع شروع میں قرآن میں لوگوں کو دلچسپی تھی، لیکن اب ہم میں قرآن کے عمومی سٹیٹس کے لوگ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک عمومی سوال پوچھنا ہے کہ اگر آپ ایم ایس سی کی کتاب لے کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک پانچویں جماعت کا طالب علم آ کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو آپ اسے کہتے ہیں کہ یہ کتاب تیرے معیار کی نہیں ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھ سکو گے۔ چودھویں جماعت کا کوئی آ جائے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ یار یہ آپ کے معیار سے ذرا آگے ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے کہ اس خدائے بزرگ و برتر کی کتاب کا کوئی معیار نہیں ہے؟ آپ کا خیال ہے کہ قرآن کا عمومی دانش کا کوئی معیار نہیں ہے؟ ایک لیول تو اس کا بھی ہوگا۔ ایک ایسا لیول، جس پر قرآن سمجھ آتا ہوگا۔ وہ بھی اللہ کا سٹیٹس ہے، میرا نہیں ہے۔ مگر اللہ نے اپنی کتاب کا ایک سٹیٹس تو رکھا ہوگا کہ جو لوگ ان چیزوں سے گذریں گے ان چیزوں میں

کو ایفائی کریں گے، وہ قرآن کو کیسے سمجھنے کے اہل ہوں گے؟

دوسری طرف یہ آسانی کر دی کہ ان پڑھ کو بھی اس کے پڑھنے کا ثواب بخش دیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ الم پر ثواب ہے اور اس طرح نہیں، بلکہ الف پر، لام پر میم پر الگ الگ ثواب ہے۔ یعنی ایک عمومی پڑھنے والے کو بھی اس کا ثواب بخشا۔ لیکن اصلی معیار تک بھی تو کسی کو پہنچنا ہے۔ یہ واحد خدا کی کتاب ہے جو معمولی ترین معیار سے لے کر بلند ترین معیار تک یکساں قابل مطالعہ اور یکساں قابل فہم ہے۔ پھر بھی مجھے کہنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ زمانۂ آخر میں علم ختم ہو جائے گا اور اس طرح نہیں کہ علم ختم ہو جائے گا، بلکہ عالم ختم ہو جائیں گے۔ علم تو محتاج ہے وہ انسٹرومنٹ ہے کسی کے ہاتھ میں ہوگا، تو سامنے آئے گا۔ جب عالم ختم ہو جائیں گے، تو علم خود بخود ختم ہو جائے گا اور پھر سوائے اس کے کہ قحط الرجال شروع ہوا اور آپ **انا للہ و انا علیہ راجعون** پڑھتے رہیں۔ **اولئک ھم المھتدون.**

خدا کہتا ہے، اہل عقل اور میرے ہدایت یافتہ لوگوں کو کچھ ٹیسٹ پاس کرنے پڑتے ہیں۔ **والنبلونکم بشی من الخوف** انہیں خوف ذات اور توقعات کے ٹوٹنے سے گذرنا ہوگا۔ انہیں امیدوں کو مختصر کرنا پڑے گا۔ والجوع، جوع کی کئی اقسام ہیں۔ **و نقص من الاموال** ان کو ڈپریشن سے والانفس اندرونی اور ذاتی کیفیات کے بحرانوں سے گذرنا ہوگا۔ والثمرات، بہت سی چیزیں اور ان کی محنت کے پھل ان سے چھین لیے جائیں گے۔ ان کی اولادیں اور ان کے ماں باپ چھینے جائیں گے۔ ان سے ان کی ملکیتیں فنا کی جائیں گی۔ **و بشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبتہ**، میری طرف سے مبارک اور بشارت ان لوگوں کو دو، جن پر مصائب آئے، وہ ٹھہرے، رکے اور بڑے تحمل سے چھوٹی سی بات کی، **قالو ان للہ و انا علیہ رجعون** کہ یہ سب عارضی مرحلہ ہے۔ میں فانی ہوں۔ میری زندگی فانی ہے۔ گلیکسیز کے اربوں کھربوں سال میں میرے پاس نہایت حقیر سا وقت ہے۔ مجھے واپس خدا کے پاس جانا ہے۔ میری ہر چیز خدا کے پاس چلی گئی ہے۔ آج اس نے مجھے دشواری دی ہے، تو کل مجھے سہولت دے گا۔ خدا کہتا ہے۔ جس کی اپروچ یہ رہی۔ **اولئک علیھم صلوۃ من ربھم**، میری طرف سے ان پر درود اور سلام ہو، **و اولئک ھم المھتدون** اور یہ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، دانشور ہیں، جو مجھ تک اور میری کتاب تک رسائی رکھتے ہیں۔

چنانچہ ہم اپنی ذمہ داری سے کوتاہی برت رہے ہیں۔ جب سے ہائی اکیڈیمک اور میتھوڈسٹ مولوی شروع ہوئے ہیں، نیات کا علم ہی غائب ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے لفظ سے لفظ سفر کرتا آ رہا ہے۔ لفظ سے اثر نے سفر نہیں کیا۔ طوطے کی طرح رٹا و جاری رہا۔ آپ حفاظ عالم تیار کر رہے ہیں۔ قرآن حفظ ہو رہے ہیں۔ اندھوں کی طرح سر مارے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب قرآن نہیں ملتا۔ اقبال کہتا ہے کہ غلام سے تجھے کیا لذت قرآن ملے گی، جو قرآن اس لیے پڑھ رہا ہے کہ کسی کی موت پر جا کر اس نے پڑھنا ہے اور چاول کھانے ہیں۔ جو قرآن سارے کا سارا اس لیے پڑھ رہا ہے کہ کب مولوی صاحب کسی کے گھر سے موت کی خبر لائیں میں وہاں جا کر تھوڑا سا پڑھوں اور مجھے دو چار ٹکے ملیں۔ اس نے قرآن کیا پڑھنا اور کیا سیکھنا ہے۔ اس سے بڑی خود غرضی والدین کی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی اپنی صلاحیت کارصفر ہے۔ ان کے گھروں میں عبادات کے نام و نشان نہیں ہوتے، جو بچوں کو قرآن حفظ کرا رہے ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی احساس ذمہ داری ہے۔ ایک حکم پروردگار ہے۔ اگر بچوں کو پڑھا کر اور اس کے پیچھے اپنی مثال دے دیں، تو یہ ان کی فلاح کے لیے کافی ہے۔

کیفیات بسلسلۂ خدا

آپ کی یہ قدرتی کیفیات ہیں، جو ہر اداس دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اداس دل اس لیے کہ جس دل کو بھی کسی کام کی اہلیت کا اپنے اندر احساس ہو اور وہ کام نہ کر پائے، تو جو رکاوٹیں وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اس کے لیے اسے کہیں نہ کہیں پناہ لینی پڑتی ہے۔ آپ بھی اس بے چارگی میں سکون کے لیے اللہ کو چاہتے اور مانتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی آپ کو جواب دیتا ہے مگر خداوند کریم نے ایک بات ہمیشہ ہمیں نصیحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کبھی وہ سوال نہ اٹھایا جائے، جس کے لیے ہمارے پاس مناسب ڈیٹا نہ ہو۔ یہ اللہ کی بڑی واضح قسم کی نصیحت ہے۔ جیسے کہ آپ نے کہا کہ خدا مجھے نظر آئے، تو خدا نے ہمیشہ یہ کہا کہ کوئی آنکھ مجھے دیکھ نہیں سکتی۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی محسوسات بڑی حساس نوعیت کی ہیں۔ ایسی محسوسات یا تو نشے سے پیدا ہوتی ہیں یا انسان بنیادی جینیات سے ان کا اہل ہوتا ہے۔ ان محسوسات میں یہ احساس کبھی کبھی بیماری بن جاتا ہے۔ انسان کبھی ایسے سمبل کو خدا سمجھنا شروع کر دیتا ہے، جو خدا نہیں ہوتا۔

ایک معیار ہمیشہ اپنی نظر میں رکھیے گا، کہ خدا ہمیشہ اعتدال میں ہے۔ جیسے اس نے کہا، **ثم استوی الی السماء فسوھن سبع سموات** کہ ہم بلند ہوئے آسمانوں پر جو بیلنس میں کئے۔ یوں پوری کائنات کے ذرے ذرے میں آپ کو علت و علول کا توازن نظر آئے گا۔ جب ہمارے اندر وہ توازن نہیں رہے گا، تو ہماری خود پسند سوچ، وسوسہ اور تخریب کو استعمال کر کے ہمیں

صحت دماغ سے نکال دے گی۔ تسبیحات کے بنیادی مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ ہمیں خدا کا ڈیٹا ملنا شروع ہو جائے۔ یعنی ایک ایسا کمپیوٹر، جس میں اس کی ٹک ٹک اور ڈیٹا نہیں، وہ خالی ذہن ہے، جو اپنے اندر ہی سے محبت کے معنی نکالتا اور اپنے اندر ہی سے مسائل کے حل ڈھونڈتا ہے، لیکن اس کا ڈیٹا یا ایک فرنٹ لائن کنکشن نہ ہونے سے وہ ہمیں تسکین نہیں دے سکتا۔

ہم تسبیحات شروع کرتے ہیں، تو یہ خدا سے تقریباً براہ راست ڈائلنگ کے مترادف ہے۔ ہم اس کا بار بار نام لیتے ہیں، یا اس کو ڈائل کرتے ہیں کہ ہمارے معاملات اور مسائل میں آپ ہماری مدد کرتے رہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم صحت مندی کے ساتھ اپنے خیالات کے بحران سے نکل جائیں۔ ان تسبیحات میں بہت زیادہ ارتکاز توجہ بھی نہیں چاہیے۔ بہت سے لوگ بہت ارتکاز توجہ کے ساتھ تسبیحات کرتے ہیں۔ جب توجہ کو مرکوز کیا جائے، تو جو پہلے سے موجود خیالات ہیں، وہ ہمارے سامنے متشکل ہو جاتے ہیں اور ہمیں دوبارہ گمراہ کر دیتے ہیں۔ خدا نے اپنی یاد میں صرف اتنا بتایا کہ اپنے دوست کو یاد کرتے رہو، تاکہ میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں۔ جب وہ آپ کو یاد کرنا شروع کر دے گا، تو وہ آپ کو اس عدم توازن یا اس سیراب تک نہیں پہنچنے دے گا، جس کی خیال رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

میں نے تصوف میں جو سب سے بڑی کوالٹی پائی ہے، وہ کانٹ چھانٹ کی ہے۔ جیسے جب جھاڑیاں بہت ساری اوپر اگ آئیں، تو ان کو کاٹ کر تواتر میں لانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ذہن میں بڑے اعلیٰ اور نفیس خیالات ہوتے ہیں۔ ان سے خود ہمیں محبت ہوتی ہے۔ وہ ہمیں اچھے اور منفرد لگتے ہیں۔ ہماری شخصیت کو اتنا اجاگر کرتے ہیں کہ جب ہم ان کا ذکر بھی کرتے ہیں، تو ہم نمایاں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سب جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک قینچی ہاتھ میں ہر وقت رہنی چاہیے تاکہ یہ جھاڑ جھنکاڑ اتنے نہ آگے بڑھ جائیں کہ آپ کے سادہ سے تصور اخلاص پر حاوی ہو جائیں۔ ہم ان کو کاٹتے رہتے ہیں۔ جو چیز بھی زد میں آتی ہے وہ کٹ جاتی ہے۔ چاہے وہ رسوم و رواج ہوں یا آپ کی عادات یا خیالات ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے، کہ آپ مکمل ہو جائیں گے۔ مکمل انسان بھی گذر گئے۔ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انداز گذر گیا۔ اس کے بعد بہترین لوگ اصحاب رسول گذر گئے۔ پھر فرمایا ثم الذین یلونہم تابعین گذر گئے۔ اب ہمیں چوتھے اعتدال کی کوشش کرنی ہے۔ چوتھے اعتدال میں خاصی گڑبڑ

ہوتی ہے۔ آپ صرف حدود اللہ کی حفاظت کریں، تو خدا کبھی بھی آپ کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں۔ وہ ہمیشہ آپ کی رہنمائی کرے گا۔ آپ کے ساتھ رابطے میں رہے گا اور جہاں بھی آپ بڑی غلطی کریں گے، آپ کا راستہ روک دے گا۔ یہ اس کی محبت کا نشان ہے۔

مذکورہ قینچی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ اپنے ساتھ اور اپنی ذات کے ساتھ کوئی خود ترحمی نہ برتی جائے۔ و اما من خاف مقاما ربه و نهى النفس عن الهوى کہ جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اس نے اپنے نفس کی ضرور مخالفت کی۔ یہ چیز نفسیات کے معاملے میں بجا نہیں ہے۔ نفسیات اور اس کے اعلیٰ ترین مناصب ذات (Self) کی محبت کا گمان ہمیشہ قائم رکھا جاتا ہے۔ مگر اللہ نے یہ صاف بتایا ہوا ہے کہ جو اپنی ذات سے محبت رکھے گا، وہ مجھ سے محبت نہیں کرسکتا۔ ہمارے پاس ایک قینچی ضرور ہے کہ ہم اپنے لیے ہمدردی تلاش کرنے والے نہ ہوں۔ ہم اپنے آپ کو توجہ کا مرکز نہ بنائیں۔ نرگیت پسند اپنے آپ سے محبت کرنے والا اور انانیت پسند کبھی خدا تک نہیں پہنچتا۔ خدا تک پہنچنے کے لیے ایک اعتدال کی راہ اور ایک ایسی سوچ چاہیے، جو اپنے مقصد کو کبھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔

میں کسی زمانے میں بہت اچھا شاعر تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ شاعری میرے مقصد میں حائل ہے، تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ نہیں کہ مجھے اس سے نفرت ہوئی یا میں اس کو غلط سمجھتا تھا۔ مگر مجھے یہ پتہ تھا کہ بذاتِ خود یہ اتنی تضیع ہے کہ مجھے اس مقصد سے ہٹا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری چیزیں، جو مجھے تشہیر دینے میں بڑی معاون ہوسکتی تھیں، ان سب کو میں نے صرف اسی لیے چھوڑا کہ وہ مجھے میرے مقصد کی راہ سے ہٹا سکتی ہیں۔ جب میں اسمائے حسنہ پر ریسرچ کر رہا تھا، تو یہ اتنا بڑا وژن اور ترقی تھی کہ خیال کہتا تھا، پوری طرح اس کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس سے تو الہام کے رستے نکل سکتے ہیں۔ پھر یہ خیال آیا کہ اس میں اختیار اور عقل کی اتنی بڑی قوت بھی ہے کہ اس میں پڑ گیا، تو خدا کی محبت کا جو دعویٰ ہے، وہ مجروح ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔ میں نے خدا سے درخواست کی کہ میں ان چیزوں پر اختیار اور ان کی آرزو نہیں رکھتا۔ ایک بات بڑی اہم ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ برقرار رہے کہ میں تمہارا ہوں، تم میرے ہو۔ ہمارا آپس کا معاہدہ، تیری خدائی اور میری بندگی کا منقطع نہ ہو۔ الحمدللہ! کہ اس بحران سے بھی اللہ نے مجھے نکال لیا۔

میں آپ کو خدا کی مہربانی کی ایک چھوٹی سی مثال بتاؤں کہ بہت ہی جوان عمر میں، جب آدمی کے پاس بے شمار خیال اور آرزوئیں ہوتی ہیں، جس خدا نے مجھے ترجیح کا احساس بخشا اور ترجیحات کا احساس دیا ہے وہی میں آپ کو منتقل کر رہا ہوں۔ سب سے بڑا نقص ہماری امت میں یہی ہے کہ ہم کسی درجے کی ترجیحات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور سب سے اہم ترجیح کو سب سے کم اہمیت دیتے ہیں۔ میں اب وہی خیال لیے بیٹھا ہوں کہ ہماری ترجیحات کا تعین ہونا چاہیے اور خدا کے سوا کوئی شے ترجیح اول نہیں ہے۔

الجھنوں کے بھنور سے نجات

میرا یہ یقین ہے کہ اس سوال کا جواب صرف اللہ کی محبت میں ہے۔ آپ لوگوں نے شاید بہت عرصہ ہوا، اس سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ Love labour is always very sweet (محبت کی مشقت میں ہمیشہ بڑی لذت ہوتی ہے) اگر میرا محبوب آدھی رات کو بھی مجھے کہے کہ فلاں چیز ڈھونڈو، تو میں پاگلوں کی طرح جاؤں گا۔ ہر دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور اس نے جو وقت دیا ہے، اس سے ایک گھنٹہ پہلے اسے لا کر دوں گا۔ اس لیے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ مذہب میں کئی چیزیں ہمارے پیٹرن سے نکل گئی ہیں اور غلط چیزیں آ گئی ہیں۔ ہم نے اداروں سے محبت ڈویلپ کر لی ہے۔ انداز و بیاں اور اپنے ذاتی بتوں سے محبتیں پال لی ہیں۔ مگر خدا کی محبت اس طرح ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔

اپنی ذاتی مثال کے حوالے سے میں بہت ست الوجود اور اٹھنے بیٹھنے اور نماز پڑھنے میں لاپروا تھا۔ میرے ذہن میں خیال یہ تھا کہ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر بڑے بڑے اعلیٰ مابعد الطبیعیاتی تصورات سے جو روشنی ملتی ہے، وہ نماز پڑھنے سے کہاں ملتی ہے۔ کافی عرصہ میں اس بحران کا شکار رہا۔ ایک دفعہ جب ہم چار، پانچ کمیونسٹ ساتھی بحث کر رہے تھے اور بحث عروج پر پہنچی، تو انہوں نے کہا، تم کیسے مسلمان ہو! اللہ کی بات ماننا تمہارے ادراک میں نہیں ہے۔ انہوں نے براہ راست ایک ذاتی سا سوال کر دیا کہ کیا تم نماز پڑھتے ہو؟ میں نے جھوٹ بول دیا کہ ہاں میں پڑھتا ہوں۔ شاید اس وقت بحث و تمحیص کا معاملہ تھا۔ میں ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ ورنہ ساری بحث خارج ہو جاتی تھی، لیکن جب میں اپنے خیالات میں آیا، تو میں نے کہا

کہ ہماری کون سی محبتیں ہیں، جو معنی رکھتی ہیں۔ میں دنیا کی چھوٹی چھوٹی محبتوں کے لیے اتنی جانفشانی سے کام کرتا ہوں۔ خدا مجھے کچھ بھی نہیں کہتا۔ کہتا ہے یار! تم ایک عمومی حکم ماننے سے دریغ کرتے ہو، تم خصوصی حکم کا کیا دعویٰ رکھ سکتے ہو۔ تب سے نماز میں میرے یہ احساس رہا کہ یہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ یہ اس کا حکم ہے۔ چاہے میں مانوں یا نہ مانوں۔ اگر میں اسے مانتا ہوں، تو نماز میں میری رضامندی یا نا رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ اسی طرح ہے کہ ایک بہت بڑا باس ہے، جس کے آپ ملازم ہیں۔ بعض اوقات دل سے آپ اسے صلواتیں سنا رہے ہوتے ہیں، مگر اس کا کام بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ خدا سے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جب میں نہیں چاہتا تھا، تو مجھے نماز بہت مشکل لگتی تھی۔ جب اسے چاہتا ہوں، تو میں نے بڑے مشکل حالات میں نمازیں پڑھیں، کبھی پیٹرن کے بغیر اور کبھی پیٹرن کے ساتھ پڑھی ہیں۔ تب سے لے کر اب تک میری کوئی نماز ضائع نہیں ہوئی۔ میرا احساس یہ ہے کہ وجود کی سستی اور انٹیلکچوئل ازم کی کاہلی کے باعث ہم رسم یا عادت کو وہ مقام نہیں دیتے، جو اس کو ہمیں دینا چاہیے۔ یعنی کچھ چیزیں تو ضرور ایسی ہوں گی، جو خدا کی طرف چلنے میں ہمارا نشان بنیں گی۔ ان میں سب سے بڑی پہچان نماز ہے۔ نماز کے علاوہ ہماری عام زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جو ظاہری ہو۔ باقی تمام کا تمام مذہب داخلی ہے۔ اگر غیبت سے منع کیا گیا ہے تو یہ اندرونی صفت ہے۔ کم علمی کے ساتھ تشکیک کو روکا گیا۔ حسد اور کینہ سے منع کیا گیا۔ تو وہ اندرونی صفات ہیں۔ یہ تمام ترتیب اندرونی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مذہب کے بارے میں جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں، وہ سب اعتقادی ہیں۔ یہ ساری کی ساری بنیاد پرستانہ تحریکیں تھیں، جو اعمال تک آ کر رک جاتی تھیں۔ آگے مذہب کی کوئی فلاسفی نہیں رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مذہب کے سخت گیر پیروکار کے طور پر تو ترقی کر رہے ہیں، جو پاگلوں کی طرح پگڑیوں پر دین کی بنیاد رکھتے ہیں، لیکن داخلی وژن سے بالکل خالی ہیں۔

جن استادوں کی آپ نے بات کی ہے، میں انہیں استادوں کا یہ نقص سمجھتا ہوں کہ انہوں نے تعلیم دیتے وقت آپ کو اسلام کا نظریاتی ادراک نہیں دیا ہے۔ انہوں نے آپ کے ذہن میں صرف لفظی آئیڈیل تخلیق کیا، جس کو عملی نہیں کہا جا سکتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اسلام عمل سے آئیڈیل کو حرکت کر رہا ہے۔ یہ تحریک وہ ہے کہ تھوڑے سے عملی خیالات کے بعد ہم ایک بہت

بڑے آئیڈیل کو حرکت کرتے ہیں۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ مابعدالطبیعیا اسلام کے سوا کہیں وجود نہیں رکھتی۔ واحد مذہب اسلام ہے، جو آپ کو خدا کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس تک پہنچانے کا راستہ دیتا ہے۔ اگر مابعدالطبیعیا میں ساری دنیا کے بھی تصورات اکٹھے کر لیے جائیں تو وہ خدا تک جانے سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ صرف مذہب اسلام ہے، جو مابعدالطبیعیات کے اعلیٰ ترین رستوں کی، جو اللہ تک رہنمائی کرتے ہیں، دوسروں کے مقابلے میں مکمل نشاندہی کرتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اسلام کی کوئی اعلیٰ اقدار اس وقت متعارف نہیں ہو رہیں۔ ہمیں یورپ کا طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کو مغرب کی طرف سے بدترین صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری اپنی نمائندگی بھی تو معیار سے کم تر ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں، جو بہتر اسلامی آئیڈیلز کی نشاندہی کر سکتے ہیں اور وہ بھی فرضی طور پر۔ کچھ ذات سے کچھ افکار سے۔

عشق کی تعریف

عشق اسے کہتے ہیں، جو آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے۔ جب عشق ٹوٹتا ہے تو اس سے بے پناہ رنج و غم پیدا ہوتا ہے۔ یہ رنج و غم، ڈپریشن اور اداسیاں پیدا کرتا ہے۔ اداسیوں کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے مذہب یا اللہ کے سوا کوئی کام نہیں آتا، کچھ کام نہیں آتا۔

محبت پر غفلت کا غلبہ

میرا نہیں خیال کہ آپ اللہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ آپ کے ختم ہونے کے بعد قبر کے دہانے پر جو سوال آپ سے پوچھا جائے گا، وہ آپ کے معمولاتِ زندگی سے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ وہ پوچھا ہی ترجیح اول کے بارے میں جائے گا۔ من ربک؟ تمہارا رب کون ہے؟ اس سوال کا جواب تب تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک ترجیحات کا تعین نہ کیا گیا ہو۔ دماغ کی عادت ہے کہ وہ جس چیز سے زیر بار ہو گا، وہی جواب دے گا۔ جب آپ قبر کے دہانے پہنچیں گے اور آپ نے خدا کے بارے میں نہیں سوچا ہوا اور بچوں کی یا خوف کی زیادہ فکر کی ہے تو آپ کا جواب وہی نکلے گا، یہ ایک نفسیاتی قانون ہے۔ کسی نفسیاتی مریض کو جو مرضی ہے، کہہ کے دیکھ لو، وہ ''جن'' کا ہی شور مچاتا ہے۔

وقت کیا ہے؟

میں نے بلاشبہ زمان و مکاں کے بہت سارے پہلوؤں پر غور کیا۔ میرے نزدیک زمانہ ایک حد بندی ہے جس میں مختلف حادثات و واقعات اس طرح پابند کیے گئے ہیں کہ وہ آپس میں رگڑ نہ کھائیں۔ اس وقت زمان و مکاں پر جتنے بھی نظریات دنیا میں موجود ہیں، ان میں زمانے کو لامحدود قرار دیا گیا ہے یا لازماں قرار دیا گیا ہے، جبکہ مذہبی طور پر زمانہ بھی چیزوں اور وقت کے تعین کے لیے خدا کا ایک آلہ ہے۔ اس کو قطعی لاانتہا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مقابلے میں دنیا بھر کا فلسفہ وقت کو لامحدود خیال کرتا ہے۔ ہمارے مذہبی نقطۂ نظر سے وقت محدود ہے۔ اگر ہم اپنی زمین اور کائنات کی حدود سے دیکھیں، تو وقت محدود ہے۔ وقت دراصل چیزوں کی پہچان ہے۔ باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے پہچانی جاتی ہے۔ پہچان عمروں سے ہوتی ہے۔ عربی محاورے کے مطابق **الوقت سیف قاطع** کہ وقت کاٹتی ہوئی تلوار ہے۔ یہ چیزوں کو چیزوں سے جدا کرتی ہے۔ زمانوں کو زمانوں سے اور انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا گنبدِ بے در ہے جس میں ہونے والے ہنگامے کی خبر باہر نہیں جاتی۔

اگر ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر ساری چیزیں بند کر دی جائیں اور ان میں بے ترتیبی ہو، تو ان میں سے گذرنے والا ہر وقت ٹھوکریں کھائے گا۔ سو زمانہ اشیاء کو بکھیرتا ہے۔ دور لے جاتا ہے اور ان کی حرکت کو رگڑ کو کم کرتا ہے۔ جس کو ہم زمانہ کہتے ہیں، وہ اللہ کی داخلی سجاوٹی سکیم ہے۔ کوئی چیز بے ترتیب نہ ہو۔ کوئی چیز رفتار میں کسی سے نہ ٹکرائے، مگر زمانہ بہر حال خدا کی

نظر میں ایک محدود عنصر ہے۔ اسے لامحدود نہیں کہہ سکتے۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے جہاں بھی زندگی کے خاتمے کے حوالے سے کل کل من علیھا فان کی بات کی ہے، ستاروں کی گردش، کائناتی پھیلاؤ اور اس کے رکنے کی بات کہی ہے، وہاں ایک جملہ ضرور استعمال ہوا ہے، الا اجل مسمی ایک مقررہ وقت تک۔ اب اس مقررہ وقت سے آگے وقت ہے کہ نہیں ہے، کوئی آدمی نہیں جانتا۔

مثال کے طور پر ایک شخص بین الکائناتی فاصلوں، دور زماں اور بے پناہ وسعتوں کو دیکھ کر جو اسے نظر آ رہی ہیں، یہ سمجھتا ہے کہ وقت لامحدود ہے۔ اس کا ایسا سمجھنا بجا ہے کہ اس کی جمع و تفریق اور حساب و کتاب میں ارب ہا ارب سال کی گلیکسیز کی زندگی کا وقت ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔ مگر جیسے خدا نے مکاں کی مدت رکھی ہے، قرآن میں والسخر شمس و القمر و النجوم مسخرات با امر، چاند، ستاروں کے مناظر کا ذکر کیا ہے، وہاں ایک بات ساتھ ضرور کہی ہے، الا اجل مسما، ایک وقت مقررہ تک کہ انہیں ایک نصیب تک پہنچنا ہے۔

اب ظاہر ہے، اگر مکاں محدود ہے، تو وقت لامحدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ہم زماں کو مکاں سے علیحدہ کرتے ہیں، تو زمانہ بے معنی تسلسل کا نام ہو کر رہ جاتا ہے۔ تمام زمانے کی قدر قیمت اس مکاں سے ملحق ہے، جو اس کے وجود میں جگہ جگہ داغ کی طرح لگا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے، جیسے آسمان سیاہ چادر کی طرح ہو اور اس پر ستارے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح لگے ہوں۔ کانچ کے ٹکڑے نہ ہوں، تو آسمان بے قدر و نامعلوم رہے گا۔ اسی طرح زمانہ اس چادر کی طرح ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ مختلف کائناتی بصیرتوں کے ٹکڑے لگا دیے ہیں۔ مکاں کی نشاندہی کے بغیر زمانہ از خود متعین نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی سمت ہے اور یہ اکٹھے رہنے والے ہیں۔ وقت بھی مقرر ہے، وہ بھی محدود ہے اور خدا ان محدود چیزوں سے ورا ایسا تحریک وجود اور تسلسل ہے کہ جس کے قریب تر کسی محدود ہونے کا عمل نہیں آ سکتا۔ خدا کے بعد شاید ایک چیز جو اپنے لامحدود ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے، وہ انسان ہے۔

زمان و مکاں کی تخلیق

ہوکنس نے بھی کہا تھا کہ مجھے ایک لمحے کے لیے پتہ چل جائے کہ بگ بینگ سے پہلے

کیا ہوا تھا، تو ہم ہر چیز کی تفسیر دے سکتے ہیں۔ زمان و مکاں کا جوڑ پیدا کرنے کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ پہلے تخلیق کا تصور پیدا ہوا۔ اس تصور کے بغیر زمانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ساری کائنات پر زمانہ محیط رہے اور اس پر غور و فکر کرنے والا کوئی نہ ہو، تو پھر زمانہ بے سود تصور ہے۔ حقیقی وجود اس وقت وجود پاتا ہے جب اس کی تیسری بڑی جہت پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑی جہت (Dimension) جو زمان و مکاں کو وجود دیتی ہے، وہ انسانی ذہن ہے۔ اس حکم پروردگار سے جو ہم میں جاری و ساری ہے، ہم اشیا کو تشخص دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زمان و مکاں بذات خود وجود نہ رکھتے ہوں، مگر ہمارے ذہن میں مبدیات اس کو وجود عطا کرتے ہیں۔ جو وقت ضائع ہو جائے، وہ بھی وقت ہے۔ یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ جو وقت ضائع ہو گیا وہ وقت نہیں تھا۔ یہ تو ہم اپنے محاورے اور اپنے انداز زمانہ کو مختلف رنگ اور مختلف نقوش دیتے رہتے ہیں۔

رواں زمانہ اللہ تعالیٰ نے کسی خارجی مقام کے لیے نہیں پیدا کیا، یہ انسانوں کی تربیت کے لیے ہے۔ جیسے ایک بچہ نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نو ماہ بعد ہی کیوں؟ زمانہ کوئی غیر معمولی شے نہیں۔ یہ صرف ایک کاٹنے والی قینچی ہے، جو چیزوں کو چیزوں سے علیحدہ کرتی ہے۔ خدا جب چاہے زمانے کی نوعیت بدل سکتا ہے۔ جب چاہے بادل برسنا بند ہو سکتے ہیں۔ زرخیزیاں بند ہو سکتی ہیں۔ بچے لیٹ ہو سکتے ہیں۔ یہ مقامات اور افراد کو چلانے کے لیے خدا کا خصوصی ارادہ ہے اور اس کو جاننے والا صرف انسان ہے۔

یہ زمان و مکاں اور ذہن انسان تینوں ابعاد اکٹھے ہیں۔ زمان و مکاں کے وجود کو متشخص کرنے والا صرف انسان ہے۔ ورنہ بڑے بڑے زمان و مکاں بالائے کائنات جاری ہیں۔ ان کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ دوسری کائناتوں میں کوئی انسان نہیں ہے۔ اس لیے ان کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ ہمارا کیا وقت، کیا زمانہ اور کیا مکاں ہے۔ ہم یہاں بیٹھے اپنی کائنات کی عمر کا تعین کرتے ہیں کہ پندرہ بلین سال گذر گئے مگر ان پندرہ بلین سال کے عرصے میں کسی اور جگہ کوئی اور ستارہ سوائے زمین کے محقق نہیں ہو پایا۔ چنانچہ سب سے بڑی جہت جو زمان و مکاں پر حکومت کرتی ہے، وہ ذہن انسان ہے۔ یہ سب سے بڑی جہت ہے۔ اس کے بغیر زمین و آسماں اور زمان و مکاں کا کوئی تشخص نہیں۔

چھ دنوں میں پیدائش

وھوالذی خلق السموات والارض ستتہ ایام و کان عرشہ علی المالیبلوکم ایکم احسن عملا (سورہ ھود. ٦)

(اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ تا کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سب سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے)

یہ بڑی آسان اور خوبصورت آیت ہے۔ اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں نے چھ دنوں میں آپ کی یہ کہکشاں بنائی ہے۔ سائنسی انداز سے اس میں وضاحت کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ ہر چیز کا معیارِ وقت ذرا جدا جدا ہے۔ کائنات کی تعمیر میں خدا کا ایک دن کم و بیش ایک ارب سال کا ہے۔ ایک ارب سال انسانوں کا اندازہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ۴ یا ۵ ارب سال کے عرصے میں زمین بنی ہے، تو تمام کہکشاؤں کے بننے کا مجموعی عرصہ تقریباً چھ بلین سال ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں ہماری دنیا اور کائنات کو تشکیل کیا۔ یہ خدا کا وقت نہیں ہے۔ خدا کا تعمیری وقت تمثیل میں ایک بلین سال برابر ایک دن ہے۔

اس کے مقابلے میں حیاتِ دنیا کا وقت اس نے ایک دن برابر ایک ہزار سال رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے حضورؐ کی حدیث مبارک کے مطابق ہماری زمین کا آدھا دن اللہ کے نزدیک پانچ سو سال ہے۔ یہ سب کچھ بنانے کے بعد اس نے کہا، میں تمہیں سمجھاؤں کہ میں نے یہ سارا کھیل کیوں کیا ہے؟ تا کہ میں دیکھ سکوں، تم اچھے عمل کرتے ہو کہ نہیں۔ اس میں زمین کے بنانے کا بنیادی مقصد زیرِ بحث آیا مستقراً و متاع الی حین ایک کیمپ جس میں ایک مخلوق کو زندگی دوں گا۔ یہ حیاتیات کا پہلا فلسفہ ہے۔ عرش پانی پر ہونے کا مطلب ہے کہ تمام تخلیقاتِ حیات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ پھر اس سلسلے کو آگے بڑھایا گیا۔ صدیوں کے فاصلے دیئے گئے۔ ترقی دی گئی اور ترقی دینے کے بعد انسان کو بہتر کیا گیا۔ انسان سے آدم نے ظہور کیا۔ تب سے آدم کے اعمال زیرِ غور ہیں۔

سو خدا کی تمام ٹائمنگ اس حرکت کے لحاظ سے دیکھنی پڑتی ہے، جس لحاظ سے ہماری عقل اور ہمارے ترقی کردا علوم اس کے اصل ماخذ بتاتے ہیں۔ یہ بڑی واضح اور خوبصورت آیت

ہے۔ اس میں دو بڑی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ زندگی کے ماخذ کو پانی سے ثابت کرتی ہے۔ دوسرا تخلیق کے مقصد کو واضح کرتی ہے۔ اسی کی حمایت میں سورہ دہر ہے کہ بڑی مدت انسان زمانوں میں ایسے رہا کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ پھر میں نے زندگی کو سنگل نطفے کی بجائے دوہرے نطفے سے بنانا شروع کیا۔ پھر جب نطفہ دوہرا ہو گیا، تو اس میں ابھی عقل و شعور کی کوئی رمق نہ تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے اب پرکھ کے انداز میں ڈالوں، تو میں نے اس کو جینیاتی نظامات دینے شروع کر دیے۔ سماعت اور بصارت دی۔ لیکن یہ ابھی اس قابل کہاں تھا کہ یہ فیصلہ دے سکے، سن سکے یا جانچ پرکھ کر سکے۔ پھر میں نے اسے عقل و شعور بخشی۔ خاص طور پر دماغ عطا کیا۔ رہنمائی اور بخشش دی۔ کرم فرمایا اور کہا، چاہے تو مانے، چاہے تو میرا انکار کر دے۔

مگر یہ بڑا عجیب سا سٹائل ہے۔ انسانی عقل اور ذہانت میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے کہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ آزادی دی گئی ہے کہ چاہے تو مجھے مانے، اور چاہے تو میرا انکار کر دے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جاپان ایک سوزوکی بناتا ہے اس پر وزن، انداز اور اس کے فنکشن کے حوالے سے سب کچھ لکھا ہوتا ہے، لیکن جب وہ پاکستان میں چلتی ہے تو پاکستان میں اس کا اپنا ایک استعمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کا پتہ ہے کہ اس نے انسان بناتے ہوئے اس میں کیا عناصر رکھے۔

خدا کی طرف سے بات کرتے ہوئے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ رحمٰن و رحیم و کریم ہے۔ وہ بندے کے لیے کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے کبھی سوچا نہ ایسا سوچے گا۔ اس لیے اس نے کسی انسان کے مقدر کو جہنمی نہیں بنایا۔ ورنہ یہ دونوں آیات غلط ہو جائیں گی و کتب علیٰ نفسہ رحمتہ اس کی رحمت سے تھوڑی بہت چھڑیاں ضرور ماری جاتی ہیں اور بندہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پر یہ نہیں گمان کیا جا سکتا کہ جس کے حق میں رحمت لکھی ہو، اس کو عذاب الٰہی سے ضرور روشناس کیا جائے گا۔ اس طرح جب رسول اللہؐ کو وما ارسلنک الا رحمتہ للعالمین کہا، تو فرمایا کہ میں نے رحمت عالم کو زمین پر بھی بھیج دیا ہے۔ ایک تصوراتی اور ایک جسمانی ہے۔ دونوں صورتوں کے ہوتے ہوئے وہ انسان کی برائی نہیں چاہ سکتا۔

باقی رہ گئے اعمال، تو اس میں انسان کا کچھ حصہ ہے۔ اس کی مادی جبلتیں انقلاب انگیز ہیں۔ ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ انسان اگر لیبلو کم سے بچنا چاہے تو

اسے علم کی ضرورت ہے۔

زمانۂ آخرت

ہر چیز کے درجات مقرر ہیں۔ جس طرح یہ زندگی ایک بھنچی ہوئی زندگی ہے۔ اس سے ذرا باہر جاتے ہیں، تو آپ کے پاس کھربوں سال کا عرصہ کم پڑ جاتا ہے۔ اس زندگی میں ہم ساٹھ برس کا عرصہ پورا کر کے چلتے ہیں۔ پیدا ہوئے، کھائے پیے، شادیاں ہوئیں۔ بچے ہوئے، مکان بنائے، نوکری کی، یہاں تک کہ موت تک پہنچ گئے۔ اس پر اپنے آپ کو سمجھنے لگے کہ ہم نے معمول کی زندگی اور پیدائش سے موت تک کے تمام ضروری مراحل طے کر لیے مگر ایسا اوپر نہیں ہوتا۔ ایسا اوپر اس لیے نہیں ہوتا کہ وہاں آپ کو ایک ستارے سے دوسرے تک جاتے جاتے ہو سکتا ہے پانچ لاکھ نوری سال صرف ہو جائیں۔ پندرہ لاکھ، ایک کھرب نوری سال لگ جائیں۔ اس میں آپ کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے اس زندگی کو ہم بھنچی ہوئی زندگی کہتے ہیں۔ یہاں ہر چیز قید کی گئی ہے۔ اسے دبایا گیا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور اوپر جائیں، تو آپ کا وزن ہے نہ آپ کا سٹیٹس۔ یہاں سے تھوڑی دور اوپر جائیں، تو آپ کا وزن ہے، نہ آپ کا سٹیٹس، خلا میں کچھ بھی نہیں ہے۔

زندگی کو مجبور کرنے، قائم رکھنے اور اسے ایک ضابطے کا شائل دینے کے لیے اس پر بے تحاشا بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ ان بندشوں کو ہم جبر کہتے ہیں۔ سورج کو ایک خاص مقام پر رکھنا جبر ہے۔ تاکہ اس فاصلے سے آگے نہ آئے، ورنہ انسان جل جائے گا۔ سورج ایک لاکھ میل پیچھے چلا جائے، تو انسان ٹھنڈک سے مر جائے گا۔ اسی طرح چاند کو اس حساب سے رکھا گیا ہے کہ وہ ٹکرا نہ جائے، زمین پر نہ گر جائے۔ اسی طرح ہمارے ارد گرد جیسے پہاڑ وغیرہ دیئے گئے، یہ سارے کے سارے توازن کے لیے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ زمین ہچکولے کھاتی ہوئی گڑیا کی طرح کہیں کائنات میں معدوم ہو جائے تاکہ یہ توازن کے ساتھ اور تواتر میں رہے۔

تمام کائنات کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمین پر ایک مصنوعی زندگی ہے۔ اصلی زندگی نہیں ہے۔ اصلی زندگی اگر وہاں جائے گی تو ہمیں اپنے وجود فانی سے نکلنا پڑے گا۔ ہم اس کے ساتھ اوپر نہیں جا سکتے۔ وہاں جانے کے لیے یہ وجود قطعی ناکافی ہے۔ اوپر جانے کے لیے ہمیں

یہ پیٹرن چھوڑنا پڑے گا جبکہ یہاں رہنے کے لیے اس وجود کی ضرورت ناگزیر ہے۔ چنانچہ ہم بھیجے ہوئے ہیں۔ جیسے حضورﷺ کی حدیث ہے کہ الدنیا سبحن المومن دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ ہے ہی قید خانہ۔ یہ سانس کا، پریشر کا قید خانہ ہے۔ کششِ ثقل کا پریشر ہم پر پڑ رہا ہے۔ ورنہ ہمارے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے۔ ذرا سا اوپر خلا میں آزاد رہتے۔ وہاں آپ پہاڑ ایک انگلی سے دھکیل سکتے ہیں۔ یہاں آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں بندشیں ہیں۔

فرض کیجیے، ہماری زندگی اتنی ہی طویل ہو، جتنی ہم چاہتے ہیں اور ہم خلا میں ہوں، تو خلا میں یہ سارے ڈھکوسلے کس قدر بیکار ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ہم بیس بیس من کی چٹان انگلیوں پر چلاتے ہوئے لا رہے ہوں، انہیں فکس کرنے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن اس سے مکان نہیں بن سکے گا کیونکہ مکان بنانے کے لیے ایک رگڑ، دباؤ اور ایسی کششِ ثقل چاہیے جو اسے دبا سکے۔ یہ صرف زمین پر ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی تمام زمینی زندگی ایک مصنوعی زندگی ہے اور اس کے ذہن کی آزمائش اور فیصلے کے لیے ہے۔ جب وہ اس آزمائش سے گذر جائے گا، تو اس سے یہ وجود چھین لیا جائے گا، جس کی بالائی گلیکسیز میں کوئی حیثیت نہیں۔

جنت میں وقت

میرے خیال میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے، موجودہ زندگی اکیڈمی کی تربیت ہے۔ جس طرح ہم فوج میں داخلے کے بعد پی ایم اے میں اڑھائی سال کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ طالب علم یہی محسوس کرتا ہے کہ بڑا کم وقت ہے۔ وہاں سے نکل کر اس کا تقرر پتہ نہیں کہاں ہوتا ہے۔ اسے کہاں کہاں بھیجا جاتا ہے۔ ہماری زندگی بھی بالکل اسی طرح ہے۔ ہم یہاں صرف منتخب ہو رہے ہیں اور ہماری تربیت ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار اللہ تبارک و تعالیٰ یہ کہتا ہے، مستقرا و متاع الی حین کہ کچھ دیر کا قیام ہے۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ دنیا کو اللہ میاں نے ہمیشہ کا امتحان بتایا ہے۔ وما الحیوۃ الدنیا الا لھو، وما الحیوۃ الدنیا الا قلیل، وما الحیوۃ الدنیا الا غرور جب ہم اپنے احساسات اور آزمائشوں کی دنیا سے نکل جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اختیارات کی دنیا واضح ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تین ابتدائی اور بڑے ناموں میں ایک مرید، ایک متکلم اور ایک قدیر

ہے۔ ایک میں وہ ارادہ کرتا ہے، ایک میں بھرپور عمل میں لانے کی طاقت رکھتا ہے اور ایک میں وہ کلام کرتا ہے کہ یہ کام ہو جائے۔ انسان مرید ضرور ہے وہ متکلم بھی ہے، مگر قدیر نہیں۔ اللہ نے انسان کو اپنی صفات پر بنایا ہے۔ تاہم طاقت اس سے چھین لی۔ اس کا ارادہ اور کلام رہنے دیا۔ اشیاء کو اپنے مطابق ڈھالنے کی قدرت اس سے لے لی۔ یہ اس لیے چھین لی کہ وہ کبھی آزاد نہیں تھا۔ اس سے پہلے شیطان کا تجربہ بتا چکا ہے کہ اس کی فطرت نہیں بدلی اور ہزاروں، لاکھوں سالوں کی عبادت کے باوجود جب اس کو ذرا سا اختیار ملا، تو اس نے مزید اختیارات کی ہوس کی۔ وہ تکبرات میں چلا گیا اور خدا کے خلاف بغاوت کی۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا، تاکہ وہ اسے پرکھ سکے۔ لبنلونکم، یہ لفظ قرآن میں بار بار پڑھیں گے۔ لیبلوکم، لنبکونکم۔ میں نے چاہا کہ آزما لوں۔ آزمانے کے لیے اس نے قدرت چھین لی اور بےبسی کی زندگی دے دی۔ اس کا دماغ بڑا کر دیا۔ سوچوں میں ترمیم کر دی۔ بڑی محنتیں دے دیں۔ اس کو ایک پوزیشن، ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی دے دی، لیکن اتنی آسانی سے نہیں۔ اس کو اپنے کام کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بہت پڑھنا پڑتا ہے اور بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس میں قدرت نہیں ہے کہ اشارہ دست سے کسی چیز کو جیسے چاہے ڈھال دے۔

لیکن جب آپ کوالیفائی کر جاتے ہیں، تو پھر آپ کو جو چیز جنت میں واپس ملتی ہے، وہ قدرت ہے۔ اب آپ بھی قدیر ہو گئے۔ آپ نے بھی چاہا کہ آپ کے منہ میں انگور آئیں، انگور خود بخود چلا آئے گا۔ آپ نے سوچا بھنا ہوا تیتر آئے، وہ آپ کے پاس آ جائے گا، سماعت اور بصارت کے ساتھ آپ کی تینوں چیزیں ایک میں یکجا ہو جائیں گی۔ آپ بھی قدیر ہو جائیں گے۔ جب آپ ایک دفعہ سمیع و بصیر و قدیر ہو جائیں گے، تو اب آپ خدا کے نائب ہیں۔ اب تخلیقات کا ذمہ آپ پر چلا گیا۔ آپ کو ایک چھوٹا سا گھر دے دیا جائے گا۔ یہ چھوٹا سا گھر اتنا بڑا ہے کہ وہ پانچ سو نوری سال کی مسافت کا گھر ہے۔ گویا ایک بہت بڑی گلیکسی آپ کو عطا کی گئی۔ اب آپ سے کہا جائے گا کہ جاؤ، جو کرنا ہے، جا کے کرو، بناؤ۔ Now you are second to none۔ میں اب تمہارے سے زیادہ مار پٹائی کرنے کا نہیں ہوں۔ اب اپنی تخلیقات کو خود کرو، گھر اور جائیداد بناؤ، اور اپنے مکان کو سنوارو۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے ایک دفعہ سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم پڑھا، اس نے جنت میں اپنے گھر میں ایک درخت لگایا، وہاں

تسبیح، اذکار، قوت اور جو کچھ ہمارے ذہن میں ہے، ایک ساتھ حرکت کر کے ایک نئی تخلیقات کا رستہ استوار کریں گے۔

آخرت کے مختلف قوانین

تجسس تو وہاں بھی رہ جائے گا، مگر اس میں انکار کا شائبہ اور شک وشبہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ شک وشبہ پیدا کرنے والا ثانوی نظام ختم ہو جائے گا۔ یعنی شیطان ختم ہو جائے گا۔ شیطان اکیلا فرد نہیں ہے۔ یہ ایک پورا شعبہ اور ایک بہت بڑا نظام ہے، جس کا وہ سربراہ ہے اور اس نظام کے ذریعے انسان کے جبلی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ یہ جبلتیں ختم ہو جائیں گی، صرف مثبت انگوارڑی رہ جائے گی۔ میرے خیال میں یہاں زمین پر جنت کے تصورات وہ شاید وہاں ایسے نہ ہوں بلکہ اگر کوئی حیرت ہوتی ہے، وہ جنت میں جانے کے بعد ہوگی۔ یہاں تو ہم نے کچھ کمال اللہ کا دیکھا ہی نہیں۔ یہ تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ جب ہم اگلی دنیاؤں کو جائیں گے، ایک بہت بڑی وسیع کائنات کا مطالعہ ہمارے پیش نظر ہوگا۔ وہاں ناشکری نہیں ہوگی۔ اس لیے اس کے لامحالہ بڑھنے کے امکانات بہت ہیں۔

میرے خیال میں اگلی تمام زندگی عبادت ہوگی۔ وہ عبادت، جس میں شاید اٹھنا بیٹھنا اتنا شامل نہ ہو مگر ذہن کی مکمل تائید، اللہ تعالیٰ سے ہر وقت رجوع اور محبت اور اس میں عمومی سرگرمی بھی اسی طرح جاری رہے گی۔ شک وشبہ اور رنج وغم نہیں رہے گا۔ آنسو بہیں گے، مگر وہ آنسو تشکر کے ہوں گے۔ خدا سے مزید علم حاصل کرنے کے ہوں گے۔ وہ ایسے آنسو نہیں ہوں گے، جو ہمیں کسی آرزو کی ناکامی پر ہوتے ہیں بلکہ شاید اس وقت بھی رو رو کے ہم اللہ سے مزید آگہی طلب کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی ذہنی ترقی نہیں رکے گی۔ زمین پر نہیں رکی، تو آسمانوں پر کیسے رکے گی۔

عہدِ میثاق، اتمامِ حجت

عہد مثاق کے وقت اللہ تعالی نے ہمیں سامنے کیا۔ عموی کیٹیگری میں تسلیم کرنے کی بات تھی۔ پہلی مرتبہ مخلوقات آنکھ کھول رہی تھی۔ اس کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ میثاق میں اللہ نے ان پر واضح کیا کہ میں نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم میری مخلوق ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہاں تم نے ہمیں پیدا کیا اور ہم تمہاری مخلوق ہیں۔ اتنی مختصر سی بات ہوئی۔ اب قیامت کے دن اس میثاق اور مخلوق کے اقرار میں اس کے لیے بھلائی ہے۔ یہ رحمت کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے شاید دوزخ کی عمر بھی متعین نہ ہو۔ ہوسکتا ہے اربوں سال گذرنے کے بعد میثاق کا وہ عہد ان کے کام آئے۔ کسی سطح پر تو انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ ہم تجھے مانتے ہیں۔ خالدین فیہا ابدا کے باوجود اللہ نے یہ تخصیص کی ہے کہ جب تک میں چاہوں یہ تو ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔ تاہم اہل دوزخ کے لیے بھی ایک کرم ہوسکتا ہے کہ ان کی وہ آگ ٹھنڈی یا کم ہو جائے اور ان کے وہ لباس کم بدلے جائیں۔ اگر وہ ستر مرتبہ دن میں لباس بدلتے ہیں، شاید اب پینتیس مرتبہ ہو جائیں۔ پھر ایک ہو جائے۔ یہ بھی ان کے لیے جنت ہوگی۔ میثاق کا ریلیف میرے خیال میں سب مخلوق کو ملے گا۔

عہد میثاق کا اثر ہماری جبلتوں میں چھپے کسی احساس کی صورت میں بھی موجود ہے۔ جیسے میں یہ کہوں کہ میں گھومتا پھرتا ہوں، مجھے کوئی شکل، کوئی بات یاد آ رہی ہے۔ مگر وہ کیا ہے، میں اس کو وضاحت سے بیان نہیں کرسکتا کہ بیچ میں اربوں سال گذر گئے۔ ممکن ہے پندرہ ارب سال گذر گئے ہوں اور میرے ذہن میں نقش موجود نہ ہو، لیکن جب میں خدا کا نام لیتا ہوں تو لگتا ہے یہ

نام میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ایسے لگتا ہے، جیسے اللہ ہمیشہ سے میرے اردگرد موجود رہا ہو۔ جب میں اللہ کی مخالفت کرتا ہوں، تو میں حقیقی اللہ کی مخالفت کر رہا ہوتا ہوں۔ اللہ کی محبت میں شاید ہمیں حقیقی اللہ کا تصور نہ آتا ہو۔ مگر جب کوئی خدا کی مخالفت کر رہا ہو ”او تہاڈا اللہ، تہاڈا ......“ تو ایسے لگتا ہے، وہ واقعی کسی اللہ کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہمارے شعور یا تحت الشعور کی گہرائیوں میں کہیں میثاق کا عہد موجود اور روشن باقی ہے۔ اس وقت بھی انسان کی سب سے بڑی حسرت اللہ کو دیکھنے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسانی دور کسی قسم کے خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔ چاہے کہیں پیغمبر نہ بھی پہنچے ہوں، کسی نہ کسی شکل میں انسان ماورائی قوت میں یقین رکھتا رہا ہے۔ یہ شاید میثاق ہی کا اثر ہے کہ فلسفہ عمرانیات کے مطابق خدا نہ بھی ہوتا، تو انسان خدا تخلیق کر لیتا۔ قانون اور استحکام کے لیے اس کے بغیر انسان ایک دوسرے کی بات مان ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسی اتھارٹی چاہیے، جس کا خوف اور اس کا اختیار اس پر مسلط ہو۔

زمانہ قدیم میں جب ایک شخص سرسراہٹ یا غیر مرئی بجلی کی گرج سنتا تھا، تو وہ کسی نہ کسی کو پکارنے کا جذبہ ضرور رکھتا ہوگا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی اسے اس آفت سے بچائے۔ پھر جب کوئی فرشتہ اترا ہوگا، یا اسے کہیں سے آواز آئی ہوگی، تو وہ کتنا خوش ہوا ہوگا۔ میرے خیال میں اللہ ہمیشہ انسان کی خوشی، اس کی حفاظت اور محبت کا باعث رہا ہے۔ آغاز میں وہ میرا بہت بڑا حفاظت کرنے والا تھا۔ وہ اب بھی میرا سب سے بڑا حفاظت کرنے والا ہے اور اس زمانہ زندگی سے گذر جانے کے بعد بھی مجھے اللہ سے بڑا دوست کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ یقیناً رحمٰن، رحیم اور کریم ہے۔

روح کا وجودِ لازوال

یہ کیا ظاہر نہیں کرتا کہ خدا جو بھی کہتا ہے، سچ کہتا ہے کہ وجود ادھر ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ لازوال نہیں ہے اور روح اپنے حساب کتاب کے لیے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے راستے بہت طویل اور کشادہ ہیں۔ وہ اربوں، کھربوں سال کی گلیکسیز کا سفر طے کر کے اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ یہ روح ایک وجود نہیں، جہنم اور جنت میں علیحدہ علیحدہ وجود پائے گی۔ یہ ایک قسم کی ماسٹر پروسیسنگ کی کلید (Key) ہے، جو جس مشین میں ڈال دو، چالو ہو جائے گی۔ اصل پروسیسنگ چپ تو روح ہے۔ مگر وجود کوئی بھی اس کو مل سکتا ہے۔ وجود اللہ کے لیے بنانا کوئی مشکل نہیں ہے۔

وہ بتدریج اس کو بناتا رہتا ہے اور پتہ نہیں، ایسے کتنے وجود ہمیں ملیں گے۔ جہنم میں اللہ عذاب کا عادی نہیں ہونے دے گا، ممکن ہے، اس کے لیے ہمیں ایک ہی دن میں ستر مرتبہ وجود دیا جائے۔

مسئلہ تناسخ یا آواگون

مسئلہ تناسخ کرما پر بنیاد رکھتا ہے۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ کرم جس کے اچھے نہ ہوں، اسے سات جنم زمین پر گذارنے پڑتے ہیں۔ اس کے بغیر اس کی مکتی نہ ہوگی۔ آواگون، تناسخ یا کرم یہ سب اکٹھے چلتے ہیں۔ جیسے کسی بندے نے اچھے کام کیے اور اس کی مکتی ہوگئی، وہ تناسخ سے نکل گیا۔ مگر دوسرا بندہ مثلاً بھگوان داس اچھے کام نہیں کرتا اس کو سزا کے طور پر اگلے جنم میں گدھے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب وہ گدھے کی طرح پھر رہا ہے۔ ہندو کے خیال میں یہ اس کی سزا ہے لیکن یہ سزا اس کی تب ہو، جب گدھے کو احساس ہو کہ یہ اس کی سزا ہے۔ فرض کریں، کسی شخص کو چمپیزی کی شکل میں لایا جاتا ہے۔ چمپیزی کا دماغ زیادہ سے زیادہ 750 سی سی کا ہے اور بندے کا برین 2000 سی سی کا۔ وہ اس کا کیسے احساس کرے گا کہ مجھے سزا کے طور پر چمپیزی بنایا گیا ہے۔ سزا احساس کے بغیر ہوتی نہیں ہے۔ اگر مجھے پتہ نہیں اور مجھے شعور ہی حاصل نہیں ہے کہ مجھے سزا ملی ہوئی ہے، تو سزا کس چیز کی؟

اس لیے یہ سارا سلسلہ تناسخ اور آواگون، جو کرما پر بنیاد رکھتا ہے، کبھی بھی Inherently اپنی صلاحیت پوری نہیں کرتا۔ اس میں تشنگی رہ جاتی ہے۔ چلیں کسی بے وقوف سی روح کو آپ نے سات مرتبہ اس اور کبھی اس جنم میں ڈالا۔ آپ جب کتا بنے، تو آپ نے بڑی وفاداری سے ثابت کیا کہ میں بڑا اچھا انسان ہوں۔ گدھے بنے، تو زیادہ بوجھ اٹھا کے اللہ کو قائل کرتا ہے کہ میں بڑا اچھا انسان تھا۔ پھر اللہ نے کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو بخش دو۔ یہ تصور سارے کا سارا احمقانہ سا لگتا ہے۔ تناسخ میں یہ نظریہ کہ ایک روح اس زمانے سے، اس زمانے میں آ گئی، اس کا قطعاً کوئی وجود عملی طور پر نہیں ملتا۔ یہ مثالیں ہمیں فلمی کہانیوں یا دوسرے قصے کہانیوں میں نظر آتی ہیں اور سراسر من گھڑت ہیں۔

پھر ایک آدمی پر کوئی خبط بھی سوار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں بہت سی باتیں پڑھتا ہوں۔ ہمارے جنرل (پرویز مشرف) صاحب کو یہ ہو گیا ہے کہ میں نے کمال اتاترک بنا

ہے۔ وہ کمال اتا ترک کی اوٹ پٹانگ حرکات کیے جائیں گے۔ بالفرض کسی فرد کو ایک ہندو اشوکا کے ساتھ عشق ہو گیا ہے۔ وہ اس کی ہر چیز پڑھ رہا ہے اور اس کا انداز اختیار کر رہا ہے۔ بالآخر ایک دن وہ اعلان کر دیتا ہے کہ اشوکا کی روح مجھ میں حلول کر گئی۔ بات تو ٹھیک ہو گئی کیونکہ ہم آہنگی ہو گئی۔ تاہم وہ روح تو نہیں ہو گی۔ مجھے گولڑہ شریف میں ایک شخص ملتے ہیں وہ ٹوپی اسی طرح پہنتے ہیں کہ دور سے پیر نصیر الدینؒ کی طرح لگتے ہیں۔ ایک اور شخص کو دیکھا، وہ بھی ایسے ہی لگتے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں امیر خسروؒ ملنے گئے۔ واپس آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ ٹوپی تھوڑی سی ٹیڑھی ہے اور وہ بڑا ناچ کود رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی ٹوپیاں ٹیڑھی کر لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے دلی نے ٹوپیاں ٹیڑھی کر لیں۔ فیشن ہی بن گیا۔ کسی نے پوچھا، یہ کیا خرافات ہے، ٹوپیاں کیوں ٹیڑھی ہو رہی ہیں؟ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ تو خسروؒ کی وجہ سے ہوا ہے۔ خسرو سے پوچھا، تم نے ٹوپی کیوں ٹیڑھی کر لی ہے۔ اس نے کہا

من قبلہ راست کردم
برطرف کج کلا ہے

میں نے تو اپنے شیخ کی وجہ سے ٹوپی ٹیڑھی کی۔ جب اتنی یکسانیت ہو جائے، تو عموی طور پر وہ روحی، بدنی، عملی اور روحانی مماثلت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ روحیں بار بار اور ایک ہی جسم میں دوبارہ نہیں آتیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اسی خیال کو بعد میں مجدد نے اپنے مکتوبات میں پیش کیا۔ مگر انہوں نے اسم کے لحاظ سے پیش کیا اور لکھا کہ جب کوئی لفظ اپنی پوری تکمیل نہیں پا سکا تھا، تو مجھ میں آ کے یہ تکمیل پایا اور میں مجدد الف ثانی یعنی ہزار سال کے بعد آیا۔ یہ دعویٰ بڑا نامعقول اور فضول لگتا ہے۔

آدم کی اصل

یہ بنیادی طور پر Fossils کی تاریخ ہے۔ یہ میں نے انتھروپالوجی کے حوالے سے بنائی ہے۔ میں نے پورے تھیسز میں یہ کوشش کی ہے کہ محمد رسول اللہؐ رومانوی، دانشورانہ اور سائنسی لحاظ سے بھی دنیا کے سب سے بہتر انسان ہیں۔ میں نے اسے اسی کروڑ سال پہلے کی تاریخ سے اخذ کر کے سب سے اولین تہذیبی ادوار تی دائرے میں لے آیا۔ پھر ان دائروں میں مذہب کی پیدائش اور

تعقل کی نمو کا ذکر کیا۔ جب سے عقل بڑھی ہے، خدا بڑھا ہے اور انسان کو خدا نے عقل دی ہی شناخت ذات کے لیے ہے۔ دانشورانہ استعداد کی سب سے بڑی خصوصیت ہی خدا کا جاننا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

باقی جو کچھ بھی ہم دنیا میں کرتے ہیں، وہ دوسرے درجے کی اہمیت کا کام ہے۔ یہ ہماری کم تر ترجیح ہے بلکہ میں مسلمانوں کے بارے میں ایک ایسے مقررہ قانون پر پہنچا ہوں، جس میں ابھی تک تغیر نہیں ہو رہا اور وہ بڑا سادہ سا قانون ہے۔ کم تر ترجیحات کو زیادہ اہمیت، جبکہ اولین ترجیح کو کم اہمیت دینا۔ جس قوم یا ملت سے اس کی اولین ترجیح چھن جاتی ہے، اس کے پروان چڑھنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔ پاکستان اور دنیائے اسلام میں اس وقت سب سے تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ ان کو اپنی اولین ترجیح کی کوئی پروا نہیں۔ ہم خدا سے خرافات میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ امت روایات میں کھو گئی ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سر کٹے مذہب کی پرستش کرتے ہیں۔ کسی دل میں خدا کی محبت اور اس کی ہمسائیگی کا جذبہ نہیں پیدا ہو رہا۔ ہم بڑے مذہبی لوگ ہیں، لیکن ہم اسی طرح کے مذہبی ہیں جیسے ہندو اپنے بتوں کی پوجا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے۔ مذہب میں زندگی، تحرک، طاقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہمارے تعلق کی منزل اول و آخر خدا خود ہو۔ میں نے مذہب کو اس سطح سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، جو خداوند کریم کا نقطۂ نظر ہو سکتا ہے۔

ابراہیمؑ کی بے پناہ قدر و منزلت اور محبت اس لیے ہے کہ وہ سب سے پہلے فلسفیانہ طریقۂ استدلال استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح آقا و رسولؐ کی سب سے بڑی صفات عالیہ میں سے ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بغیر علم اور دلیل کے بات نہیں کرتے۔ پورے کا پورا قرآن جدلیات ہے۔ یہ واحد کتاب ہے، جس کا کلمہ جدلیات سے شروع ہوتا ہے لا اله الا الله محمد رسول الله یعنی پہلے آپ کو ان چیزوں کا انکار کرنا ہے، جو خدا نہیں ہیں، اس کے بعد آپ کو خدا تک پہنچنا ہے۔

اسی طرح ہمارا قرآن کہتا ہے ادعو الی سبیل ربک بالحکمة کہ اللہ کی طرف عقل و دانش سے، حکمت سے بلاؤ۔ والموعظة الحسنة اور پھر مکالمات اچھے رکھو۔ تعلیم پر تیری سرداری ہو، گفتگو کرنے پر تیری کمان ہو تا کہ دو چیزیں مشترک ہو جائیں۔ ایک تو تیری

جدلیات پوری ہوجائیں۔ انداز گفتگو بہتر اور دلیل بہتر ہو۔ جب یہ بہتر ہوجائیں تو وجادلهم بالتی حی احسن تو اچھے طریقے سے ان سے مجادلہ و گفتگو کرو۔

یہ جدلیاتی انداز اللہ آپ کو بتا رہا ہے اس میں ان کوتاہ نظروں کی کیا گنجائش ہے؟ ان کا محاورہ اتنا فرسودہ ہے کہ جب میں ان کے منہ سے اللہ جل شانہ سنتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک چبایا ہوا جملہ ہے بس۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یعنی مذہبی لوگوں میں کوئی ذہنی جدلیاتی اختراع اور کوئی نفسی ترفع نہیں ہے۔ وہ اتنے ہی کند ذہن ہیں، جتنی کوئی اور چیز ہوسکتی ہے۔ میں خدا کے بارے میں سوچتا ہوں کہ وہ یقینی طور پر ان سے تنگ آچکا ہوگا۔ اتنے کم ذہن اور اتنے کم اختراع والے لوگ ہیں کہ خدا کے لیے بھی کوئی بہتر لفظ نہیں چن سکتے۔ وہی صدیوں کا خدا کے بارے میں پرانا محاورہ چلا آتا ہے۔ اشتہارات کی دنیا میں بدترین لوگ خدا بیچ رہے ہیں اور انتہائی برے انداز میں۔ باقی ساری چیزیں بک رہی ہیں۔ بس خدا کا تصور واحد ہے، جس پر زنگ لگ رہا ہے۔ منہ سے ایک لفظ نکالتے ہی ہیں، تو ہمیں خیال آتا ہے کہ خدا کے متعلق کچھ کہنے کا یہ بہت برا بیان ہے۔ محاورہ آگے بڑھ گیا ہے۔ انگریزی ہوگئی ہے۔ وقت جدید تر اور زمانہ کاسموپولیٹن ہوگیا ہے۔ شدتیں اور حدتیں بڑھ گئی ہیں۔ کائناتی محاورے، ٹیلی ویژن اور کیبلز آگئی ہیں، لیکن ہم ابھی تک مسجدوں کے لاؤڈ سپیکرز میں بیٹھے ہیں۔ یہ سوچ کا بہت برا طریقہ ہے۔

تخلیقِ آدم کا نظریہ

اس موضوع پر سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر اس کے لیے ذرا قرآن اچھی نظر سے پڑھنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم میں انسان کا الگ اور آدم کا علیحدہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ انسان کو خدا نے کہا، هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شی مذکورا. بلاشبہ قرن ہا قرن سے انسان زمانے میں ایسے رہا کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ پھر خدا نے کہا کہ وہ ایک سنگل سیل اور نفس واحد تھا۔ میں نے اس پر کرم کیا، ان خلقنا الانسان من نطفة امشاج. پھر میں نے اسے دوہرے سیل سے تخلیق کرنا شروع کیا۔ نطفه امشاج کر دیا۔ ابھی اس کے پاس سماعت اور بصارت نہیں تھی۔ لنبتلیه، پھر میں نے اس مخلوق کو آگے بڑھانا چاہا فجعلنهم سمیعا بصیرا پھر میں نے اس کو سماعت اور بصارت دی۔ اب بھی یہ اس قابل نہیں

تھا کہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا، تو پھر آخری مرحلہ زندگی میں انا ھدینا السبیل و اما شاکرو او ما کفورا. یہ تو ہے انسان۔

اب دوسری طرف قرآن حکیم نے ایک بہت بڑے ڈرامائی واقعہ کو بیان کیا۔ وہ آسمانوں پر اور جنت میں تھا۔ وہاں ایک آدم تخلیق ہوا۔ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اس کا روحانی پروٹو ٹائپ تیار کیا۔ اب جبکہ آدم کا صرف روحانی وجود تھا، جس کی ہڈی، گوشت نہ پوست تھی، اگر وہ اسے زمین پر بھیجنا چاہتا تو اسے رکھتا کہاں، اس کے لیے قدرتی طور پر ایک جسمانی وجود زمین پر تیار ہو رہا تھا، Homm hobilis, Home erectus اور ان دونوں کو جوڑا گیا۔ وہ تقسیم اب بھی انسان میں اسی طرح موجود ہے۔ بدن نیچے بنتا ہے اور روح اوپر سے آتی ہے اور وہ تین مہینے کے بعد اس میں ڈالی جاتی ہے۔ یہ مکس اپ پہلے مکس اپ کی طرح ہے۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلے مکس اپ میں ماں باپ نہیں تھے۔

پوری آیات قرآنی یہ ہے کہ جب آدمی نے سیب یا پھل جو کچھ بھی کھایا، تو ایک دم سے اس کی شہوات بدنیہ بیدار ہو گئیں۔ جنت کے اس ماحول میں، جو روحانی اور نفسیاتی ماحول تھا، روحانی وجود ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کو جلا وطن کیا جانا لازم تھا۔ اب یہ کس گھر میں جاتا؟ ایک روحانی وجود کو جانور نما مادی وجود چاہیے تھا۔ جب اسے نیچے بھیجا گیا، تو Dichotomy تخلیق ہو گئی۔ اس کا بدنی وجود اس کے لیے تیار تھا اور اسی کی طرف مذہب اور سائنس دونوں نشاندہی کرتے ہیں۔

سائنس یہ کہتی ہے کہ کسی کو معلوم نہیں، انسان نے کب سوچنا شروع کیا۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے، جو آج تک حل نہیں ہوا۔ اس کا حل وہ یہ نکالتے ہیں کہ جب انسان کا دماغ بالکل بے کار سطح پر تھا اور اس کا اور چمپینزی کا دماغ اکٹھے ترقی کر رہے تھے، تو ان کے خیال میں آگ کا ایک بڑا ہیولا اوپر سے آیا۔ ایک بہت بڑا شاک آسمانوں سے اس کے برین پر پڑا، جس سے اچانک اس کے دماغ کی مقدار بڑھ گئی۔ ایسے کسی آدمی کا وجود ہمیں آخری برفانی دور کے بعد تقریباً پندرہ بیس ہزار سال پہلے ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دم سے انسان نے سوچنا شروع کر دیا۔ آبادیاں بنانی شروع کر دیں اور اس نے بچوں کی حفاظت شروع کر دی، جو کہ پہلے ایسا نہیں تھا۔

یہ جو اوپر والا پروٹوٹائپ ہے، اس کو زمین پر اتارتے ہوئے اللہ نے فرمایا قلنا اھبطو بعضکم لبعض عدوا کہ نیچے جاؤ، تم اس جگہ رہنے کے قابل نہیں ہو۔ اب بھی ٹھیک وہی ہوتا ہے کہ روحی وجود اوپر سے اترتے ہیں اور بدنی وجود نیچے بنتے ہیں اور دونوں اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ مذہب اس سے بھی آگے جاتا ہے، جہاں تک سائنسز گئی ہیں۔ خدا نے انسانوں کی مثال چھوڑ کے جانوروں کی مثال دی ہے، وما من دابت فی الارض زمین پر ایسا کوئی جانور نہیں ہے و طائر یطیر بجنا حیہ اور فضاؤں میں ایسا کوئی پرندہ نہیں اڑتا، الا امم امثالکم، یہ بھی تمہاری طرح امتیں ہیں۔

ڈارون نے انسان کو صرف ایک امت ثابت کیا ہے۔ اس نے کوئی تھیوری نہیں دی۔ وضاحت کی ہے کہ انسان کیسے زمین پر تھا۔ اس نے اسے کلاسیفائیڈ کیا۔ خدا اس سے بہت پیچھے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام زندگی میں نے ایک سنگل سیل سے شروع کی ہے۔ پھر میں نے اسے ڈبل سیل کر دیا۔ ابھی تک ہمارے معدوں کے اندر وہ سنگل سیل کی زندگی Aneoba موجود ہے، جس سے خدا نے پروڈکشن چلائی ہے۔ اب حیرت کی بات، جس پر سائنس کو تعجب ہے، یہ ہے کہ چار بلین سال کوئی معمولی مدت نہیں ہے۔ اگر انسان نے ۷۰ سے ۸۰ ہزار سال کے عرصے میں یہ تبدیلی کی ہے تو باقی مخلوقات بھی تو ہمارے ساتھ زمین پر چلی آ رہی ہے مگر اس طویل عرصے میں زمینی زندگی میں ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کوئی چمپینزی بڑھ کے انسان کی طرح سوچنے والا نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ بالکل ہمارے ساتھ کی مخلوق ہے یا جو گوریلا آج سے دو ارب سال پہلے گوریلا تھا، وہ اب بھی گوریلا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ایک ہی جنس، جس میں تبدیلی آئی، وہ انسان ہے اور ان کی تبدیلی اس لیے آئی ہے کہ جو پہلا انسان تھا، وہ بھی ہدایت یافتہ تھا۔ کم از کم ۱۰ ہزار سال پہلے کے آثار، جو ہمیں عراق اور چین میں ملے ہیں، ان میں سب سے پہلی رسم، جس سے جدید دور کی آشنائی ہوئی ہے وہ موت کے بعد دعا اور پھول ہیں۔ انہیں معلوم تھا، وہ کیا کر رہے ہیں۔

زمین پر اولین سوسائٹی پریسٹ سوسائٹی (Priest Society) ہے، جس میں وہی بندہ پیغمبر ہے، وہی حکمران اور وہی ان کو زندگی کے معاملے میں گائیڈ کر رہا ہے۔ اندرونی طور پر ہدایت یافتہ انسان اور آدم میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ ایک پروٹوٹائپ جنت کا

اور دوسرا زمین کا ہے۔ جب خدا نے مناسب سمجھا، دونوں کو جمع کر دیا۔ یہ جمع کرنا بھی ہماری قید ہے۔ اسی لیے فرمایا، دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ وجود قید ہے، جس میں ہمیں قید کیا گیا ہے۔ یہ خاکی وجود نہیں تھا۔ اس میں بھی دو ارب سال کی پوری جبلتیں موجود تھیں۔ ان جبلتوں کو خدا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ بقا کی جبلتیں ہیں۔ آج بھی بقا کی جبلتیں سب سے زیادہ تنگ کرتی ہیں۔ ہماری شہوات ہماری بقا کی جبلتوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ عقل ہمیں بہت سے راستے اور تہذیب سکھاتی ہے۔ ہم میں موجود جانورانہ وجود، جو پیچھے سے ترقی کر رہا ہے، وہ ہمیں اب بھی جبلی راستے دکھاتا ہے۔

آدمؑ کی برتری

آپ کے پاس عمومی اہلیت، فرق کرنے اور سوچنے والی عقل ہے۔ جو قینچی کی طرح چلتی اور خیر و شر کو کاٹتی ہے۔ یہ عقل اچھے اور برے کی تمیز اور حق اور ناحق میں فرق کرتی ہے۔ یہ وہی امانت عقل و شعور ہے، جو اللہ نے تمام کائنات کی اہلیت والوں کو پیش کی تھی۔ سب انکار کر گئے اور ڈر گئے ...... وحمل الانسان انسان نے کہا، ایسی کیا بات ہے، میں اس امانت کو اٹھا لیتا ہوں۔ ٹاسک بہت چھوٹا سا ہے۔ خدا کو ماننا ہی تو ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ میں مان سکتا ہوں۔ خدا کہتا ہے اس نے غلطی کی، عجلت سے کام لیا۔ انہ کانا ظلوماً جھولا . یہ اپنی عقل کو بہت زیادہ اہمیت دے گیا۔ آج تک یہ حماقت انسان جاری ہے۔ اگر چند ایک لوگ نہ ہوتے، پیغمبروں کے بعد اولیاء اللہ تعالٰی العزیز، نیک نیت مسلمان اور مومن نہ ہوتے، تو شیطان کا دعویٰ مکمل ہوتا کہ واقعی انسان خلافت کے اہل نہیں تھا۔ خلافت ارضی تو ہے ہی کوئی نہیں۔ یہ تو ایک ٹیسٹ گراؤنڈ ہے۔ وہ بلین ہا بلین گلیکسیز، جو آسمانوں میں بکھری پڑی ہیں، جہاں سونے، چاندی، گھونگے اور موتی کے دریا بہہ رہے ہیں، کی امانت کی تیاری کے لیے انسان کو زمین پر بھیجنا مقصود تھا اور انسان بہت سارا فیل ہو گیا۔ مگر لیبارٹری کا معیار بھی بڑا کم ہے۔ رسول گرامی مرتبتؐ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا، جب تک اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی زمین پر موجود ہے، قیامت نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر سات ارب میں سے ایک شخص اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے تو وہ لیبارٹری اپنا کام کر رہی ہے۔

دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ عبوری کیمپ ہے اور اس میں مسافروں کو رکھا گیا، ٹیسٹ کیا گیا۔ ان کی صلاحیتیں پرکھی گئیں۔ عقل و معرفت دیکھی گئی۔ جانچی اور پرکھی گئی۔ کچھ لوگ کامیاب ہو گئے اور نعمت کو پا گئے۔ کچھ نے ترجیحات کا اندازہ نہ لگایا جب قبر کے دھانے پہنچے، تو ایک سوال کیا گیا کہ برخوردار آ گئے ہو، کھایا پیا، دنیا کی دولت سمیٹی، ہم نے زندگی کے ہر مقام پر آپ کو کوئی نہ کوئی سہولت مہیا فرمائی۔ اب یہ بتاؤ کہ جو خط تقسیم کرنا تھا، کر دیا؟ مــــن ربک؟ اب آپ نے جواب دینا ہے۔ جو طلب زندگی بھر آپ کے سر پر سوار رہی، وہی جواب منہ سے نکلے گا۔ خدا نہیں نکلے گا۔ ایسے وقت منہ سے لا الـــہ الا اللہ نہیں نکلے گا۔ اسی بات پر اللہ فیصلہ دے گا۔ قبر ایئر پورٹ اور گیٹ وے ہیں۔ گیٹ وے تو گلیکسیز۔ ادھر جنت کی گلیکسیز ادھر جلتے ہوئے جہنم نظر آ رہے ہیں۔ پاسپورٹ دیا گیا۔ سوال پوچھا گیا۔ لا الـــہ الا اللہ کارڈ ہے؟ وہاں بھی صاحبان حالی پر صاحب کرم نے تھوڑی سی گنجائش رکھی ہے۔ اگر اللہ کو بھلا دیا، تو محمد رسولؐ کو تو یاد رکھا ہو گا۔ دوسری سائیڈ کا سوال دے دیا۔ نوازشات حالی یہ ہوئی کہ مــــن ربک کے بارے میں کہا، چلو یار میں تو دور تھا نظر نہیں آتا تھا۔ محمدؐ تو تمہارے پاس ہیں۔ ان کو جانتے ہو، وہ کون تھے؟ یہ اس لیے کہا کہ جس کو محمد رسول اللہ یاد آ گیا، پہلا حصہ بھی یاد آ جائے گا۔ فوراً کہہ دے گا۔ لا اله الا الله محمد رسول الله.

آدھے دن کا اضافہ

ہم اس حدیث مبارک کے مطابق کہ شاید دنیا کی زندگی میں آدھ دن کا اضافہ ہو جائے، یعنی مزید پانچ سو برس، ہم ان پانچ سو برسوں سے گذر رہے ہیں۔ میں نے حضرت دانیالؑ کی بات نقل کی تھی کہ ایک دن اور ایک آدھا دن۔ حضرت دانیال کو دو ہزار برس تو گذر ہی گئے اور میرا خیال ہے ذرا اڑھائی سو برس آگے بھی چلے گئے ہیں۔ یہ آدھا دن گذر رہا ہے۔

یہ سوال کہ آیا ہماری دنیا اس صدی سے آگے جا رہی ہے، فضول سائیس ورک ہے۔

ویسے نوسٹرڈیمس نے اس کی تین ہزار سال مزید مدت لکھی ہے۔ بڑے حادثے اور ایک بڑی جنگ، جو بہت قریب ہے، کے بعد بھی دنیا ایک ہزار سال تک جئے گی۔ جیسے کہ میں نے کہا کہ ایک بندے تک جائے گی۔ اس کے بعد جب مکمل طور پر کفر والحاد اور انکار خداوند ہوگا، اس کے بعد لیبارٹری کے فنکشن کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ دنیا کا ٹائم پانچ سو برس ہے۔ وہ ایک بڑے حادثے تک نزول مسیحؑ و مہدی تک ہے۔ اس کے بعد قیام کا دور شروع ہو جائے گا۔

حدیث رسولؐ پر غور کریں کہ ایمان فائدہ نہیں دے گا، جب دجال کا خروج ہوگا دابۃ الارض ہوگا اور جب سورج مغرب سے نکلے گا یہ تین بڑی نشانیاں ہیں دجال کا خروج میرے نزدیک ہو چکا ہے۔ دابۃ الارض کی بھی اگلے پانچ سات برسوں میں توقع ہے۔ جس طرح یہ لوگ جینیٹکس میں لگے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی سائیکک قسم کی تبدیلی اور جانور کو انسانی ذہن

نصب کر دیں۔ وہ ایک دم سے نئی جبلت پا جائے۔ جانور کی اپنی سائیکک صلاحیتیں ہم سے زیادہ ہیں۔ گدھا شیطان اور مرغ فرشتے کو دیکھ لیتا ہے۔ اس میں انسانی جمٹ بھی داخل کر دی جائے، تو وہ بڑا عجیب و غریب ہی جانور بن جائے۔

پھر حضورؐ نے فرمایا کہ جانوروں سے انسان کلام کرے گا۔ ہو سکتا ہے اس قسم کے تجربات کسی جانور کو غیر معمولی صفات سے مزین کر دیں۔ چنانچہ دابۃ الارض کا وجود بڑا امکانی نظر آتا ہے۔ قیامت کی نشانیوں میں ترتیب دجال کی آمد، اس کے بعد عیسیٰؑ کا نزول، پھر دابۃ الارض اور آخر میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونے کا عمل ہے۔

صور اسرافیل کے پراسیس

یہ بھی سادہ سا عمل ہے۔ یہ ایک گونج ہے۔ اصل میں یہ تین گونجیں ہیں۔ پہلی گونج اس وقت ہے جب زمین رگڑ کھاتی ہوئی عدم توازن میں چلی جائے گی۔ پھر دوسرے مدار سے نکلنے کے وقت کی ہے، جو چالیس برس بعد ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سارا عمل مرئی ہوگا۔ پراسیس شروع ہوتے ہی اس کی آواز آنی شروع ہو جائے گی۔ انسانی کانوں میں ایک بڑی آواز آئے گی جبکہ تیسرے مرحلے میں مکمل دھماکہ ہو جائے گا۔

صور اسرافیل کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زمین کے مدار سے نکلنے کے پراسیس کو جو فرشتہ سپروائز کرتا ہے، وہ اسرافیل ہے۔ اس کے مدار سے نکلنے کی آواز Methodology ہے جو ہر صورت آئے گی۔ جیسے جب کوئی جہاز آواز کی رفتار کو توڑتا ہے تو کتنی خوفناک آواز ہوتی ہے۔ اسی طرح اس وقت زمین جہاز کی طرح ہوگی۔ جب یہ سورج کو بڑھتے ہوئے سکڑے گی اور انتہائی تیزی سے اوپر بڑھے گی تو پھر آپ سوچ لیں کہ کتنا خوفناک خلا میں دھماکہ ہوگا، جس میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا۔

شمسی نظام کی قیامت

پوری کائنات کی قیامت بالکل نہیں ہوگی، کیونکہ پوری کائنات کی قیامت کا ذکر اللہ قیامت کے باب میں نہیں کرتا۔ بلکہ بڑی وضاحت سے خدا کہتا ہے کہ تمہاری

Constellation ختم ہو جائے گی۔ سورج اور اس کے ساتھ کے ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ ان کے کیمیکل پراسسز اور جو ایٹم وہاں پھٹ رہے ہیں، ان کی توانائی ختم ہو جائے گی اور ویسے بھی زمین ایک ایسے معیار پر کھڑی ہے کہ ایک لاکھ میل ادھر ہو جائے، تو جل جائے اور ایک لاکھ میل ادھر ہو جائے تو منجمد ہو جائے چونکہ یہ انتہائی منضبط اور کھچے ہوئے توازن پر کھڑی ہے اس کو ویسے ہی ختم کرنا بڑا آسان ہے۔

یہ زمین تو ایک کیمپ ہے، کوئی کائنات نہیں ہے مستقراً و متاع الی حین یہ تھوڑی سی مدت، تھوڑا سا وقفہ اور تھوڑی سی حیات ہے۔ وہ پوری ہونے کے بعد خدا کہتا ہے کہ ہم زمین کو ایک نئی زمین سے بدل دیں گے اور زمین کو جب ایک نئی زمین سے بدلیں گے، تو ظاہر ہے وہ اس Constellation میں چپٹی ہوگی، جیسی توے کی روٹی ہوتی ہے۔ اس میں گہرائی نہیں ہوگی۔ وہ زمین جس پر حساب کتاب ہونا ہے، وہ بالکل اور زمین ہے۔ آپ نے جہاں جانا ہے، وہاں جانے کے لیے آپ نے یہ عبوری کیمپ چھوڑ ہی جانا ہے تو پھر آپ کو اس زمین و آسمان کی کیا پرواہ؟ جب دوسری جگہ جانا ہے تو ظاہر ہے دوسری جگہیں موجود ہوں گی، تو جائیں گے۔

بالائے کائنات کسی جگہ جنت موجود ہے اور سورج موجود ہے تو یہ ایک چھوٹا سا حادثہ ہے جو ایک چھوٹی سی جگہ پر ہے مگر ہمارے لیے قیامت ہے۔ اس کو اللہ نے زلزلہ کہا ہے۔ یہ ایک ٹھیک ہوگا، جس کے نتیجے میں ہماری زمین اپنا بیلنس کھو بیٹھے گی۔ زمین اور چاند مل جائیں گے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ خداوند کریم نے لفظ استعمال کیا ہے کہ زمین اور چاند آپس میں مل جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا جو کششِ ثقل کا داخلی نظام ہے وہ مقناطیسی کشش ختم ہو جائے گی اور جو طاقت اور کشش ہے، وہ ان کو کھینچ لے گی۔ جس طریقے سے چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں، اسی طرح وہ دوبارہ آپس میں مل جائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ ان کے توسط سے Constellation کی تباہی کے بعد اتنی بڑی زمین تیار ہو جائے، جس پر سارے لوگ کھڑے ہو سکیں۔ یہ کوئی اتنی بڑی قیامت نہیں ہے۔ قیامت تو ہمارے لیے ہے۔ اس قیامت کا خاص طور پر ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ انسان سے ماورا کوئی قیامت نہیں۔

باقی کائناتوں کی قیامت

قریباً قریباً جس کی تجمت ہو رہی ہے، اس کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ جو کمرہ امتحان میں ہے، اس کا وقت ختم ہو رہا ہے بلکہ خاوند کریم جب ایک لمحہ بے نیازی اور الصمد میں آئے گا، تو پوری کی پوری کائنات ختم کر دے گی۔ کل من علیھ فان یہ قانون اللہ ہے کل من علیھا فان کی جب نوبت آئے گی، تو پھر ساری کائناتیں ختم ہو جائیں گی۔ یہ مرحلہ ہمارے یوم حساب سے بعد کا لگتا ہے۔ اصولاً کہہ دیا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گی جب سب کچھ ختم ہو جائے گی، ہر چیز مر جائے گی، مجھے نہیں پتہ، حضورؐ نے فرمایا کہ جب دوبارہ اٹھایا جائے گا تو موسیٰ مجھ سے پہلے اٹھیں گے کہ بعد میں اٹھیں گے۔

یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ ہرین میں اس کو Asid کہتے ہیں۔ Dramatic asid ایک وقت ہوگا، جب اللہ تعالیٰ Dramatic asid میں جائے گا۔ اس کو ہم کہتے ہیں کہ ایک آدمی اکیلا ہو کے پورا ڈرامہ کر رہا ہے۔ اپنی بات کر رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا، وہ اس پورے ڈرامے سے اکیلا ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ کیا مجھے اس سب سلسلے کو مزید جاری رکھنا چاہیے؟ کیا مجھے اس کی ضرورت ہے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرے گا کہ کیا اسے مزید چلاتے رہنا چاہیے؟ چونکہ اللہ کے قول سے کسی کا سچا قول نہیں، تو میرے خیال میں واحد چیز جو نسل انسان، یا دنیا یا پوری کائنات کا دوبارہ اعادہ کرے گی، انہیں واپس لا سکتی ہے، تو وہ اللہ کا وعدہ ہے۔ جب خدا یہ کہے گا کہ میں نے یہ تو کہا تھا کہ کل من علیھا فان مگر ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میں دوبارہ بھی احیا پر قادر ہوں۔

لگتا ہے کہ ہر ذہین آدمی ایک وقت میں تنہا ہو جاتا ہے۔ وہ اکیلا سوچتا ہے۔ شاید خدا ایک ایسا حجاب تیار کرے گا، جس میں مخلوقات کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ وہ وقت ہے جب کوئی کائنات نہیں ہوگی۔ یہ وقت صرف اس کے ذہن میں آئے گا کہ بس بھئی بس۔ مثال کے طور پر میں بہت سی چیزیں سوچتا ہوں۔ عمارتیں بنا رہا ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ لوگ بھرتی کر رہا ہوں اور کرسی پر ذہن میں بہت کچھ لے کے بیٹھا ہوں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں آتا ہے کہ یہ کیا بکواس ہے۔ کن خرافات میں میں لگا ہوا ہوں۔ جونہی آپ اٹھتے ہو، ہر چیز جو آپ نے بنائی ہوتی

ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے۔

خدا کے بارے میں یہ ثنویت نہیں ہے۔ وہ جو سوچتا ہے، ہو رہا ہے۔ اس کی قدرت ساتھ ساتھ جاری ہے۔ پھر جس دن اس نے کہا، چھوڑو جی، بہت ہو گیا، بہت بنا لیا۔ اس دن سارا کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے ذہن میں یہ سارا کچھ ہے اور کہیں بھی نہیں ہے۔ سارا منصوبہ اس کے برین کا ہے۔ سارا اختتام اس کے برین میں ہے۔ ابھی تو بڑی منصوبہ بندی فرما رہے ہیں۔ وہ ابھی بھی تخلیق کر رہا ہو۔ مگر ہماری دنیا یا دوسری کوئی ہے، تو اس کا پلان کر کے ختم کر بیٹھا ہے۔ جنت اور دوزخ میں جانے کا اسے علم ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس نے جنت کی ان کے احوال دیکھتے ہوئے پہلے سے اوسط رکھی ہو گی کہ اس میں تیس چالیس فیصد آئیں گے یا زمانوں کے تغیر کے ساتھ پانچ فیصد مزید آئیں گے۔ اس نے کہا کہ تب تک میں دنیا سلامت رکھوں گا، جب تک ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ یہ ہے اس پوری دنیا کا معیار۔ نہیں ہے، تو نہیں ہے۔

یومِ حساب یکساں یا الگ

ہماری زمین کا یوم حساب ایک ہی دن ہے۔ باقیوں کے ساتھ نہیں۔ اگر اللہ میاں نے فیصلہ کر رکھا ہو کہ ایک دن ہی ساتوں زمینوں پر تباہی آنی ہے، تو وہ علیحدہ بات ہے۔ ہم یوم حساب لوکل یعنی ہمارا ہے۔ اس کا کوئی تعلق دوسری زمینوں سے نہیں۔ اس زمین پر اس کے مخاطب ہم ہیں۔ ہم نے ہی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے، اس لیے یہ ہمارا یوم حساب ہو گا۔ عین ممکن ہے کہ ایسے میں بھی جب کوئی جنت میں جا رہا ہو یا کوئی جہنم میں بھیجا جا رہا ہو، اللہ کی کوئی نئی مخلوق پل رہی ہو، بڑھ رہی ہو، حضورؐ کی حدیث مبارک ہے کہ جب سب کا حساب و کتاب ہو جائے گا۔ لوگ جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، تو پھر بھی جنت میں جگہ بچے گی۔ اللہ نئے لوگ پیدا کرے گا اور ان کا نئے سرے سے حساب کتاب ہو گا۔

سائنس اس سے اتفاق کر چکی ہے کہ ایک بگ بینگ نہیں ہوا۔ ایک سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے دوسرے بگ بینگ کی آواز بھی سن لی ہے۔ ابھی کم از کم سات بگ بینگ کی آوازیں آئی ہیں۔ سات کائناتوں کی وسعت میں سات زمینیں پل رہی ہیں۔ اسی لیے تو دوسری زمین مل نہیں رہی۔ اگر وہ اس کائنات کی زد میں ہو تو ملے، وہ تو دوسری کائنات

کے ورا ہے اور ان کے درمیان کی رکاوٹیں کون عبور کرے؟ کیا کسی کے بس کی بات ہے؟

دوزخ میں جلنے کا عمل

میں نے اس پر غور کیا ہے کہ یہ سیکنڈ Casting (ڈھلائی) ہے۔ اسے ایسے دیکھیں کہ ہم ایک چیز بناتے ہیں۔ وہ خراب نکلتی ہے، مگر ہم میٹریل ضائع نہیں ہونے دیتے۔ اسے دوبارہ بھٹی میں ڈال دیتے ہیں۔ دو چار چیزیں ایسی ہیں، جس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ ڈھلائی طویل عرصہ جاری رہے گی۔ اس سے پہلے بھی شاید ہم ارب ہا ارب سال کے عذابوں سے گذر کے انسان بنے ہیں۔ پھر اس پراڈکٹ میں نقص آ گیا۔ جہنم میں وہی لوگ جائیں گے، جو مکمل ناکام ہوں گے۔ باقی لوگ تھوڑی بہت کانٹ چھانٹ کے بعد باہر نکل آئیں گے۔ جیسے مسلمان ہیں۔ چھوٹی موٹی خطا معاف کی گئی، آگ میں رہے، عذاب و ثواب سے گذرے، اس لیے خدا نے کہا ہے کہ ان کو بخش دیا جائے گا۔

مگر بت پرستوں کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ ان کو سو مرتبہ بھی دنیا میں بھیجوں، تو پھر بھی وہ کافر ہی رہیں گے۔ وہ مکمل ناکام ہیں۔ مکمل ناکامی کے حوالے سے ایک بڑا سوال میں حل نہیں کر پایا کہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ اس کا جواب جزواً بھی آتا ہے کہ یہ شاید ان لوگوں کی قدر افزائی کرنا مقصود ہے جو بخشش حاصل کر چکے ہوں گے۔ مثال کے طور پر مجھے اچھا بننا ہے اور میں کچھ دشواریوں سے گذر کر آیا ہوں، تو میرے راستے میں اللہ کا یہ انصاف حائل ہے کہ برے کو سزا ملے گی اور اچھے کو جزا ملے گی۔ وہ شاید اس لیے بھی جہنم میں جائیں گے کہ اچھوں کو پتہ لگے کہ خدا کا وعدہ سچ ہے۔ ان کو سزا ملنی چاہیے اور ملے گی۔ ورنہ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہو سکتا ہے، خدا نے انسانی Chip بناتے ہوئے روح میں اپنے ہی حکم سے لامحدودیت اور ہمیشہ کی زندگی رکھ دی ہو۔ اب وہ مر تو سکتے نہیں، زندگی ہمیں بھی عطا ہوئی، انہیں بھی عطا ہوئی۔ اچھے اور بروں سب کو دی گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ لامحدودیت کرہ ارض میں ودیعت ہے۔

یہ جہنم کا نقشہ بھی کوئی عجیب و غریب نہیں ہے۔ زمین کی سطح کے اوپر ہم بس رہے ہیں۔

اگر زمین کے اندر ارضیاتی سروے کو دیکھیں تو آپ کو بالکل جہنم ہی لگے گا۔ نیچے دریا بہہ رہے ہیں۔ زمین کی موٹائی اور اس پر پہاڑوں کی موٹائی 2.7 ہے۔ جس سیال پر پوری زمین کھڑی ہے اس کی موٹائی 3.5 ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اتنا بڑا سیال دریا نیچے چل رہا ہے، جس کی موٹائی 3.5 ہے جبکہ اوپر پہاڑوں کا حجم 2.7 ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نیچے بہنے والی سیال دھاتیں یا جو کچھ بھی زمین کے اندر بھڑکتے ہوئے الاؤ چل رہے ہیں، وہ اتنے گہرے، گاڑھے اور اتنے سست رفتار ہیں کہ ان کی موٹائی پہاڑوں سے بھی زیادہ ہے۔ صحیح نقشہ جہنم کا نظر آتا ہے۔ آگ، زلزلے اور زمین کی تہوں میں گیسز اور نمک کے پہاڑ ہیں اور وہ اس آگ میں بھی موجود ہیں۔ پتھر اس کا ایندھن ہیں۔ یہ گلیکسیز کرسٹ ہیں اور جنت کے بالکل نیچے کرۂ ارض کا جہنم ہے۔

قیام، جنت و دوزخ

فاما الذین شقو ففی النار لھم فیھا زفیر و شھیق خالدین فیھا مادامت السموات و الارض الا ماشآ ربک ان ربک فعال لمایرید و اماالذین سعدوا ففی الجنته خلدین فیھا مادامت السموات والارض الا ماشاء ربک عطا غیر مجذوذ

(جو بد بخت ہوں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں۔ الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے، جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی، جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ (سورۃ ہود، ۱۰۶،۱۰۸)

یہ آیت بہت سارے فلسفیوں کو اس شک میں ڈالتی ہے کہ بالآخر گناہ گار بخشے جائیں گے اور جنتیوں کی بشارت جنت ایک دن ختم ہو جائے گی، کیونکہ زمین و آسمان بالآخر کل من علیھا فان ہے۔ ظاہر ہے، جب یہ ختم ہوں گے، تو باقی افسانہ بھی ختم ہو جائے گا، مگر مجھے ایک بات بتایئے کہ ستر اسی برس ایک بندہ جی لے تو ساری دنیا اس سے تنگ آ جاتی ہے اور اگر آپ ستر کروڑ یا دو ارب سال

جئیں گے تو ظاہر ہے آپ کو زندگی اتنی اہم نہیں لگے کہ آپ اس کے تسلسل کی ہوس کریں۔

خدا کے دونوں وعدے بڑے واضح ہیں۔ اللہ نے دوزخیوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کو میں ستر مرتبہ بھی دنیا میں بھیجوں، تو یہ پھر بھی وہی حرکت اور ارتکاب جرم کریں گے۔ میرا انکار کریں گے۔ خدا ایک فیصلہ دے رہا ہے کہ یہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہ ناکام کیس ہیں۔ یہ انسانی جمعٹ کے ناکام کیس ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو کسی نہ کسی طرح پاس ہو گئے۔ انہوں نے جنت کے لیے کوالیفائی کر لیا۔ وہ جنت میں چلے گئے تو دعوۃ السموات ہو یا نہ ہو۔ دنیا رہے نہ رہے، جنتیوں کی مزید کرب و بلا کوئی نہیں۔ یہ فیصلہ کن عنصر ہے، چاہے اللہ یہ زمین و آسمان منسوخ بھی کر دے۔

اگر آج کا انسان نکل کے مریخ کو جانے کی کوشش کر رہا ہے تو مطلب کیا ہے کہ یہ زمین لوگ ہیں، جو مریخ میں آباد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ ایک نہ ایک دن زمین تباہ ہو جائے گی۔ خدا نے تو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ زمین تباہ ہوگی۔ سورج گدلا پڑ جائے گا۔ ستارے بجھ جائیں گے۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے۔ قرآن کے اپنے پراسس میں یہ ہے کہ ایک چیز کے تباہ ہونے سے دوسری چیز کی تعمیر نو نہیں رکتی۔ ممکن ہے، کائنات کے اس پورے نظام کی ضرورت ہمیں جنت میں جانے کے فوراً بعد ہی نہ رہے۔ یہاں سے وہ آسمان اور گلیکسیز نظر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موت کے بعد ہمیں اس قسم کی تفہیم کی ضرورت نہ رہے اور ہم ایسی کائناتوں کا رخ کریں، جن میں اس کائنات کے تخلیقی وجود کی کوئی وجہ باقی نہ رہ جائے۔ ہو سکتا ہے، یہ کم صلاحیت کی کائنات ہو اور کسی ایسی جگہ آپ جائیں، جہاں آپ محض تصور سے ہر چیز تخلیق کر رہے ہوں۔ ممکن ہے، جب یہ کائنات ختم ہو جائے تو انسان اتنا تربیت یافتہ ہو جائے کہ وہ اپنی کائناتیں خود تعمیر کرے۔ کیونکہ انسان بھی مرید ہے ارادہ کرتا ہے۔ قدیر ہے قدرت رکھتا ہے اور متکلم ہے کلام کرتا ہے خدائی صفات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور ایک وقت ضرور آ جائے کہ جنتی اپنے اردگرد نئی کائناتوں کی تخلیق کی پروا نہ کریں۔ ہو سکتا ہے، آنے والی دنیاؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے خدا ہوں۔

دوزخ کی بات چل رہی ہے۔ چونکہ اللہ رحمت کا وعدہ تخلیق کے لیے کر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ دوزخیوں کو پچاس کروڑ، دو چار بلین سال کے بعد جہنم کی آگ سے نجات دے دے۔ ہم

نے یہی دیکھا ہے کہ ہر کہیں جلتا ہوا ستارہ دو چار ارب سال میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے بھی یہی رحمت اور کرم کی گنجائش ہے کہ دس پندرہ بیس ارب سال بعد وہ آگ ٹھنڈی ہونی شروع ہو جائے اور ان کو کسی قسم کا ریلیف مل جائے۔ یہ بھی اللہ کے کرم اور رحمت کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ وہ اس کے مستحق قرار نہیں پاتے۔

قرآن ہمیشہ کثیر کائناتی تصور دے رہا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں ایک دنیا یا ایک کائنات بنا کے تھک گیا ہوں۔ وہ کہتا ہے، میں ہر روز نئی تخلیقات کے عالم میں ہوتا ہوں۔ وہ جینیئس ہے۔ یہی بات اللہ کی بہت پسندیدہ ہے۔ وہ یورپی امور یہواہ کا خدا نہیں ہے۔ یہودیوں کا خدا یا وہ ایسا گاڈ نہیں ہے، جو نیچے کوئی بیٹا پال رہا ہے۔ وہ اسلام کا اللہ ہے، وہ اللہ، جس کی صفات سے قرآن بھرا پڑا ہے، جس کی طاقتوں کا شمار، جس کے انداز فکر کے مناسبت سے ہم لوگ صرف ذہنی طور پر اس کی عبادت کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ محسوس ہونا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں یہ فخر بخشا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم کائنات میں اتنے بڑے دانشور سے وابستہ ہیں، جو تخلیق اور تعمیر نو میں اکیلا ہے جو حیات و موت پر قادر ہے، حی و قیوم اور رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ سب انسان کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ بجائے اس کے کہ لوگ خدا کے وجود پر سوچیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ڈیٹا نہیں ہے، ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ اس کی موجودگی کا تعین کریں مگر جب ہم جان لیں کہ وہ ہے تو ہمارے پاس کسی چیز، کسی شخص یا کسی سسٹم کی پیروی کی دلیل نہیں رہ جاتی۔

جنت میں کوالیفائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عنصر خارج ہو گیا، جو خدا سے مزاحمت کا عنصر ہے۔ اب اگر نفس کی وہ کیفیت ہی نہیں ہے تو پھر خدا لوگوں کو تباہ و برباد کیوں کرے گا؟ جو اس میں اتنا یقین رکھتے ہیں، انہیں دوبارہ کسی امتحان سے نہیں گذرنا ہوگا۔ ہاں عقل کے امتحان ہو سکتے ہیں، کیونکہ خدا نے کہا ہے نرفع درجات من نشا وفوق کل ذی علیم

کل من علیها فان

اللہ کا بنیادی قانون ہے کہ وہ جب کل کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ ایک کیٹیگری پر محیط ہوتا ہے۔ مثلاً کل نفس ذائقه الموت کا لفظ استعمال ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر ذی حیات کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہر وہ چیز، جس میں کیفیت نفس موجود ہے، اس کو موت آنی ہے۔

موت کے پیٹرن جدا ہیں۔ جیسے ایک درخت مرتا ہے، ایک انسان مرتا ہے، ایک کیڑا مرتا ہے مگر ہر حیات کو موت آنی ہے۔ نفسِ حیات سے معتبر ہوتا ہے اور ہر حیات کو موت آنی ہے مگر جب خدا قیامت کا ذکر کرتا ہے، تو وہ تخصیص کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ وہ قیامت نہیں ہے، جس کو کل من علیہا فان کہتے ہیں۔ یہاں لفظ فنا ہے۔ اس کا مطلب ہے، ہر وہ غیر اللہ شے، جو خدا سے باہر تخلیق کی گئی ہے، وہ تمام کائناتوں پر حاوی ہے۔ وہ ایک ذہنی کیفیت ہے، جس میں اللہ بیٹھے بیٹھے کہے کہ میں ان میں سے کسی کو نہیں رکھنا چاہتا اور وہ وہاں نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ، خیال اور اس کا لفظ اکٹھا چلتا ہے۔ وہ بیٹھ کر کہتا ہے I don't need any of these thing, and every thing will be lost. پھر کہتا ہے کہ چلو بیچ میں سے دو چار چیزیں دوبارہ پیدا کر لو۔

تو کل من علیہا فان کا لفظ قیامت پر لاگو نہیں ہوتا۔ وہ ایک لوکل چیز ہے جو ایک سولر سسٹم میں برپا ہوتی ہے۔ اس میں زمین کی تباہی ہے اور اس میں زیادہ سیارے بھی نہیں ٹوٹتے۔ اس میں صرف ہماری Constelation خراب ہوتی ہے۔ اذا الشمس کورت، سورج لپیٹ دیا جائے گا و اذا النجوم انکدرت اور ستارے گدلے پڑ جائیں گے۔ یہ صرف سورج اور اس کی Constellation کی موت ہے۔ ظاہر ہے زمین اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ یا انجمد کی حد تک سرد ہو جائے گی، یا کلی طور پر جل جائے گی۔ کششِ ثقل کے دائرے ختم ہو جائیں گے۔ چاند اور سورج پھر سے اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ ساری کی ساری لوکل صورتحال ہے۔ ان کا کائنات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگرچہ سورج کی توانائی کم از کم مزید دس ارب سال چل سکتی ہے، جبکہ ہماری زمینی زندگی کا عرصہ شاید ہزار سال سے زیادہ محیط نہ ہو۔ تو اس میں بھی امکان وہی ہے، جو اللہ قرآن میں دے چکا ہے۔ چاہے سورج دس ارب سال کے بعد ٹھنڈا ہو یا اس کے حکم سے ایک دن میں ٹھنڈا ہو جائے، اس کے علاوہ سائنسدانوں نے کسی گلیکسی یا اپنے سولر سسٹم کی تباہی کا کوئی اور امکان پیدا نہیں کیا۔ انہوں نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ کوئی بڑا حادثہ وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔

جیسے اللہ نے کہا کہ تم کس بات پہ ناز کرتے ہو، میں آسمانوں سے ایک بڑا پتھر پھینک دوں، تو تم سب ختم ہو جاؤ گے۔ یا کوئی سیارچہ کہیں سے آ کر ٹکرا جائے اور تمہاری دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ یا اللہ تعالیٰ اچانک اس چین ری ایکشن کو جو ہیلیم و ہائیڈروجن وغیرہ کا سورج میں جاری ہے، اسے ختم کر دے، ایٹم پھٹنے بند ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں اچانک ہر چیز یخ

بستہ ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں انسان اللہ کے ساتھ اتفاق کر رہا ہے کہ جو طریقہ تو نے تباہی کا بتایا ہے یہ بالکل درست ہے۔ زمین کششِ ثقل سے نکل جائے گی اور کھٹ سے چاند میں جا پڑے گی۔ چاند سورج سے جا ملے گا اور تمام Constallation ایک ہو جائے گی۔ شاید ہم کسی اور گلیکسی کا حصہ بن جائیں۔ زمین پھر زندہ کی جائے مگر نئی شکل میں اور اب یہ چپاتی کی طرح چپٹی ہو گی۔

غیب کا تصور

بالعموم لوگ غیب سے مراد ایک ہی مطلب لیتے ہیں کہ ایسی معلومات جو کسی اور کو نصیب نہ ہو، جس کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور جو خارق عادت ہو۔ اگر وہ اچانک کسی کو پیش کر دی جائے اور لوگوں میں حیرت اور چونکنے کا عمل پیدا ہو، تو اس کو غیب کہتے ہیں۔ مگر غیب انسانوں میں مقامی اور زمانوں کے اعتبار سے نسبتی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماضی کا ایک غیب آج کے دنوں میں شہود میں واقع ہو۔ کیونکہ جو انفارمیشن پہلے نصیب نہیں تھی، آج نصیب ہے۔ اسی طرح دو بندوں میں غیب و شہود کا بڑا فرق ہے۔ ایک شخص نے کسی چیز کا مطالعہ کیا ہوا اور وہ اس کے بارے میں انفارمیشن رکھتا ہو اور دوسرا جس کو یہ انفارمیشن نہ ہو، وہ غیب میں چلا جائے گا تو غیب و شہود کا تمام انداز مطالعاتی اور اطلاعاتی بنیاد پر ہے۔

پیغمبروں کا علمِ غیب

بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا پیغمبروں کو غیب کا علم حاصل تھا؟ پھر ایمان بالغیب کی ہے اور اسے کس طرح ہونا چاہیے؟ دراصل اللہ میاں نے پیغمبروں کو اپنے اور بندوں کے درمیان ایک گواہ کے طور پر کھڑا کیا ہے۔ پیغمبر کی صداقت کو پہلے اس لیے قائم کیا کہ جب لوگ کسی چیز پر اعتبار لانا چاہیں تو سب سے پہلے وہ پیغمبر پر اعتبار لائیں کہ یہ سچا شخص ہے۔ اس کی

زندگی میں کبھی جھوٹ ریکارڈ نہیں ہوا۔ اس کے بعد اگر پیغمبر وحی یا اللہ کی خبر دے گا، تو لوگوں کو اس کے غیب جاننے میں کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔

مگر وہاں بھی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور انہیں استغفر اللہ دروغ گو قرار دیا۔ اس وجہ سے پیغمبروں کو معجزات عطا کیے گئے۔ معجزہ ماضی میں ایک دلیل کی طرح تھا۔ ایسی دلیل کہ جس سے امر محال دنیا کے سامنے ممکن ہو جائے۔ مثلاً پانی دودھ ہو جائے، یا دودھ پانی ہو جائے، تو لوگ اس بات پر اعتبار لائیں گے کہ اگر یہ امر محال ممکن ہے تو وہ امر محال بھی ممکن ہے۔ فلسفہ معجزہ بطور دلیل اس معاشرے میں آیا ہے، جہاں علم کم اور وہم اور تشکیک زیادہ تھی۔ آج کل بھی لوگ معجزات طلب کرتے ہیں، اگرچہ علم بڑی وضاحت سے ہر چیز کو روشن کر چکا ہے۔ چنانچہ غیب بندوں کے درمیان ان کی معلومات کے تناسب کا فرق ہے۔ ایک شخص نے اگر پانچ ہزار کتاب پڑھی ہے اور دوسرے نے چھ ہزار پڑھی ہوئی ہے تو پانچ ہزار والا بندہ چھ ہزار والے بندے کے ساتھ پانچ ہزار کی حد تک تو شہود میں ہوگا مگر جہاں ایک قدم آگے چلا گیا، وہ غیب میں چلا جائے گا اور وہ شہود میں ہوگا۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم پیغمبر پر کوئی شبہ کر سکتے ہیں؟ پیغمبروں اور عمومی انسانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پیغمبروں کا ذریعہ اطلاعات صرف اور صرف اللہ ہوتا ہے۔ ہمارے حضورؐ سے یہ سختی اور بھی کی گئی کہ انہیں کسی بھی انفارمیشن سے، وہ اکیڈیمک ہے یا کوئی دوسری، کچھ بھی حاصل نہ کرنے دیا گیا اور یہ اس لیے کیا گیا تاکہ آپؐ اللہ سے جو کلام، وحی اور غیب حاصل کرنے والے تھے، اس پر کسی قسم کی ملاوٹ کا اشتباہ نہ رہے۔ اب اس امت کی نالائقی دیکھیے کہ جو اپنے پیغمبروں پر سوال کرتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا اس کو غیب کا علم تھا کہ نہیں؟

اگر سارے کا سارا غیب انفارمیشن ہی ہے اور بلاکڈ انفارمیشن ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کا ذریعہ کیا ہے؟ فرض کریں، ایک کے پاس آسمان میں اڑتا ہوا سیارہ ہے اور وہ زمین کو واچ کر رہا ہے اور جہاں بھی چاہتا ہے اپنے آلات کو مرکوز کرتا ہے یا آج کل کے غیر معمولی جاسوسی آلات ہیں۔ جیسے گھر کے باہر وین کھڑی ہے وہ گھر کے اندر کے نقشے بنا رہی ہے اور لوگوں کو چیک کر رہی ہے تو جس کے پاس جو ذرائع ہوتے ہیں وہ ان کی بنیاد پر زیادہ باخبر ہوتا ہے، لیکن جس کی معلومات کا سوائے خدا کے کوئی ذریعہ نہ ہو، اس کا غیب کا کیا مسئلہ ہوگا؟ پھر جب ایک امتی

یہ سوال کرتا ہے کہ نبی کو غیب حاصل ہے کہ نہیں، تو میرے خیال میں یہ بذاتہ کفر کے برابر ہے۔ یقیناً نبی کو غائب حاصل تھا۔ کیونکہ کائنات کا سب سے بڑا غیب صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے۔ نبی کو اللہ کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ اس کی اس سے بات چیت ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک انداز ہے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس شخص کے پاس کیا غیب ہونا چاہیے جس کو خدا کا علم یا وژن حاصل ہو یا خدا کی تصدیق حاصل ہو؟

یہ سوال بالعموم جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لفظ نبی کا مطلب ہی پرانے زمانے میں غیب کی خبر دینے والا تھا۔ بنی اسرائیل میں ایک ایک وقت میں بیسیوں پیغمبر ہوتے تھے۔ ان میں اور اصلی پیغمبر میں فرق اتنا ہوتا تھا کہ بھی غیب کی خبریں دیا کرتے تھے، جو اکثر کی جھوٹی نکلتی تھیں۔ صرف اصلی پیغمبر کی سچی نکلتی تھی۔ غیب کے بارے میں بہت ساری باتیں جو ہمارے اندر موجود ہیں، وہ صرف ضدی اور احمق مزاج کی پیداوار ہیں۔ ورنہ نبی ہوتا ہی غیب کے لیے ہے۔ جب نبی کہتا ہے کہ اللہ ہے، تو اللہ ہی غیب ہے اور نبی اس پر شہادت دے رہا ہوتا ہے۔

تمام پیغمبروں کو جزوی غیب عطا ہوتا رہا۔ کسی پیغمبر نے صرف اللہ کی آواز سنی۔ کسی نے جبرائیل مقدس کو دیکھا۔ کسی کے ہاں کسی ملائکہ کی آمورفت جاری رہی مگر چونکہ انسانیت کو اللہ نے یہ استحقاق بخشا تھا کہ کم از کم ایک شخص کی شہادت مطلقہ خدا کے وژن پر بھی ہو، اس لیے معراج والے دن یہ وژن دے کر باب بند کر دیا گیا اور حضور گرامی مرتبتؐ واحد وہ بندے ہیں، جو شاہد بھی ہیں اور نذیر بھی۔ جن کی وژنری شہادت بھی اللہ پر موجود ہے۔ وہی اللہ سے ڈرا سکتے ہیں اور وہی اللہ کی حتمی یقین کے ساتھ بات بھی بتا سکتے ہیں۔

غیب کے باوجود اضطراب

بالکل نہیں۔ یہی تو پیغمبروں کے تقویٰ کی مثال ہے، جو ہم لوگوں میں موجود نہیں ہے۔ مجھے اللہ کہہ دے کہ کل یہ ہوگا، تو میں تو بڑا پکا ہو جاؤں گا۔ بات کو فائنل کر دوں گا۔ بدر کے دن جب حضور دعائیں مانگ رہے تھے یا حی یا قیوم برحمتک استغیث تو سیدنا ابوبکر صدیقؓ ان کے شانوں پر چادر ڈالتے اور کہتے، یا رسول اللہؐ آپ کیوں اس طرح کرتے ہیں؟ جب اللہ نے آپ کو وعدہ دیا ہوا ہے، وہ حق ہے اور آپ سچے ہیں اور اللہ سچا ہے، تو آپ کیوں اس طرح کرتے

ہیں؟ اگر غور کیا جائے، تو پیغمبر کی خشیت کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ باوجود حتمی صداقت پر یقین ہونے کے ان کے دل سے خدا کا خوف نہیں جاتا۔ کیونکہ کوئی چیز کسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے انہیں اس کا علم نہیں ہے۔ جب تک یہ خشیت دل میں موجود نہ ہو، انسان کا تقویٰ پورا نہیں ہوتا۔

خداوند کی تدبیر سے کسی شخص کو بھی آزاد نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود کہ جو کچھ خدا کہتا ہے اس میں یقین کیا جائے۔ اگر پیغمبر ڈرتا ہے، تو اس سے بڑا اور کیا نشان ہو سکتا ہے کہ پیغمبر سب سے بڑا متقی ہوتا ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا پر بے اعتباری شو کر رہا ہوتا ہے یا خدا نے قیامت تک ان کو جو وعدے دیے ہوئے ہیں، ان پر بے اعتباری ہو رہی ہے۔ اگر بے اعتباری کی ایسی بات ہے تو اس امت کو شفاعت رسولؐ سے محروم ہو جانا چاہیے۔ یہ بھی تو خبر رسولؐ ہے کہ قیامت کے دن مجھے تین دفعہ کہا جائے گا اور تین دفعہ میں اپنی امت کو جہنم سے نکال کے لاؤں گا۔ یہ بخاری اور مسلم کی مصدقہ حدیثیں ہیں۔

اگر ان باتوں اور جو رسول اللہؐ کو مستقبل کے وژن نصیب تھے، پر اعتبار چھوڑ دیں، تو پھر مذہب تمام تر لوکل اور وقتی رہ جاتا ہے۔ مجھے پیغمبر کی آگے کیا ضرورت ہوگی، جو میں ان کی شفاعت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے کہے کے مطابق میں اپنے عذاب وثواب کے لیے ان کی دعا نہیں حاصل کر سکتا یا رسول اللہؐ کا کرم اور عنایت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے برعکس پیغمبر کی زمانہ آخر کے آخری مسلمان تک دعا، عنایت، وژن اور کرم جاتا ہے اور ان کی پیشین گوئی جاتی ہے۔ فرمایا، میں اچھی طرح جانتا ہوں، ان دس شاہ سواروں کے نام اور ان کے والدین کے پتے، جو اسرائیل کی جنگ کے لیے ان کا ہراول دستہ ہوں گے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی مسلمان کو اس میں کسی قسم کا شبہ کرنا چاہیے۔

ہوتا یہ ہے کہ پیغمبر کے لیے پوری دنیا کی باتوں کو ڈکٹیٹ کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ یہ بیٹھ کر کہہ دے کہ فلاں زمانے میں یہ گیسیں نکلیں گی یا فلاں ایجاد ہوں گی۔ یہ تناظر سے ہٹ کر بات ہوگی۔ بنیادی طور پر پیغمبر ایک کتاب پڑھانے آتا ہے۔ اس کا غیاب و شہود کا ایریا، کتاب اور اس کے قوانین کی حدود میں رہے گا۔ اسے مصری تہذیب یا کسی مستقبل کی تہذیب کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر پیغمبر اپنی کتاب پڑھاتا ہے، پوری کرتا ہے اور اپنی

امت کو دیتا ہے۔ اس کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا کہ وہ ساری دنیا کی خبریں دیتا پھرے۔ پیغمبر کوئی پیشین گوئیاں کرنے والا نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک استاد، گائیڈ اور خدا کی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والا ہوتا ہے۔ ہاں پیشین گوئیاں اس کے پیغام کا جزوی حصہ ہیں، جو اس سے منتقل ہوتی ہیں۔

غیب جاننے کے طریقے

جنات، موکلات اور اس قسم کی خرافات کی تصوف میں اجازت نہیں۔ بلکہ جو شخص بھی جن قابو کر رہا ہے، وہ ایک سفلی کام میں مصروف ہے کیونکہ ہر تسخیر کے کام میں ایک نشہ ہے۔ یعنی جذبہ تسخیر اور طاقت کا حصول۔ جبکہ صوفی طاقت کے حصول ہی کو رد کرتا ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو خالی کر رہا اور کسی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے اور اپنی ذات کی ہر اس خواہش کی تردید کر رہا ہوتا ہے جس میں کسی قسم کے تکبر اور قوت کا خیال بھرے۔

تصوف اور علم حاضرات کے اعمال میں بنیادی فرق ہے۔ یہ فرق دو بیانات سے واضح ہو جاتا ہے۔ تصوف میں Man concentrates in favour of God against his ower self (آدمی اپنی ذات کے خلاف خدا کے حق میں ارتکاز کر رہا ہوتا ہے) جبکہ باقی چیزوں میں Man concentrates in favour of self against God (آدمی اپنی ذات کے حق میں خدا کے خلاف ارتکاز کر رہا ہوتا ہے) تو جو چیز اپنی ذات کی تائید کرتی ہوئی محسوس ہو اسے ہم قطعاً کسی بھی مرتبے کا تصوف نہیں مان سکتے۔

اسی طرح میں نے سلسلہ عظیمیہ میں بزرگوں کو پڑھا۔ انہوں نے ایسے ہی بہت سارے پیچیدہ طریقے اپنائے ہوئے ہیں مگر عملی طور پر وہ سب غلط ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حوروں کا مراقبہ ہے جس میں آپ حوریں دیکھیں گے۔ اس کو آپ حدیث کے مقابلے میں رکھ کے دیکھیں، تو وہ لغو لگتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک حور اگر دنیا والوں کو دکھائی دے تو ساری دنیا کے بادشاہ آپس میں لڑ لڑ کے مر جائیں۔ اب جو شخص روز حوریں دیکھ رہا ہے اور اسے کچھ نہیں ہو رہا۔ یہ فرار کے طریقے ہیں۔ از خود آپ خیال کر رہے ہیں کہ آپ نے کوئی طاقت حاصل کر لی ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ استادوں کے پاس کوئی چمتکار ہوتے ہیں بلکہ جو

ہمارے پاس ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا کرتا ہے وہ ایک فرد پر نہیں، ہزاروں لاکھوں کروڑوں انسانوں پر یکساں قابلِ عمل ہے۔ فراستِ الہیہ سب کے لیے ہے۔ اس میں رات دن، صبح دوپہر اور شام کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ انسانی تعقل کا پیٹرن ہے جو ہر وقت جاری رہتا ہے۔

ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیاں

ناسٹرڈیمس کی کافی تو نہیں، جزوی پیشین گوئیاں ٹھیک نکلی ہیں۔ وہ اپنی Extraordinary Sensory Perception کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی زندگی بڑے دکھ، کرب اور بلا میں گذری اور وہ اپنے المیوں پر توجہ مرکوز کرتا رہا۔ اس پر اتنا پریشر پڑا کہ کچھ برین سیل ایسے ہیں، جو پریشر کے باعث مستقبل کو دیکھ لیتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے مرتے وقت ہر ایک کے برین سیل کھل جاتے ہیں۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے کہ آج اس کی آنکھ کیا تیز ہے کہ جن چیزوں کو پہلے نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ اب انہیں دیکھ رہا ہے اور جن چیزوں پر اس کو پہلے اعتبار نہ تھا، اب اعتبار کر رہا ہے۔

بعض جینیک تبدیلیوں کے باعث کچھ لوگوں میں جاننے کی غیر معمولی صلاحیت آ جاتی ہے، جسے ہم Extra Sensory Perception کہتے ہیں۔ یہ قریباً ہر بندے میں موجود ہوتی ہے۔ ہر انسان زندگی میں ایک آدھ مرتبہ مستقبل کی کسی پیشین گوئی کا واقعہ ضرور دیکھ لیتا ہے۔ مگر کچھ لوگوں میں یہ صفت زیادہ ودیعت ہوتی ہے۔ جب غم والم سے ان کی ارتکاز زیادہ ہو جائے، تو ان میں دوسروں کے مقابلے میں توازن زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیلی پیتھی اور یوگا وغیرہ کی مختلف ارتکاز کی مشقیں بھی ان صلاحیتوں میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ آج کے زمانے میں انہیں ہم علم نہیں کہتے، بلکہ یہ ارتکاز کی مشقیں ہیں۔ جیسے کراٹے کا علم ہے۔ عام آدمی اینٹ توڑ نہیں سکتا یہ ماتھے کی ہڈی سے توڑ لیتے ہیں۔ ان کے مرتب کردہ کچھ اصول ہیں، جن کی بار بار کی مشقوں سے یہ غیر معمولی فرد بن جاتے ہیں۔

حضورؐ رحمت للعالمین

مقاصد کے حوالے سے ایک حدیث کے مطابق بنیادی مقصد تخلیق اللہ کی شناخت ہے۔ انا ھدینا السبیل واما شاکرا واما کفورا. یہ حدیث اس آیت کی تائید کرتی ہے کہ کنت کنزا مخفیا، میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا ما اجبت عن اعراف، میں نے چاہا کہ آشکار ہو جاؤں، و خلقت الخلق لیعرفون میں نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے انتہائی ذہین آدمی کسی جاہل شخص کی تعریف سے تو خوش نہیں ہو سکتا۔ اگر میں باہر بیٹھ جاؤں سارے صفائی والے میرے گرد ہو جائیں، میرے عربی یا فارسی اشعار پڑھنے پر مجھے داد دینا شروع کر دیں، تو میرا نہیں خیال کہ یہ چیز مجھے کسی خوشی سے سرشار کرے گی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ نالائق اور جاہل لوگ ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں، میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ وہ محض مجھے سراہ رہے ہیں۔ ایک ناشناس کی تعریف علم و فضل کو مجروح کرتی ہے۔ جاننے والے کی خاموشی بھی اسی طرح علم و فضل کو مجروح کرتی ہے۔ ایک اچھی چیز، جو لکھی گئی اور جاننے والا جانتا ہے کہ یہ اچھی ہے اور وہ خاموش رہتا ہے تو یہ دوسرے کے لیے عملی طور پر حوصلہ شکنی کا باعث بنتی ہے۔ اس صورتحال میں اللہ جو عقل کل اور سب سے بڑا دانشور ہے، جو تخلیق کار اور مصور بھی ہے، وہ اپنے کام کی ہر ایک سے سراہے جانے کی توقع نہیں کر سکتا۔

اب پوری نسل انسانی میں محمد رسول اللہؐ نے جیسی تعریف اللہ کی کر دی، ویسی دنیا و مافیہا

اور کائنات میں تعریف اور کوئی نہیں کرسکتا۔ تعریف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اے اللہ تو بہت بڑا ہے تو بہت بڑا ہے، تو بہت بڑا ہے...... انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کہ اللہ کو جاننے والا ہی اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ ہمارے ذہن میں خدا کے بارے میں جو احتساب کی شدت اور اس کی قوتوں کا احساس ہے، جس طرح ہم اس کو اپنے اندر متحرک اور فعال پاتے ہیں پھر جس انسان نے سب سے زیادہ خدا کا احساس اور ادراک کیا، اس کو وسعت میں اور تنگی میں دیکھا۔ اس کو بالائے کائنات اور اندرون کائنات زار میں دیکھا، وہ صرف محمد رسول اللہؐ ہیں۔ اب قدرتی طور پہ یہ شخصیت خدا کو سب سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ جس کی تعریف سے اللہ نے سمجھا کہ میں اللہ ہوں۔ چنانچہ محمد رسول اللہؐ کو اللہ نے کریڈیٹ دیا کہ کنت کنزا مخفیا انا اعرف اور میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، فخلقت محمد میں نے محمدؐ کو پیدا کیا۔ اب جسے مخصوص انسان نے مکمل توصیف وتائیدی، اس کا اسم گرامی احمد اور محمد قرار پایا۔

اب جب یہ تخلیق ہوگئی اور رفیق اعلیٰ بن گیا، ہوسکتا ہے شاید کہ حضورؐ کے بغیر اللہ کی گذر نہ ہوتی ہو اور صبح وشام کی توصیف کے لیے بندگی کو حاضر کیا جاتا ہو۔ مگر اس میں ایک اور بڑا وصف یہ تھا کہ یہ اختیاری تھی، جبراً عبادت نہ تھی۔ یہ ملائکہ اور جنات کی عبادت نہ تھی۔ شرارت سے نہ جبر سے یہ خدا کو چاہ رہے تھے، بلکہ یہ تشکر سے چاہ رہے تھے۔ یہ خدا کو چاہ کر خدا کو چاہ رہے تھے۔ اس لیے واضح طور پر اسم محمدؐ میں غیریت کی ہر قسم ہی ختم ہوگئی۔ سو اللہ نے کہا کہ اس شخص نے مجھے کتنا پیار کیا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے اس کو سراپردہ دنیا پر معزز کروں۔ اس پر آگے کی منصوبہ بندی ہوئی۔ اللہ اور محمدؐ ہوگئے۔ الف، لام اور میم ہوگئے، تو اس نے کہا، چلو اب میں دنیا پلان کرتا ہوں۔ اب باقی دنیا تخلیق کی گئی۔ مقصد دنیا تخلیق کرنے کا کیا تھا کہ جہاں جہاں مخلوقات ہو، وہ محمدؐ کی تعریف کرے۔ اس لیے اس کا نام ہی تعریف کیا گیا ہے۔

اب باقی کائنات میں جو کچھ بھی تھا، جہاں جہاں خبر محمد رسول اللہﷺ پہنچی، اللہ کو یہ پسند آیا کہ جیسے محمدؐ مجھے پسند کر رہا ہے میری مخلوق محمدؐ کو پسند کرے۔ چاہے ان کو پتہ ہو یا نہ ہو، مگر زمین اور اس پر چلنے والے پائے رسول کو بوسہ دیں۔ پہاڑ ان کی عظمتوں کے سامنے چلیں۔ درخت ان کے ساتھ ساتھ حرکت کریں۔ ہوسکتا ہے حضورؐ کو نہ پتہ ہو۔ حضورؐ اپنی شخصیت کی متعین مدت کی قید کے لیے آ رہے ہوں اور ان کا مقصد کتاب پڑھانا اور پابندی سے کتاب پوری کرنا ہو۔ وقت تھوڑا

ہے۔ چند مخصوص سال میں استاد نصاب سے ادھر ادھر جا نہیں سکتے۔ انہیں ہر حال میں ''والناس'' تک کتاب پوری کرانا ہے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ گشت وگرد کرتے، ادھر ادھر گھومتے، آسمانوں میں آتے جاتے رہتے۔ ان کے پاس اتنا ہی وقت تھا کہ جس میں وہ ذاتی کردار کا وژن اجاگر کرتے۔

مگر زمین و آسمان کی ساری مخلوقات کو پتہ تھا کہ کوئی ایسا بندہ وجود میں آ گیا ہے جس کے وجود سے رحمت کا تشخص ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام رحمتیں ایک انسان کے دست و پا میں سمیٹ دی ہیں۔ اسی کے ایک اشارے سے کائنات کا بادل برسے گا۔ اسی کے ایک اشارے سے کائنات کی چیزیں بدلیں گی اور اسی کے ایک اشارے سے جنت کے آٹھ دروازے کھلیں گے۔ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین.

جب حضورؐ نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ باقی عالم کو میری رحمت عالم کا بڑا فائدہ ہے تجھے بھی ہوا ہے؟ فرمایا یا رسول اللہ! بالکل ہوا۔ جب سے عزازئیل خوار ہوا اور شیطان کو رسوائی ہوئی، ہم اہل ملائکہ خدا سے بہت ڈرتے تھے۔ کہیں ہم پہ بھی کسی وقت کوئی آفت نہ آ جائے، ہم ہر وقت کانپتے رہتے تھے۔ پھر جب قرآن اترا، آپ آئے، تو اللہ نے کہا کہ میں کتاب روح الامین کے ہاتھ سے بھیج رہا ہوں۔ مجھے امانت والی روح کہا، تو میرا دل ٹھہر گیا۔ اب اللہ نے فیصلہ دے دیا ہے کہ میں اچھا ہوں، اور میں بھی اچھا رہا اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا۔

حضورؐ کو تو نہیں پتہ تھا مگر دنیا میں ہر شے پر اس کی رحمت کی چادر تنی رہی، لیکن ہم نہیں جانتے۔ جیسے سلیمانؑ کو چیونٹی کی زبان سنائی دیتی ہے اور جیسے کہ سب سے تیز ترین رفتار حیاتیاتی پیغامات کی ہے تو زمین و آسمان میں کہیں نہ کہیں حضور گرامی کا نام گرامی سنا ضرور جا رہا ہوگا۔ کہا جا رہا ہوگا اور برتا جا رہا ہوگا۔ بلکہ ابن عباس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ باقی دنیا میں بھی اسی طرح پیغمبر ہیں۔ وہاں بھی عیسیٰ اور ابراہیم ہیں۔ وہاں موسیٰ ہیں تو لامحالہ وہاں محمدؐ بھی ہیں۔ اس لیے یہ رحمت عالم کا تصور ساتوں زمینوں اور ساتوں کائناتوں پہ جاری و ساری ہے۔

حضورؐ وجہ تخلیق کائنات

اگر دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی تمام کامیاب باتیں دیکھتے دیکھتے بات بڑی سادہ سی رہ

جاتی ہے۔ اللہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان مجھے پہچانے اور مجھے اللہ کی حیثیت سے مانے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسے کس نے مانا اور کس نے پہچانا؟ کس کی تعریف اللہ کو پسند آئی؟ اب اگر سب لوگوں کی تعریف پسند نہیں آئی، قبول تو وہ کرتا ہے لیکن قبول کرنا اور پسند کرنا دو علیحدہ باتیں ہیں۔ وہ ہر ایک کی عبادت قبول کرتا اور ہر ایک کی دعا سنتا ہے۔ وہ ہر ایک کی تعریف قبول کر لیتا ہے لیکن جو چیز اسے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ محمد رسول اللہؐ پسند آئے۔ جیسے قیامت کے دن کی حدیث کے مطابق مجھے حکم دیا جائے گا کہ محمدؐ آؤ۔ کھڑے ہو جاؤ اور میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے کہا جائے گا کہو اور میں اللہ کی تعریف کروں گا، جیسی مجھ سے چاہی جائے گی۔ تو اصل میں تعریف کرنے والا تو ایک ہی ہے۔ اسی کا نام احمد ہے۔ فارقلیط اسی کو کہتے ہیں۔ اسی کا پہلے بھی کتابوں میں ذکر آیا۔ اب بھی ذکر آیا اور وہی قرآن لے کے آیا۔ وہی محمد رسول اللہؐ اور وہی احمدؐ ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کو تسلیم نہیں کرتا، تو اس کی کیا اللہ کو پروا ہو سکتی ہے۔

جس شخصیت کی عادات اور خصائل کو اجاگر کرنے کے لیے پوری شیطنت تخلیق ہوئی ہو۔ تیکھا تضاد اس لیے تخلیق کیا گیا کہ ادھر ان کی حسن شخصیت ہے، ادھر ان کی شخصیت سے جتنی دوری لوگوں کی ہوتی جائے گی، وہ ساری برائی ہے۔ برائی کا تشخص بھی محمد رسول اللہؐ ہیں۔ جہاں برائی کا تشخص محمد رسول اللہؐ سے ہوا، وہاں خوبی کا تحفظ محمد رسول اللہؐ سے ہوا۔ قدرتی طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی بات پھر وہیں آ کے رکتی ہے کہ آپ کون ہو، کس کی پارٹی ہو، کس کے ساتھ ہو، کس سے دور ہو؟ اس کے علاوہ تو کوئی اور چیز مذہب میں نہیں رہ جاتی۔ یہ تو قربت کی لڑائی ہے۔ آپ کس کے قریب اور کس سے دور ہیں۔ پورے کا پورا مذہب اسی جگہ آ کے رک جاتا ہے۔ باقی سب فرائض اور اعمال نکل جاتے ہیں۔ ساری زندگی فرائض پر عمل نہ کرنے کے باوجود نیات کی وجہ سے اگر فاصلہ خیر و شر ماپا جائے اور 49 فیصد بھی خیر کا نکلے، تو میں بخشا جاؤں گا۔ میرے دل میں مجموعی طور پر مادی تصورات کے باوجود محبت رسولؐ اور خدا کی رہی تو ظاہر ہے کہ میں بخشا جاؤں گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اعمال آپ کو ادھر لے کر جائیں گے۔ فرض کریں، ایک آدمی 90 فیصد اعمال پر قائم ہے مگر اس کی نیات میں کوئی خلوص اس قسم کا نہیں ہے تو فاصلہ ماپنے پر پتہ چلے گا کہ 80 فیصد شر کی طرف اور 20 فیصد خیر کی طرف ہے۔ اس کو جہنم میں گھسیٹ کے لے جائیں۔ اللہ کی طرف سے حتمی نتائج آئیں گے، تو میرے خیال میں محبت فاتح عالم ہو گی۔

احد اور احمد میں فرق

احد اور احمد کے درمیان صرف "میم" کے فرق جیسی باتیں اصل میں دیومالا کی مطالعات اور خاص طور پر رامائن کے تصور سے ہمارے ہاں آئی ہیں۔ بہت سارے کلچر ہم میں رہے۔ یہ انہی کا اثر ہے۔ اس کے باوجود "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن" کا مصنف لکھتا ہے کہ

"There was such a gigantical position about the oneness of God in Islam that no mythology was possible."

(اسلام میں خدا کی وحدانیت کا تصور اس قدر مضبوط ہے کہ کسی میتھالوجی کا اس میں کوئی امکان نہیں تھا) ہندو ہم سے خدا واحد کا تعین تو نہ چھین سکا، لیکن ہندو کی ایک تیکنیک یہ رہی کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذہب تھے جین مت اور بدھ مت سمیت اس نے ان کو بتوں کی شکل دے دی۔ جبکہ وہ اچھے خاصے پیغمبر تھے۔ یہی بات راما اور مہا بھارتا کی ہے اور کرشنا بھی پیغمبروں کی طرح لگتا ہے۔ ہندو نے یہ کیا کہ سب کو کرپٹ کرتے ہوئے انہیں بتوں کی تمثیلوں میں ڈھال دیا۔ اب اتنے طویل عرصے میں، اس نے طاقت منتقل کر لی تھی چونکہ وحدانیت کا تصور مسلمانوں میں بڑا سخت تھا اس نے ایک نیا تصور اوتار کا گھڑ لیا۔ اس کے عقیدے کے مطابق بھگوان اوتاروں کی شکل میں اترتا رہتا ہے۔ وہ بدھستو وترا اور جیناوترا کی شکل میں اترا اور سب سے آخری اوتار، جسے کالکی وتر یعنی ہلاکت اور تباہی کا زمانہ کہتے ہیں اس میں انہوں نے محمد رسول اللہ کو آخری وتر قرار دے دیا۔ اسے وہ باھواں وتر کہتے ہیں۔ آخری معتبر Teacher of the teachers یہ اصولاً ہندوانہ تصور تھا۔

ہندو پتھروں کی پوجا کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ بت پرستی ان کے ضمیر میں چلی گئی ہے۔ انہوں نے الوہیت کو کسی نہ کسی طریقے سے بندوں میں داخل کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہی الوہیت اثناعشریوں کے تصور میں بھی آئی۔ جب بابی مذہب آیا تو قراۃ العین طاہرہ نے محمد علی باب پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ باب نے کہا تھا کہ میں ہی باب حق ہوں۔ خدا مجھ میں حلول کر گیا ہے اور میں خدا کا دروازہ ہوں۔ اس لیے اسے باب کہتے ہیں۔ یہی تصور دستور یہ شیعہ میں اور سنیوں میں غالی پیر فقیروں میں در آیا۔ وہ پیر کو خدا ہی سمجھتے ہیں، خدا کا نائب نہیں سمجھتے۔ یہ سب جہالت کی وجہ

سے ہے۔ بلکہ واصل بن عطا کی اس تشخیص کے بعد پہلا دور جو مسلمانوں پر کڑا گذرا ہے، حشیشین کا تھا۔ انہیں خدا کا مظہر گنا جاتا تھا۔ قرامطہ، باطنیہ اور ملاحدہ کی شاخ اسماعیلیہ کی ایک شاخ تھی، جنہوں نے فردوس بریں کے نام سے جنت بنائی۔

عمومی مسلمان، چاہے وہ شیعہ ہو یا سنی، وہ اس حد تک نہیں جاتا۔ ان میں سے بعض ابلاغ کرتے ہیں، جیسے شیعہ حضرت علی کرم اللہ وجوہ کی محبت میں غلو کرتے ہیں اگر وہ کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ اس کا ہمیں کوئی پرابلم نہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ مجھے اس شخصیت سے زیادہ محبت ہے، تو وہ کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب کوئی شخص یہ کہے کہ تم جس سے محبت کرتے ہو، میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہا ثناءعشریہ کے لیے محترم ہیں، تو ادھر سنیوں میں تمام اہل بیت محترم ہیں۔ وجہ اختلاف وہاں تخق ہے جہاں کوئی کسی شخص کے لیے حرمت و توقیر رکھتا ہو، اس کی دوسرا توہین کرے۔ ایسی صورت میں وہاں تلخی پیدا تو ہوگی گویا جھگڑے محبت میں پیدا نہیں ہوتے، وہ کسی سے نفرت اور تلخی میں پیدا ہوتے ہیں۔

تاہم غلو فی العقیدت کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اپنام قول ہے کہ میری وجہ سے دو لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ایک وہ جو میری تعریف میں بخل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو غلو کرتے ہیں۔ جب سے میں نے حدیث خیبر پڑھی ہے، میرے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت علی اللہ وجہہ کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔ خیبر کے بارے میں نبی اکرمؐ نے فرمایا ’’میں علم آج اس کے ہاتھ میں دوں گا، جس کو خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے اور جس سے خدا اور اس کے رسولؐ کو بڑی محبت ہے۔‘‘ حضرت کرم اللہ وجہہ کو علم دیا گیا۔ پہلا بیان کہ جس کو خدا اور رسول سے بڑی محبت ہے، کے بارے میں تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی خدا اور اس کے رسولؐ سے بڑی محبت ہے مگر دوسرا بیان کہ جس سے خدا اور رسول کو بڑی محبت ہے کس کو ملے گی؟

اب اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ علیؓ سے خدا اور اس کے رسول کو بڑی محبت ہے تو پھر میرے خیال میں یہ مسئلہ بیکار ہو جاتا ہے اور میں قطعاً یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی کسی طور سے توہین کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی علیؓ سے غیر متوازن انس رکھے۔ اسی طرح جب ہم حدیث دیکھتے ہیں کہ الحق ینطق علی لسان العصر کہ حق کی زبان سے بولتا ہے، تو پھر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ ہیں۔ بظاہر ان کے آپس کے ایسے واقعات بھی نظر

نہیں آتے۔ اگر کوئی جھگڑا ہوا ہوگا اور یقیناً ہوا کہ بخاری میں درج ہے تو اس جھگڑے کے لیے کوئی اتنا بڑا فساد نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ Withdraw کر گئے۔ یہ ان کے اخلاق کریمانہ کی بات تھی۔

ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ روضہ رسول پر اکٹھے پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، علیؓ آپ قدم بڑھائیے پھر تعریف شروع کی کہ اللہ کے رسولؐ نے آپ کو پالا، آپ ان کی محبت کے امین، آپ ان کی محبوب بیٹی کے خاوند وغیرہ بڑی تعریفیں کیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ اے ابوبکرؓ کیا بات کر رہے ہو، ہم نے رسول اللہؐ سے جب بھی سنا، یہی سنا، میں، ابوبکرؓ، میں ابوبکرؓ عمرؓ ہم نے تو کبھی آپ کو رسول اللہؐ سے جدا نہیں دیکھا۔ آپ ان کے مشیر، ان کے دوست، ان سے محبت رکھنے والے۔ آپ کی وجہ سے رسول اللہ محراب پر چڑھے اور کہا کہ ابوبکرؓ میرا دوست ہے۔ آپ قدم آگے بڑھائیے اب آپ آپ شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ فیصلہ یہ ہوا کہ اس طرح تو جھگڑا ختم نہیں ہوتا، آئیے اکٹھے ہی قدم بڑھائیں۔ وہ بہت ڈیسنٹ، شاندار اور بڑے خوبصورت لوگ تھے۔ ان کے آپس میں جتنے بھی اختلافات تھے، انہوں نے ان پر بڑی انسانیت محبت اور بڑے خلوص سے قابو پایا۔ ہم جو آج ان کی وجہ سے لڑ رہے ہیں، جاہل لوگ ہیں۔ فساد کا آغاز وہاں سے ہوا، جب ہم نے ان کے درجات مقرر کرنا شروع کر دیئے اور ہم نے ان کی جگہ کارروائیاں کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنی جگہ کوئی کارروائی نہیں کی۔

اب یہ کتنی عجیب سی بات لگتی ہے کہ میرے ذہن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک حق ہوا اور وہ اس پر اپنے آپ کو برحق بھی سمجھتے ہوں، پھر وہ اپنا حق کسی دوسرے کو لینے دیں۔ ایک جگہ جناب علیؓ کا یہ رتبہ ہے کہ فاتح خیبر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے حق کے لیے ایک کیس بھی دائر نہیں کر رہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ جب کیس حضرت ابوبکرؓ کے سامنے دائر ہوتا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ اے علیؓ تم خود فیصلہ کر لو۔ اس فیصلے میں عبداللہ بن عباس بھی برابر کے جائیداد میں شریک ہیں۔ وہ آپس میں کزنز ہیں۔ جیسی حیثیت حضرت علیؓ کی، ویسی ہی حیثیت حضرت عبداللہ بن عباس کی ہے۔ یہ مال اور یہ فدک ہے۔ یہ تم لوگ ہو، جاؤ خود جا کر فیصلہ کر لو۔ حضرت علیؓ کے اپنے زمانے میں بھی یہی فیصلہ برقرار رہا۔ میں تو نہیں مانتا کہ حضرت علیؓ نے پہلے بھی فیصلہ غلط تسلیم کیا ہو اور میں یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت علیؓ اتنے گئے گذرے ہوں گے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں

بھی غلط فیصلہ تسلیم کیا ہو۔ یہ سب ہماری باتیں ہیں۔

حضرت کرم اللہ وجہ کی بات بڑی خوبصورت ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پہلے خلفاء کا زمانہ کامیاب کیوں تھا اور آپ کا نا کام کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ تمہیں وجہ سمجھ نہیں آتی؟ پہلے خلفا کے مشیر ہم لوگ تھے، ہمارے تم لوگ ہو۔ ان کو ہمارے جیسے مشیر نصیب تھے۔ اب ہمیں تمہارے جیسے بد بخت نصیب ہیں۔ ظاہر ہے، معاملات تو بگڑنے ہیں۔

شرک اور اللہ کی حساسیت

شرک سے تحفظ رکھنا بہت آسان ہے۔ کسی بندے کی عزت و احترام و تکریم سے قطعاً کسی قسم کا شرک لازم نہیں۔ ہمیں محبت اور شرک میں فرق کرنا پڑے گا۔ ٹیکنیکل طور پر کہا جائے، تو کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اگر ہم طاقت اور اختیار کا تصور انسانوں سے جدا کر لیں، تو کبھی بھی ہم شرک کے قیدی نہیں بن سکتے۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ رسول اللہؐ یہ طاقتیں ہیں، تو اس میں سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ خدا کے رسول کا تصور خدا کے بغیر ہے ہی نہیں۔ انہیں جو معجزے عطا ہوئے، اس میں لفظ ”عطا“ ضرور استعمال ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اللہ نے اپنے رسول کو یہ مرتبہ عطا کیا، تو میں اللہ کا لفظ ضرور استعمال کروں گا۔ مگر آج تک یہ نہیں ہوا کہ کسی شخص نے مجھے یہ کہا ہو کہ اگر اللہ نہ ہوتا، تو رسول اللہ کے پاس یہ طاقت ہوتی۔ شرک اصولاً ہو نہیں ہو سکتا۔ محبت رسول اور اللہ کے درمیان شرک ممکن نہیں ہے۔ اگر ہماری اپروچ یہ ہے کہ ہم رسول اللہ کے بغیر کچھ بھی نہیں اور ہیں بھی نہیں۔ سارے کا سارا تشخص اللہ کی وجہ سے ہے اور کسی بھی رسول کی عزت اللہ کی وجہ سے ہے، تو شرک ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر ایک لاکھ پیغمبروں کا وجود ہمیں بتا رہا ہے کہ پیغمبر ناگزیر نہیں ہیں۔ اس نے ایک لاکھ پیغمبر پیدا کئے۔ چاہتا، تو ایک لاکھ اور پیدا کر سکتا تھا۔ ایک ایک وقت اور قبیلے میں بنی اسرائیل کے دور میں بارہ بارہ پیغمبر آئے۔ جب قدرتوں اور طاقتوں کا سوال آئے گا، تو خدا بالکل اکیلا ہے۔ جب ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خدا اکیلا، تنہا اور Totality ہے۔ ہر جگہ موجود اور ہمہ طاقت ہے۔ اس کے بعد اگر ہم نے اپنی محبتوں کا ارتکاز رسول اللہؐ میں مرتکز کر لیا، تو اس میں قطعاً کوئی شرک نہیں ہو سکتا۔

اب جھگڑا وہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اللہ نے کیا دیا ہوا ہے اور وہ آگے کیا پہنچا سکتے ہیں، جس پر شرک کا گمان ہے۔ میں کہتا ہوں، یا رسول اللہؐ میری مغفرت کی دعا فرمایئے، اللہ مجھے بخش دے۔ ایک مولوی کہتا ہے، یہ شرک ہے۔ بھئی کیوں شرک ہے؟ بجائے اس کے کہ تم اسے شرک کہو، یہ دیکھو آیا یہ اجازت رسولؐ کے پاس ہے کہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایک آفس ہے جسے میں غلط اپلائی کر رہا ہوں۔ اگر رسول اللہؐ کے پاس بخشش لے کے دینے کا آفس ہی نہیں ہے۔ دینا تو اللہ نے ہے، پھر مولوی مجھے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم غلط جگہ خواہ مخواہ زور لگا رہے ہو۔ ادھر جو چیز تم مانگ رہے ہو، وہ ہے ہی نہیں۔ مگر قرآن اور حدیث کے مطابق حضورؐ کے پاس مقام شفاعت، مقام محبوبیت اور مقام وسیلہ ہے۔ اذان کے بعد کی دعاؤں کو پڑھ لیجیے۔ اب اگر یہ تینوں مقام رسول اللہؐ کے پاس ہیں، تو پھر میں رسول اللہؐ سے کہہ سکتا ہوں کہ یا رسول اللہ! مجھے اللہ سے بخشش لے دیں۔ مجھے اللہ سے گھر لے دیں۔ کیونکہ وہ مقام وسیلہ اور مقام شفاعت پر بھی متمکن ہیں اور مقام محمود بھی انہی کے پاس ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ اللہ بھی اس بارگین کو برداشت کرتا ہے کہ نہیں۔ بخاری کی حدیث ہے کہ اللہ **معطی** و انا قاسم اللہ عطا کرنے والا اور میں بانٹنے والا ہوں۔ اب رسول اللہؐ کے بغیر اللہ کی عطا تقسیم نہیں ہو سکتی۔ تقسیم ہو گی ہی نہیں۔ یعنی تقسیم کے انچارج تو وہ ہیں۔ آپ بالا بالا اللہ کے خزانے سے کوئی چیز کیسے نکال سکتے ہیں؟ ان چیزوں کے اندر اختلاف نہیں ہے۔ ان کی چھوٹی عقلوں نے فضول مسائل کو شرک بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی مسلمان سے پوچھ کے دیکھ لیں، اللہ کتنے ہیں؟ اس کے اختیارات کتنے ہیں؟ وہ کہے گا، اللہ ایک ہے اور سارے اختیارات اس کے پاس ہیں۔ پھر شرک کہاں سے آیا؟ البتہ یہ ہوتا ہے کہ بعض دعوے دار جعلی دعوے کرتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو با اختیار ثابت کرتے ہوئے لوگوں کے عقیدے میں گڑبڑ کرتے ہیں۔

ایک پیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ کہتے ہیں، میں یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔ بندہ بے چارہ پوچھتا ہے یار یہ پیر صاحب واقعی یہ کر دیں گے؟ مثال کے طور پر ایک بندے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پیر صاحب نے کہا تھا، میں اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ اب وہ بے چارہ اس چکر میں پڑ گیا کہ پیر صاحب کے پاس وہی طاقتیں ٹانگ توڑنے کی موجود ہیں۔ وہ اس کو یہ نہیں کہے گا کہ

خدا کی طرف سے اسے ناٹک توڑنے کی طاقت ملی ہے۔ وہ طاقت کو اس شخص کے ساتھ کر دے گا۔ جیسے کسی بت کے ساتھ کوئی طاقت وابستہ ہو جائے کہ یہ گھنشام ہے بادل برساتا ہے۔ یہ شیوا ہے جو تباہ و برباد اور ہلاک کرتا ہے اور یہ اندرا ہے جو سورگ دیتا ہے اور یہ کالی ہے، جو راکھشس کا سلسلہ رکھتی ہے۔ یہ ارجنا، یہ درگا اور یہ سراوتی ہے۔ ہر دیوتا کے ساتھ ایک طاقت وابستہ ہو جاتی ہے۔ جیسے اب خدا اپنے سارے کاموں کو بانٹ کر چارپائی پر بیٹھ کر بس سگریٹ پیتا اور کچھ نہیں کرتا۔

بت پرستی بنیادی طور پر انتقالِ اقتدار کا نام ہے۔ جب پاور منتقل ہو گی اور اللہ اپنی طرف سے پاور نکال کے ان کے حوالے کر دے، تو یہ انتقالِ اقتدار قرار پائے گی۔ اب یہ تفویض جیسے اس کی طرف آئے گی ہی نہیں۔ جاؤ نیچے درگاہ سے جا کے کام کرا لو۔ سراوتی سے، کالی سے کام کروا لو۔ تو یہاں پر شرک آ جاتا ہے۔ جب ایک چیز آپ خدا سے چھین کر اس کی مخلوق کے سپرد کر دیتے ہیں، چاہے وہ پیر ہیں، ملائکہ یا رسول اللہؐ صاحب ہیں، وہاں آپ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اور اگر ہم دوسری طرف سارا اعتقاد یہ رکھیں، کہ خدا کی عطا ہمارے رسول کریمؐ پر اور اللہ کے دیگر نیک بندوں پر بھی ہے۔ کسی کی دعا کی قبولیت میں ہے۔ کسی کے اختیار کی فضیلت میں کسی کی محبت انسان میں ہے تو پھر آپ دیکھیں گے مذہب کس قدر صاف ستھرا، Well lined out اور Well adjusted نظر آئے گا۔

اپنی جان سے زیادہ محبت

جب تک ہم بطور امت فردِ واحد کی طرح نہیں سوچتے۔ جب تک ہم رسول اللہؐ کے گرد نہیں جمع ہوتے، ہمارا یہی حال رہے گا۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم شخصیات کی پرستش کرتے ہیں اور جس شخصیت کے ساتھ ہماری وابستگی ہونی چاہیے، وہ سرے سے ہی نہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو رسول اللہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے اور کچھ غلوشان کرتے ہیں۔ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مقامی پیغمبر تھے اور رہے ہیں، جو اپنی اہمیت ان سے بالا رکھتے ہیں۔ ان ساری چیزوں میں سے ایک چیز نہیں نکلتی۔ وہ جو حضرت عمرؓ کو رسول اللہؐ نے فرمائی تھی کہ ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک میری محبت لوگوں کے دلوں میں ان کی جان سے بھی نہ بڑھ جائے۔ حقیقت میں یہی ہمارا

مرحلہ ہے۔ عرب لوگوں کو دیکھتا ہوں، وہ بڑے جدید اور پر جوش لوگ ہیں، لیکن ان میں وہ انس اور محبت بالکل پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے بدوی رسول اللہؐ کے پاس آیا، اور دیکھا کہ آپ ایک بچے کو چوم رہے تھے۔ کہا، یا رسول اللہؐ کیا آپ بچوں کو چومتے بھی ہیں؟ کہا ہم تو چومتے ہیں۔ ہمارے تو دل میں رحم اور رحمت ہے۔

اگر میں منطقی لحاظ سے پیٹرن کو دیکھوں، تو میرا رسول اللہؐ سے بظاہر کیا واسطہ ہے۔ مگر مجھے وہ اس لیے اپنی جان سے زیادہ بڑھ کے عزیز ہیں کہ میں ایک پورے کمپلیکس میں دیکھتا ہوں۔ مجھے کسی عرب کے فوت ہونے یا کسی لیبیائی کے مرنے کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ مگر میرا دل جل رہا ہے۔ میرا دل جس ریفرنس سے جل رہا ہے، وہ صرف محمد رسول اللہؐ ہیں۔ اللہ کے بندے تو لاکھوں، کروڑوں مرتے جیتے رہتے ہیں، ان سے ہمیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ جس ریفرنس سے غم ہو رہا ہے، وہ بس یہی ہے۔

لامحدود سے ملاقات

نبی اکرمؐ کا وجود ان معنوں میں لامحدود ہو گیا تھا کہ اس کی خاص طور پر تیاری کی گئی تھی۔ معراج سے پہلے حضورؐ کا شق صدر فرمایا گیا اور اس میں ایسے خاص آلات ضرور رکھے گئے، جو فضاؤں سے گذرنے کے پیٹرن کو سہار سکیں۔ اگر ہم سائنسی لحاظ سے دیکھیں، تو شق صدر کائنات اور آسمانوں سے گذرنے کی تیاری ہے، جہاں اللہ کے رسول کو اس قابل کیا گیا اور پھر فرمایا گیا کہ ان کا دل اب بالکل پاک کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلڈ لیول تو شاید رہا ہی نہ ہو۔ جس کے بعد جو کچھ اللہ کے رسول نے دیکھا، وہ بہت غور اور اچھی طرح سے دیکھا۔ تو شب معراج ایک ایسا واقعہ ہے، جس میں حضورؐ کو پہلے سے وژن کی تیاری کرائی گئی۔

قصۂ نور و بشر

ہماری علماء کے ساتھ عمومی جنگ میں یہ ان کی نالائقی کی جدوجہد تھی۔ انہوں نے قرآن و حدیث کو توڑ کر کے پیش کیا۔ فضول بیانات کے اپنے اردگرد انبار لگا دیئے۔ قرآن و حدیث سے منسوب غلط آرا پیش کرنے لگے۔ اس موضوع پر بحث و مباحثہ ہونے لگے کہ نبیؐ نور

ہے یا بشر؟ سترہویں، اٹھارہویں صدی میں برصغیر پاک و ہند میں اس قسم کے اشوز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اصل سوال یہ نہیں تھا، بلکہ یورپ اور ایشیا میں اس وقت یہ تھا کہ اللہ نور ہے یا مادہ۔ اس زمانے کی یہ بحث تھی۔ لوگ یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ نور ہے، تو اس سے مادہ کیسے ہے اور اگر خدا مادہ ہے، تو اس سے نور کیسے نکل سکتا ہے۔ اٹھارویں صدی تک مذاہب کے اور دوسرے عام فلاسفروں کے درمیان یہ بحث سختی سے چلی آ رہی ہے۔ اس سے مذہب پسپا ہو رہا تھا۔ ان کا سائنسی اعتراض تھا کہ الیکٹرک شعاع کو مادہ بنا کر یا اس میں سے مادی وجود نکال کر دکھائیں۔ حتیٰ کہ آئن سٹائن کا زمانہ آ گیا۔ اس نے مساوات $e = mc^2$ دے دی۔ اس کے بعد ثابت کیا کہ مادہ اور توانائی دونوں تغیر پذیر چیزیں ہیں۔ کسی بھی وقت مادے کو انرجی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جھگڑا ختم ہو گیا۔ مادہ بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتا، بلکہ یہ ایک کثیف توانائی ہے۔ یہ جھگڑا یورپ میں تو ختم ہو گیا، مگر ہندوستان میں شروع ہو گیا۔ خدا کی جگہ بات پیغمبر میں منتقل ہو گئی کہ محمد رسول اللہؐ بشر ہیں یا نور۔ آئن سٹائن کا قانون یہاں بھی استعمال کریں کہ مادہ تو کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ رسول اللہؐ تو بڑی دور کی بات ہے، میں نوری ہوں۔ کیونکہ میں ایک کثیف توانائی ہوں۔ ایک تیز ولائٹی سے گذروں، تو میں بھی نور ہو جاؤں گا۔ آپ اس قسم کے نمونے سٹار ٹریک کی فلموں میں بھی دیکھتے ہیں، جس میں ماہیت قلب ہوتی ہے۔ انسان انرجی میں تبدیل ہو کر دوسرے سیاروں کو پہنچ جاتا ہے۔

خود اپنی ذات پر درود

آپ کو ''درود'' کا مطلب سمجھنا پڑے گا۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ **اولئک علیہم صلواۃ من ربہم و رحمۃ** یہ درود ہر انسان کے کام آتا ہے۔ درود پیغمبروں کے علاوہ دوسروں پر بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ جب ایران میں انقلاب آیا، تو ''درود بر خمینی'' سنائی دیتا تھا۔ اگر آپ اپنا درود بھی پڑھیں، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ جب آپ کہتے ہیں: **وعلی الہ واصحابہ اجمعین**...... تو ''اصحابہ'' کا کیا مطلب ہے؟ یوں اصحاب رسولؐ پر بھی درود جا رہا ہوتا ہے۔ ''درود'' درحقیقت Refind Blessing ہیں۔ ان میں ہدایت، رحمت اور امن، تین عناصر ہیں۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کیجیے، تو پیغمبروں پر بار بار جو چیز نازل ہوئی ہے، وہ سلام ہے۔ **سلام**

قول من رب الرحیم. و سلام علي المرسلین و الحمد لله رب العالمین خدا کے ہاں سے جو پیغمبران اقداس پر قیمتی ترین شے نازل ہوتی ہے وہ سلام ہے۔ سلام، امن اور سلامتی کو کہتے ہیں۔ رسول کریمؐ کے ایک صحابی نے عرض کیا، میں روز صبح جاگتے ہی اللہ جل شانہٗ کو ''السلام علیک'' کہتا ہوں...... رسول اللہ نے فرمایا، وہ خود سلام ہے اس پر سلام نہیں بھیجا جا سکتا۔ وہ سلام عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ''درود'' میں جو سب سے بڑی اور بنیادی چیز شامل ہے، وہ سلام ہے۔ اللہ کی طرف سے ایک ایسی کیفیت امن، جس کو کوئی اضطراب بھی متزلزل نہیں کر سکتا۔

دوسری بات، بخاری شریف میں حدیث نبویؐ ہے الله معطی و انا قاسم (بخاری شریف) اللہ عطا کرنے والا اور میں بانٹنے والا ہوں۔ قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے: وما ارسلنک الا رحمة للعالمین. اللہ نے تمام رحمت جو زمین اور آسمانوں میں، اول تا آخر، بانٹی تھی اس کی تا سمیت پیغمبر اسلام کو دے دی۔ اب اللہ رحمت کا خالق اور عطا کرنے والا ہے اور پیغمبر علیہ صلواۃ والسلام کو وہ رحمت ہر قیمت پر جائے گی۔ اس درود میں وہ رحمت بھی شامل ہے۔ ایک سلام شامل ہو گیا، ایک رحمت اور تیسری کیفیت ہدایت کی ہے۔ اولئک هم المهتدون.

ایک وقت میں ہدایت کے ہزاروں کمبل ہوتے ہیں۔ مگر جیسے ہم اپنے ٹائم کو گرین وچ ٹائم سے درست کرتے ہیں۔ باقی ٹائم سٹینڈرڈ ٹائم نہیں ہوتے۔ اسی طرح کسی زمانے کے قطب، ولی یا پیغمبر کی تعلیمات سٹینڈرڈ ایجوکیشن کہلاتی ہیں۔ اس کا ایمان سٹینڈرڈ ایمان اور اس کی ایجوکیشن سٹینڈرڈ ایجوکیشن۔ کوئی شخص، جو اس سٹینڈرڈ ایجوکیشن سے ادھر ادھر ہٹے گا، وہ ہدایت یافتہ نہیں کہلائے گا۔ اس لیے تیسری چیز جو درود میں شامل ہے، وہ ہدایت ہے اور ہدایت کی بنیادی مرکزیت صرف رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔

قرآن کریم میں عام لوگوں کو مخاطب کر کے خدا کہتا ہے: والنبلونکم بشی ء من الخوف والجوع والنفس من الاموال والانفس واثمرات. یہ پانچ چیزیں ہیں۔ ہر آدمی کو ان سے آزماؤں گا۔ بچت کسی کی نہیں ہوگی۔ تھوڑا بہت ہر آدمی کو ٹچ کیا جائے گا۔ اس کو تکلیف ضرور ہوگی تم آرام کے لیے آئے ہی نہیں ہو۔ یہ کیمپ فائر ہے۔ اس کیمپنگ میں تمہیں نا آسودہ رہنا ہے مگر جب تم ان چار پانچ ہیڈز کے ٹیسٹ پورے کر لو گے۔ وبشر الصابرین الذین اذا اصابتهم المصيبة جب تم لوگوں پر مصائب آئیں اور تم نے اتنی اپروچ رکھی کہ

قالو انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ تم لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کسی جادو گنڈے کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا نہ کسی نے نظر بد لگائی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کی وجہ سے ایک اچھا وقت آتا تھا، تو برا وقت بھی آ سکتا تھا۔ اللہ کی طرف سے یہ مصیبت آئی ہے اور ادھر ہی کو لوٹ جائے گی۔ اگر یہ صاف ستھرا یقین آپ کا ہوا۔ **اولئک علیهم صلوۃ من رب الرحیم.** ان لوگوں پر میری طرف سے درود و سلام ہے۔ **اولئک هم المهتدون!** یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔ درود میں سلامتی ہے، رحمت ہے، ہدایت ہے۔

اب اس سوال کا جواب کہ کیا پیغمبر خود اپنی ذات پر درود بھیج سکتے ہیں؟ میں جو اپنا چہرہ آئینے میں دیکھوں، تو مجھے ہدایت ہے کہ یہ پڑھنا: اے اللہ! تو نے میری صورت گوارا بنائی ہے تو میرا اخلاق بھی احسن کر دے۔ اب جب پیغمبر کو یہ پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمت عالم بنایا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ ''اے اللہ! مجھ پر سلامتی، ہدایت اور رحمت نازل فرما۔'' صرف سٹائل بدل جائے گا۔ جب رسول اللہؐ لوگوں کو بتائیں گے کہ درود ایسا پڑھنا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیکھو، میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ میری تعلیم، میری مداح اور مجھ پر درود و سلام اللہ کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کا تمہیں دیگر تسبیحات سے زیادہ فائدہ ہوگا۔

حضرت کعبؓ کی حدیث موجود ہے کہ جب وہ حضورؐ کے پاس گئے تو پوچھا،

کیا پڑھتے ہو؟

عرض کیا، یا رسول اللہؐ! یہ تسبیح پڑھتا ہوں۔

فرمایا، درود پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسول اللہؐ! ایک تہائی کر دوں؟

فرمایا، اور پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسول اللہؐ نصف کر دوں؟

فرمایا، اور پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسول اللہؐ، تو پھر میں درود ہی نہ پڑھا کروں؟

فرمایا، کفایت کرے گا۔

اقبال کا مکتبۂ فکر

اقبال پر بحران ان کی عمر آخر میں واضح ہوا۔ ابتدائی زندگی میں اقبال کے لیے نیشنلزم، مسلم کاز ان کی اولین ترجیح تھی۔ خدا کی تلاش ان کی ترجیح نہیں تھی۔ وہ ایک فلاسفر تھے اور اچھا مسلمان ہونے کے ناطے ان کے ہاں فکر مندی بہت تھی۔ مگر مغربی تصورات کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ اٹکا رہا کہ علم یا تحقیق و جستجو سے خدا نہیں ملتا۔ تب وہ عشق کی جانب پلٹے، مگر وہ عشق بھی علمی ہے۔ اقبال نے عشق کی بات کی، تو علم ہی کی بات کی۔ ایک اعلیٰ، ریفائن علمی جستجو، جس میں ایک ٹوٹل کمٹمنٹ ہو۔ مگر جب اقبال بوڑھے ہو گئے، تو انہیں عمر آخر میں شدت سے احساس ہوا کہ ان کی اپروچ غلط رہی ہے۔ اب وہ خدا کو ڈھونڈنے کے لیے مجذوبوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کبھی ایک، کبھی دوسرے مجذوب تک پہنچے۔ تب ان پر انکشاف ہوا کہ یہ طریقہ درست نہیں۔

میں اس کے باوجود انہیں مجدد وقت مانتا ہوں کہ انہوں نے اپنی اقدار کا احیا ضرور کیا اور انہوں نے پہلی مرتبہ فلسفیانہ سطح پر معجزات اور وحی کا دفاع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تمام دلائل شکست کھا گئے۔ کچھ Semantics والوں نے رد کر دیے اور کچھ Logical positivists نے مجموعی طور پر فلاسفی میں اقبال کی تینوں Teleological , ontological, cosmological arguments رد کر دی گئیں۔ مگر اقبال نے کوشش تو کی۔

اس وقت دین اور اعتقاد کو، جس کم ریٹنگ پر جیسے اب ہے اٹھایا جا رہا تھا۔ باہر سے

انکوائری اور معلومات کے اتنے سیلاب کا سامنا تھا کہ اس کے مقابلے میں ہمارے اس وقت کے دینی مدارس اور ادارے بڑی بری صورت پیش کر رہے تھے۔ جب جواب نہیں آتا تھا، تو وہ بے لوچ ہو جاتے تھے۔ مولوی اس اہلیت کا نہ تھا کہ پروفیسر وائٹ ہیڈ یا میکڈوگل کا جواب دیتا۔ جب ہم ان کے آلات ہی نہیں جانتے، انسٹرومنٹس ہی سے واقف نہیں۔ ان کی قینچیاں نہیں دیکھتے۔ ان کے کانٹے نہیں جانتے، تو اس کا جواب کیسے دیں گے؟ ہم تو زخمی ہو جائیں گے۔

اقبال نے پہلی مرتبہ اسلام کو جدید خطوط متعارف کرانے کی سعی ضرور کی۔ اگرچہ وہ خود اپنے دلائل اور اپنی کاوش سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لیے انتقال کے سمے انہوں نے دو قطعات کہے، جن میں سے ایک تو وہ ہے:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور دوسرا قطعہ یوں ہے

اگر می آید آں امائے رازے
بدہ او را پیامے جانگدازے
ضمیرے امتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

یہ رباعی بتاتی ہے کہ انہیں یہ شعور تھا کہ وہ آخری استاد نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ جو دوسرا، اگلا کام ہے، وہ کوئی دوسرا آ کر کرے گا۔ شاید وہ اس سلسلے میں کچھ لیٹ ہو گئے تھے۔ اس سب کے باوجود، اگر میں ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں، تو مجھے دو آدمی برصغیر میں نظر آتے ہیں۔ ایک ولایت کی سرزمین کے آسمان سید امہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف والے انتہائی پڑھے لکھے صوفی تھے۔ ان کی کیفیات کا میں نے جو مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، یہ خالصتاً اکیڈیمک، مذہبی اور اعلیٰ کلاسیکل تصوف ہے۔ جب میں اقبال کو دیکھتا ہوں، وہ جدید دور کے چیلنج کا سامنا کرتے ہیں۔ لیکن اتفاق دیکھیے کہ دونوں کی فکر کا تسلسل ناممکن ہے۔ مہر علی شاہ

صاحب کی گدی کا تسلسل ممکن نہ رہا۔ صوفی ازم کا کلاسیکل انداز اپنے اختتام کو پہنچا۔ جدید ٹمپل میں تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ دوسری طرف علامہ اقبال کی جو خصوصی شاعرانہ فیکلٹی اور مہارت تھی اور اس کا جو مغربی مطالعہ اور تجزیہ تھا کیا پتہ تھا کہ آئندہ زمانوں میں فلسفہ ہی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ جدید ترین سائنسز کو فروغ حاصل ہوگا۔

اب ایک مرتبہ پھر ایک مربوط کرنے والے کی ضرورت تھی، جو مادی اور تصوف کی دنیا کو دوبارہ اکٹھا کرنے کے بعد ایک نیا فکر تخلیق کرے۔ جس میں رکھ رکھاؤ کی قطعی گنجائش نہ ہو کیونکہ اس میز ازم نے تصویف کو تباہ کر دیا تھا۔ اکیڈیمک سختی و تنگی نے ان کو کہیں پہنچنے نہیں دیا۔ چنانچہ اس دوران ایک نئی فضا کی ضرورت تھی، جو جدید تر بھی ہوتی اور اپنے انداز میں متوازن بھی۔ اب ایک پتلون والے کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا بندہ، جو جیکٹ اور جینز میں کمٹمنٹ کا اظہار کرے۔ اب دھوتی نہیں پہنی جا سکتی تھی۔ اب ہمارا زیادہ تر تعلیمی مرکز یورپ ہے اور اگر یورپ سے ہم اپنا Academician مذہب کی جانب واپس نہیں لے سکتے، تو ہم مکمل شکست سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب صوفی کی ضرورت نہیں۔

اعتدال کی احسن صورت

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، پہلے عقل جبلت سے کم تر تھی۔ پھر رسول ﷺ کی صورت میں دنیا کا بہترین اعتدال پیدا ہوا اور انہوں نے ایسا ہی اعتدال پیدا بھی کیا۔ اس کو امت وسطی بھی کہتے ہیں۔ جب سے انسان بنا اور جب تک انسان رہے گا، اعتدال اور توازن کی مثال صرف رسول کریمؐ کی دی جائے گی۔ ایک جانب غیر مرئی واقعات و حالات کی انتہا ہے۔ اللہ کو سامنے دیکھنا ہے۔ جبریل سے روزانہ کی ملاقات ہے۔ غیر مرئی واقعات کثرت سے پیش آ رہے ہیں۔ ہاتھوں سے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ دوسری طرف اس شخص پر اس کے اتنے تمام اثرات ہیں کہ وہ انسانی رویوں کے اظہار میں بالکل میری آپ کی طرح ہیں۔ آپؐ ایک معجزاتی شخصیت ہیں مگر معجزے آپؐ کے معجزے کی وجہ سے نہیں، بلکہ آنحضرتؐ کے اعتدال مبارک کی وجہ سے ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال ممکن نہ ہو پائے، تو اس کے قریب ترین رہو۔

یہ ایک عجیب و غریب بیان ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ وہ اتنے عقل مند انسان تھے کہ اعتدال کو جامد نہیں سمجھتے تھے۔ اب جو بھی شخص خدا کی طرف چلے گا، اس کا معیار اعتدال ہے۔ اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ کون اللہ کے قریب ہے، تو جان لیجیے کہ اللہ اپنے نزدیک دیوانوں اور احمقوں کو نہیں رکھتا۔ اس نے نسلِ انسان کو ایک ٹیلنٹ اور شرف بخشا ہوا ہے۔ وہ یہ چاہے گا کہ انسان اس شرف کو استعمال کرے۔ یہ تمام اوصاف ایک چیز سے حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی جلد سے جلد اپنی ترجیحات کا تعین۔ جتنی زندگی ضائع کرکے آپ ان ترجیحات کے تعین تک پہنچیں گے، اتنے ہی آپ مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ وہ چاہے فرد ہو، سوسائٹی یا ملک ہو، جس قدر وہ ان ترجیحات سے دور ہے، اتنا ہی پریشان اور مصیبت زدہ ہے۔

ایک آدمی پچاس سال میں اس ترجیحات کو پاتا ہے۔ مگر پچاس سال میں خدا کے نزدیک اس کی ترجیحات کی قدر و قیمت کم ہوگئی۔ ایک شخص پچیس سال میں انہیں ترجیحات کو پا لیتا ہے اور اس کو پتہ ہے کہ میری زندگی اور میری سوچ، سب کچھ کا واحد مقصد یہ ہے کہ میں خدا کو پہچانوں، جب ذہن ترجیح اول کا اعلان کر لیتا ہے، تو خدا اور بندے کے ذاتی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بندے سے یہی توقع تھی کہ وہ غور کرے سوچے اور مجھے انٹلیکچوئل ترجیح اول وضع کرے۔ ہو سکتا ہے کہ ذہنی طور پر اس کو اولیت اور اولین ترجیح قرار دینے کے باوجود آپ اپنی زندگی میں اس کی اولیت قائم نہ رکھ پائیں۔ اس لغزش کی معافی مل سکتی ہے۔

گناہوں کی بخشش اس کے ہاں صرف اس وجہ سے ہے کہ اللہ یہ دیکھتا ہے کہ آپ نے بڑا مسئلہ بنیادی سوال تو حل کر لیا ہے۔ آپ کی کمزوریاں، کمیاں، ہو سکتا ہے، آپ کو ترجیحات کے فقدان پر مائل کریں مگر یہ آپ کا ذہن اور آپ کی سوچ و فکر کی بھرپور طاقت ہے، جس نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اللہ اپنے بندے پر فخر کر سکتا ہے کہ جس محنت اور مشقت کی بنیاد پر اس نے اپنے بندے کو اشرفیت بخشی، اس نے اسے استعمال کیا۔ حتیٰ کہ خدا انسان کی کمزوری کی وجوہ کو حکم دیتا ہے۔ تسلیم نہیں کرتا، حکم دیتا ہے کہ اگر تم بڑے گناہوں اور فواحش سے پرہیز کرو، تو چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ جب خدا خود کہہ رہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں کے دور تم پر آئیں گے، تو یہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر آدمی پر حماقتوں کے کچھ دور ضرور گذرتے ہیں۔ خطاؤں کے کچھ پیٹرن ضرور بنیں گے۔ اس لیے کہ خطا بذاتِ خود سیکھنے کا بھی باعث ہے۔

دو ارب سال سے انسان دنیا میں موجود ہے۔ تہذیب تو اس نے پچھلے تین سو برسوں سے پائی ہے۔ اتنا بڑا ال پیوند ہے کہ دو ارب سال سے انسان کے موجود ہوتے ہوئے اٹھارہ ہزار سال سے انسانی معاشرت کا باقاعدہ عقلی وجود ملتا ہے، تو بھی محض ہم تہذیب کے تین سو سال کے دوران سکائی سکریپر دیکھتے ہیں بلکہ سو سال سے بھی کم۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم نے انسان کے ذہن کی کشادگی کا عمل آہستہ رکھا۔ مسلسل اور آہستہ۔ اب جو اطلاعات کا سیلاب آ گیا ہے اس کی وجہ سے وجود ست پڑ گیا ہے۔

ذاتی اور پیغمبرانہ حیثیت

اللہ تعالٰی نے قرآن مجید میں فرمایا کہ زمین پر ایسا کوئی ذی حیات نہیں، جسے میں نے اس کے ماتھے سے نہیں پکڑ رکھا۔ چنانچہ واقعاتی اور حادثاتی کنٹرول کے لیے اللہ نے تمام ذی حیات اشیاء کو ریموٹ کنٹرول سے تھاما ہوا ہے۔ کوئی شیر کسی بکری کی چیر پھاڑ نہ کرے۔ کوئی بکری کسی شیر کا لقمہ نہ بنے۔ کوئی سانپ کسی کو نہ ڈسے۔ آپ کے پاس سے کبھی سانپ ایسے گذر جائے گا، جیسے اس نے آپ کو دیکھا بھی نہ ہو اور کبھی وہ وقت ہو گا کہ ذرا سی آہٹ پر آپ پر حملہ کر دے گا۔ یہ تمام چیزیں خدا کی طرف سے ہیں۔ کیونکہ خدا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دنیا میں آمدورفت کے رستے کنٹرول کرتا ہے۔ قتل و غارت، دنگا فساد، حلال و حرام دنیا بھر کے تمام واقعات و حادثات ہیں کہ جس جگہ جس خیال کو جوڑا گیا ہے، اسے تقدیر یا جبر و قدر کہتے ہیں۔ جبر کا اصل مطلب ہے زماں کو مکاں میں جوڑنا۔ ایک لمحہ زماں کو ایک لمحہ مکاں میں جوڑنے کو ہم جبر کہتے ہیں۔ یعنی یہ مقام ہے یہ وقت ہے اس میں آ کر ہم سارے جڑ گئے ہیں۔ یہ جبر ہے کہ اس وقت آپ اس محفل میں موجود ہیں۔

انسانی جبلت ایک زمانے میں بہت کم تر اور طاقتور تھی۔ پیغمبروں کو ایک پیغام دینا تھا۔ چنانچہ ان کی روحیں آزاد نہیں چھوڑی جا سکتی تھیں۔ پیغمبروں کی تمام زندگیاں پیغام کے مطابق تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے پیغمبروں کو کچھ عملی آزادیاں اللہ نے دی ہوئی تھیں اور ایک ایک حکم نازل ہوتا تھا اور طویل طویل عمریں تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ایک ہزار سال عمر تھی۔ حضرت نوحؑ کی ۷۳۹ برس تھی۔ ایک ناممکن تسلسل نظر آتا ہے، لیکن پیغام چھوٹا سا تھا، کہ اللہ ایک ہے۔

یعنی انسانی جبلت ایک زمانے میں اتنی پچی اور اتنی طاقتور تھی اور عقل اتنی کم کہ بار بار ہتھوڑے کے ذریعے انسانی دماغوں پر ضرب لگانی پڑی تھی کہ اللہ ایک ہے اور نو سو برس پیغمبر کو گذر گئے اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ جبلی سختی اتنی تھی کہ نو سو برس میں بھی وہ پیغام معدودے چند کشتی میں سوار ہونے والوں کے سوا کسی تک پہنچ نہ پایا۔ یہ بالکل وہی حساب ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا دماغ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ غیر استعمال شدہ، اس میں عادات ابھی راسخ نہیں ہوتیں۔ اس کا رویہ اردگرد کی سکھلائی سے شعور پانا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر ایک نوزائیدہ بچے کو آپ نے $e = mc^2$ پڑھانا سکھانا ہے تو آپ کے کم از کم سات برس تو ضائع ہی ہوں گے۔ آپ اس کو روز کہیں گے کہ $e = mc^2$ لیکن چونکہ اس کے پاس سیکھنے کی وہ صلاحیت نہیں ہے اس لیے وہ نہیں سیکھ پائے گا۔ حتیٰ کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا، حساب پڑھے گا، اسے آلات سے آگہی ہوگی، دماغ اس قابل ہوگا۔ شاید پچیس برس بعد وہ کہے کہ بس کر بابا، سمجھ آ گئی ہے۔

جب انسان ترقی یافتہ ہوا ہے، تو اس کا ایک دم سارا ذہن ترقی نہیں پایا۔ آہستہ آہستہ، ایک پورا بند پیکٹ تھا، جس کا ایک دروازہ کھلا دوسرا اور پھر تیسرا کھلا۔ اور آج جب ہم کہتے ہیں کہ انسان سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے تو اس کے کل دماغی سیلوں میں سے بمشکل ایک فیصد بھی استعمال نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر اٹھارہ بیس کروڑ سیل ہیں، تو ان میں سے بمشکل لاکھ دو لاکھ استعمال ہونے کے قابل ہوئے ہیں۔ دماغ کی کائنات کتنی وسیع ہے اور انسان کو دیکھیے کہ وہ ابھی تک اس کی کشادگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے۔ اب تھوڑی بہت سائنسز کا آغاز ہوا ہے، تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس صلاحیت سے نوازا ہے، وہ اچانک نہیں ہے۔ آہستہ اور تدریجی ہے۔ قرآن حکیم میں شراب کی ممانعت اٹھارہ برس میں آئی ہے۔ بائیس سال میں قرآن نازل ہوا۔ قرآن کا نزول ایک دن میں بھی ممکن ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے طریقہ سکھا دیا ہے۔ آہستہ آہستہ لیکن بتدریج اور مسلسل قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دیکھو، شراب بری ہے اور اچھی بھی، لیکن اس کی برائیاں اچھائیوں سے زیادہ ہیں۔ ''پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوا کیا ہے؟ اعلان فرما دیجیے کہ اس میں لوگوں کے لیے نقصانات اور فوائد ہیں اور اس کی برائیاں اس کے فوائد سے زیادہ ہیں۔''

بس اشارہ دے کر چھوڑ دیا۔ جو زیادہ ذہین تھے، یہیں سے سمجھ گئے، باقیوں نے کہا کہ

چانس ہے اللہ نے حکم نہیں دیا۔ چنانچہ پیا پلانا جاری رکھا۔ حتیٰ کہ نمازوں میں جب پوری سائیکی پیچھے سے دباؤ ڈالتی تھی، تو لات و عزیٰ کے نام پڑھ جاتے تھے۔ پھر اللہ نے کہا، دیکھو یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ میں نے اتنی مشقتوں اور اتنے پیغمبروں کے ذریعے تمہارا ایک ایک پل سنوارا ہے اور تم آنِ واحد میں اس پر پانی پھیر دیتے ہو۔ تو کہا، نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم پیے ہوئے ہو۔

اس طرح کا ایک وقفہ پانچ نمازوں کے دوران دے دیا گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے پینے سے گریز کیجیے۔ پھر متعدد واقعات ہوئے، تا آنکہ آخری حکم نافذ ہوا۔ پیغمبر کی زندگی اتنی طویل نہ ہوتی، اگر یہ محض پیغام دینے کی بات ہوتی کہ آیا، پیغام دیا اور رخصت ہو گیا۔ وہ ایک لمحاتی زندگی ہوتی۔ وہ ایک سال میں قرآن پڑھ کر سناتے۔ پیغام پہنچ گیا؟ اب رخصت دیجیے لیکن اس میں ان کے 63 سال بیت گئے۔ قرآن حکیم میں اللہ قسم کھاتا ہے۔ اے پیغمبر، مجھے تیری عمر مقدس کی قسم! تیرے ایک ایک لمحہ حیات کی قسم! کہ تجھے میں نے گنا چنا وقت دیا اور تیرا ایک ایک لمحہ میں نے کاؤنٹ کیا ہے۔

اس لیے ریموٹ کنٹرول کی بجائے اسے ہم ٹوٹل کنٹرول کہتے ہیں۔ پیغمبر ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ ان کی غلطیاں بھی اسی کنٹرول سسٹم کا حصہ ہوتی ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ایک اجتہادی خطا کی۔ اس کی قرآن سزا بھی دیتا ہے۔ ”اور چلا غصے میں بھرا ہوا ذوالنون اور اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر دن تنگ نہ کریں گے۔ جب ہم نے اس کو گھیر لیا، تو اس نے ظلمات میں سے ہمیں پکارا، لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین. اب اس کا ترجمہ دیکھیے، کتنا مؤثر اور سادہ ہے کہ خدا پاک ہے غلطی سے، مجھ میں غلطی کا امکان ہے، میں نے غلطی کی ہے، آئی ایم سوری! اس پوری آیت کا ترجمہ بے حد سادہ ہے۔ You make no mistakes. I can make mistakes, I have made a mistake. I'm sorry.

یہ اتنا کہنے کے برابر ہے کہ اے پروردگار میں نے غلطی کر لی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ اتنی سادہ آیت کو اردگرد کے صوفیا لوگ کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ پانی میں بیٹھ کر پڑھو، پہاڑ پر چڑھ کر پڑھو، یہ آیت بڑی جلالی ہے۔ فلاں بڑی ہے۔ گھروں میں جائیں، آپ کو حیرت انگیز حماقتوں سے واسطہ پڑے گا کہ موم بتیاں جل رہی ہیں، اگر بتیوں کی خوشبوئیں آ رہی ہیں، کئی

اقسام کے اہتمام کیے جا رہے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں آیت کریمہ پڑھی جا رہی ہے۔

اب اس پیغمبر کو دیکھیے، جس نے یہ آیت پڑھی تھی۔ مچھلی کا پیٹ ہے، غلاظت اور گندگی ہے، وضو کی گنجائش نہیں ہے۔ تین دن اور تین راتوں کے بعد جب پیغمبر کو باہر نکالا گیا، تو ان کی جلد اتنی گل سڑ گئی تھی کہ خدا نے کدو کی بیل اگائی، اس کا سایہ کیا۔ جلد ارمل ہوئی، تو کدو کی بیل سوکھ گئی۔ حضرت یونسؑ بن متی نے گلہ کیا کہ اے پروردگار! اس بیل کا تھوڑا سا مجھے سکھ پہنچ رہا تھا، تو نے اسے بھی سکھا دیا۔ اللہ نے کہا، ایک بیل جو تجھے سکھ دے رہی تھی، اس کے سوکھنے کا کتنا صدمہ ہوا اور اے یونس، میں نے ایک لاکھ انسانوں کا شہر بسایا تھا، اگر میں ان کو عذاب دے کر ختم کر دیتا، تو مجھے صدمہ نہ ہوتا؟

اس میں ایک سبق ہے کسی پیغمبر کی خطا بغیر سبق اور بغیر انسان کے فیض کے نہیں۔ اب اس آیت سے کیا فیض ہے؟ فرمایا، جب اس نے اس سادگی سے مجھ سے استدعا کی، تو میں نے اسے بخش دیا۔ صرف اسی کو نہیں، بلکہ جو بھی مومن مجھ سے اخلاص کے ساتھ اس طرح معذرت خواہی کرے گا، میں اسے معاف کر دوں گا۔ وہ خطا کیا ہوئی، جو قیامت تک انسان کے لیے منفعت بخش بن گئی۔

تمام پیغمبر ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں اور ان کا ایک ایک لمحہ چاہے خطا ہو یا جزا، آپ کے لیے ایک Symptom of creative faculty تخلیق کر رہا ہے۔ وہ آپ کے لیے ایک درس ثابت ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی دعائیں، جو قرآن کریم میں ریکارڈ ہوئی ہیں، آپ کے لیے سوغاتیں ہیں۔ ان کو خطا نہیں کہا جا سکتا۔ خطا ان کی اللہ کے نزدیک ہے۔ اللہ کے نزدیک خطا کا ایک پیٹرن تخلیق کیا گیا، جس میں سے ثواب آپ کو مل رہا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں کہ پیغمبر غلطیاں کرتے ہیں۔

ہماری اپنی زندگیاں اتنی کنٹرول ہوتی ہیں۔ ان میں تمام حالات وواقعات وآثار ایک ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ آزادی تو صرف ذہنی اپروچ کی ہوتی ہے۔ وہ ذہن جو ایک چیز سے اچھا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جب رسول ﷺ سے شاعری سے متعلق پوچھا گیا، فرمایا شعر اچھا بھی ہے، برا بھی ہے۔ حسان بن ثابتؓ کی شاعری کی داد دینے جبرئیل امینؑ بھی تشریف لاتے ہیں اور دوزخ میں سب سے زیادہ عذاب، جو شاید ہو سکتا ہے، وہ زہیر، سلیمی کو یا امراء القیس کو ہو، جو

تشبیب کے علاوہ شاعری ہی نہیں کرتا۔

آزادی میں حائل خدا

یہ آپ کے علم پر منحصر ہے کہ جن چیزوں کو آپ اپنی آزادی سمجھ رہے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک آپ کے لیے بہت مضرت رساں ہو سکتی ہے۔ اللہ نے کہا ہوا ہے، وعسی ان تکرھوا شی و ھوا خیرلکم کسی چیز سے تم کراہت کھاتے ہو، اس میں خیر ہوتی ہے و عسی ان تحبو شیی و ھو شرلکم کسی چیز سے تم محبت رکھتے ہو اور اس میں شر ہوتا ہے۔ و اللہ یعلم و انتم لا تعلمون اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ سب سے بڑا کریڈٹ آپ خدا کو یہ دیتے ہیں کہ وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ کسی بڑے سے بڑے ذہین شخص کے لیے بھی بڑی تسکین کی بات ہوتی ہے کہ مجھ سے بھی بڑا کوئی علم والا موجود ہے جس کے سامنے میرے علم اور حیثیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ میرے لیے فیصلہ کرتا ہے اور میں اپنی سوچوں اور خیالوں میں اس سے مدد مانگ سکتا ہوں۔

آزادی کا پیٹرن بڑا ناقص ہے۔ مثال کے طور پر ٹونی بلیئر کہتا ہے کہ "یہ ہم مہذب لوگوں پر حملہ ہے۔" اس نے یہ کئی مرتبہ کہا۔ مجھے یہ بات بڑی احمقانہ سی لگی کہ تم یورپین لوگوں کے سوا اور کوئی مہذب ہی نہیں ہے۔ یہ بذاتِ خود اتنے منفی اور احمقانہ ریمارکس ہیں کہ اس سطح کے سیاستدان اور شخصیت سے اس کا بیان بچگانہ سی بات لگتی ہے مگر ان سے اگر پوچھا جائے کہ مہذبانہ رویہ ہے کیا؟ تو یہی نکلے گا کہ Lesbianism یا Homosexuality جیسے جتنے بھی کام ہیں، جنہیں ہم غیر اخلاقی سمجھتے ہیں، وہ اس قسم کی آزادروی کو آزادی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ وہ آزادی جو ہمیں کسی بڑی تباہی سے دوچار کر دے، اسے آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ خیالات کے پراسیس کی ایک خود ساختہ سٹائل کی انفرادیت ہے، جو بندے کو قائل کر رہی ہے کہ یہ درست ہے۔ مگر چونکہ اس کو سمجھانے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اس کے تجربات بھی محدود ہوتے ہیں، اس سے آگے چل کر وہ کسی بڑی ناکامی یا مسئلہ کا باعث بن جاتے ہیں۔

اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ خدا آپ کی آزادی میں حائل ہے۔ خدا اپنے پرسنل حقوق کے بارے میں بہت خاموش ہے۔ پورا قرآن شریف پڑھ لیں، خدا کہتا ہے، اگر تم میری عبادت

کرتے ہو، تو مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر نہیں بھی کرو گے، تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہے۔ عبادت میں معاشرے کے لیے ایک محفوظ ایریا رکھا ہے۔ اس ایریا سے باہر ضرور تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر اس ایریا کے بیچ میں رہو گے اور حدود اللہ کی حفاظت کرو گے، تو پھر آپ کو قیامت تک کوئی پرابلم پیش نہیں آئے گی۔

آزادی کا دوسرا رویہ یہ ہے کہ مہذب معاشرے چوروں چکاروں، بدمعاشوں کو، جو کہ سوسائٹی کے لیے خطرہ ہیں، خیالات کی آزادی بھی دیتے ہیں اور ان سے بہت سی سزا بھی ہٹا دیتے ہیں۔ مگر سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن کا ہاتھ کاٹنے والا قانون غلط ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ جو نظام آپ دیتے ہیں، کیا اس کے نتائج اس سے بہتر ہیں؟ پچھلے تین چار سو سالوں سے یورپین نے جرم وسزا پر اتنے تجربات کیے ہیں کہ وہ بالآخر سب کے سب ناکام ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ آخری بار انہوں نے نیویارک میں سزائے موت دوبارہ نافذ کر دی ہے۔ چنانچہ جب تک آپ اچھا متبادل نہیں لاتے، اس وقت تک آپ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوتے۔

آزادی کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا سے بہتر سوچتا ہوں اور میرا دعویٰ ہوتا ہے کہ میں خدا سے بہتر جانتا ہوں۔ خدا اس معاملے میں بہت ہی لبرل ہے۔ بلکہ زمانہ رسالتؐ میں جب بھی کسی شخص نے اپنے طور پر اچھی رائے دی، تو آسمانوں سے لبیک آئی کہ میرے بندے نے بہتر سوچا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ جس طرح اذان کا پیٹرن آیا، تو اسی اذان کے پیٹرن کی تائید بھی آ گئی۔ اسی طرح اللہ کی تعریف کے بڑے بڑے پیٹرن تھے۔ جب ایک بدو نے کہا کہ **الحمد اللہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فی** تو پتہ چلا کہ آسمان کے فرشتوں کے پاس اس کا ثواب لکھنے کی کوئی حد ہی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ فرشتے اس بات پر پریشان ہیں کہ اس کا اجر کیا لکھیں، کیونکہ یہ نصابی کتاب میں نہیں ہے۔

سو انسان اپنے اندر کوئی عجب بات پیدا کر سکتا ہے۔ اللہ ہی کے قول کے مطابق کرمنا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو کرامت بخشی ہے۔ اللہ بڑا لبرل ہے۔ بلکہ کئی مرتبہ آپ اس سے جھگڑنے اور سوال کرنے میں لبرٹی لے لیتے ہیں۔ آپ اس کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں صحیح سوچ رہا ہوں۔ اللہ میاں آپ خواہ مخواہ مجھ پر جبر فرما رہے ہیں، لیکن پھر آپ کو وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور دیکھنا ہوگا کہ آپ صحیح تھے یا خدا صحیح تھا۔ جب یہ لمحہ آ جائے اور پتہ چل جائے کہ

خدا سچ کہہ رہا تھا، تو پھر آپ کا حق نہیں بنتا کہ آپ اتنے اچھے دوست کے ساتھ خواہ مخواہ الجھتے پھریں۔

خدا قرآن میں کہتا ہے کہ میں نے انسان کو ایک چھوٹے سے نطفے سے بنایا اور یہ نکلتے ہی مجھ سے جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ ہم خدا کے ساتھ دلیل بازی جاری رکھتے ہیں ایسا کوئی بندہ دنیا میں نہیں ہے، جو دلیل بازی نہیں کرتا۔ مگر جس بات کو آپ خدا کی متابعت یا خدا کی محبت کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف اسی کے ساتھ جھگڑیں، کسی اور سے نہ جھگڑیں۔ جب آپ کی کمٹمنٹ اتنی صاف ستھری اور پختہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں مانتے، تو لامحالہ آپ کا ہر گلہ، ہر جھگڑا اور فساد اسی کے ساتھ ہوگا مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ جھگڑے کی وجہ سے اس سے بے وفا ہو جائیں۔ وہ تمام حدود، جن کے اندر خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں۔ ان میں آپ ہمیشہ اللہ سے دلیل بازی کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کہیں، اللہ میاں تم میری بات نہیں مانتے، چلو چھٹی۔ اللہ حافظ، میں یہ جا رہا ہوں میں کمیونزم کی طرف یا ڈیموکریسی کی طرف رخ موڑ رہا ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

موسیقی سننے کی آزادی

میں نہیں سمجھتا کہ خدا نے موسیقی کے تصور کو اس طرح مسترد کیا ہے۔ اس سے اس کا تعلق نہیں۔ تاہم اگر توریت دیکھیں، تو ہمیں نغمات سلیمان نظر آتے ہیں۔ ان کا نام ہی نغمات سلیمان ہے۔ وہ بڑے قیمتی اقوال ہیں ان کی پرانے مذاہب میں مستقل حیثیت ہے جو کہ منع نہ تھے۔ موسیقی کے آلات moral نہیں ہیں، یہ Immoral بھی نہیں ہیں۔ یہ amoral ہیں۔ ان کا جواز آپ کے نتائج خیال سے ہوگا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم ہے کہ رسول اللہ کی خادمہ کا جب نکاح ہوا، تو آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا، اے عائشہؓ گانے والیاں ساتھ نہیں بھیجیں؟ فرمایا مجھے خیال تھا کہ آپ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ فرمایا نہیں، یہ تو رسم و رواج ہے۔ اس موقع پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے لوگوں کو تھوڑا سا انجوائے کرنے کا حق نہیں دیا۔ 10، 15 سال پہلے اخباروں میں شاہ فیصل کو ڈانس کرتے دکھایا گیا۔ وہ اپنے گاؤں میں اپنے قبیلہ میں گئے اور ہلکی ہلکی دف کی موسیقی میں ڈانس کر رہے تھے۔ یہ اشتعال کے رستے نہیں ہیں۔ ایک

ڈانس جو اشتعال اور شہوات کا راستہ ہے ایک صرف باڈی فگرز کی قطار بندی (Alignment) ہے۔ حج کے موقع پر اللہ نے کہا کہ ذرا شانے مار کے چلو۔ اس وقت اہل کفر تھے، ان کو پتہ چلے کہ تم کمزور لوگ نہیں ہو۔ جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط ہو۔ خدا موزوں اور منطقی تکنیک اپنے لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

جس موسیقی کو وہ منع کرتا ہے، وہ موسیقی ہے جو صرف اور صرف شہوات کو جاتی ہے۔ یورپ سے بہت سے بچے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے کہ ہم موسیقی کے بغیر سو نہیں سکتے۔ یہ موسیقی اصل میں موسیقی رہتی نہیں ہے۔ وہ شور کا ایک ٹمپر ہے جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ وہ بڑے ذہین بچے ہیں۔ موسیقی چل رہی ہو تو پڑھتے رہتے ہی۔ موسیقی نہ ہو، تو انہیں خلا محسوس ہوتا ہے جس میں وہ پڑھائی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے پس منظر کی موسیقی کا صرف ایک اسکالر کی طرف سے تعین ہو سکتا ہے کہ آیا یہ جائز ہے یا نہیں۔ مگر اس کو ترجیح نہیں بنا چاہیے۔

الیاس کے معانی

الیاس ایک پیغمبر کا نام ہے۔ وہ ان دو تین پیغمبروں میں سے ہیں، جو زندہ اٹھائے گئے۔ ان کا قرآن میں اصل نام ال یاسین ہے، جسے عمومی طور پر الیاس کہا جاتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا سراغ ہمیں اسیری بابلی تہذیب میں ملتا ہے۔ وہ قانون کا تحفظ کرنے والوں میں سے ایک تھے اور انہوں نے ان لوگوں کو قصاص کا تصور دیا تھا۔ ان نام میں چند بنیادی خصوصیات بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ یہ نام پیدائشی طور پر بہت زیادہ حساسیت کا مالک ہوتا ہے۔ دوسرا شروع میں یہ حجاب اور Seclusion (تنہائی) میں آتا ہے۔ اس کے لیے بڑی دشواری ہے کہ اسے نوجوانی کی عمر میں تیزی سے حرکت والا نہیں پائیں گے۔ دوسرا یہ لوکل ذمہ داریوں سے اٹھتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ بہت آغاز میں آپ احساس ذمہ داری کے بوجھ سے دبے ہوئے ہوتے ہیں، جو شاید ہی کوئی آپ کے ارگرد اس میں شیئر کرے۔ اس کی وجہ سے ایک اذیت اور دکھ کا احساس آپ کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود یہ نام اختیارات کے حصول کا بے حد خواہشمند ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کا دبا دبا غصہ بے تحاشا ہوتا ہے۔ آپ اپنی بہت کوشش کے باوجود مایوی اور غصے سے نجات حاصل نہیں کر پاتے۔

ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ جس نام کے ساتھ الف زیر اور ل لگ جائیں، یہ براہ راست اس پیٹرن میں چلے جاتے ہیں، جسے ہم اللہ کا پیٹرن کہتے ہیں۔ اس میں کمانڈ اور ذمہ داری دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ان کی اداسی دیکھیے کہ تمام زندگی میں یہ کبھی بھی خیال نہیں کرتے کہ جو ان کا منصب یا محنت تھی، کیا اس کے مطابق انہیں صلہ ملا ہے۔ آخر میں پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان ان میں دل کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ دل پہ ضرور ان کے دباؤ پڑتا ہے اور جھلاہٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اور امن آخر میں صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے۔ ورنہ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔

اعتدال، اسلام کو مطلوب

حضور پاکؐ کا ارشاد عالی ہے کہ اعتدال اختیار کرو۔ اگر تم مکمل اعتدال اختیار نہ کر سکو تو اس کے قریب ترین پہنچو۔ یہ بیان اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ رسول اللہؐ نے پہلی دفعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اعتدال کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ آپ اس میں تھوڑا سا آگے نکل سکتے ہیں، تھوڑا سا پیچھے جا سکتے ہیں مگر اس ایریا کے درمیان آپ کو خطرات کم محسوس ہوں گے۔ اس ایریا کے گرد اللہ تعالیٰ نے کچھ ”بتیاں“ لگائی ہیں۔ کوئی سنگِ میل رکھا ہے اور فرمایا **تلک حدود اللہ** یہ اللہ کی حدود ہیں، **و من یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون**، جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھا وہی ظالموں میں سے ہے۔

تصوت کے اس وقت جتنے بھی تصورات اور خیالات گردش میں ہیں، ان میں سے اکثر کا تصوف کے اصل علم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور جتنے بھی آپ کو بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں کچھ آج کے، بلکہ بہت سے آج کے ہیں اور کچھ پہلے کے، ان کو اگر ہم کڑی پرکھ پر رکھیں، تو وہ تصوف کے دائرے میں نہیں آتے۔ یہ جسے کرامت کہتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے اپنی محبوبیت ظاہر کرنے کی ایک نشانی ہے۔ یہ کسی صوفی کا وراثتی کمال نہیں بلکہ کسی صوفی کے لیے دعویٰ اور کسی قسم کی وجاہت جلی سم قاتل ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ نے کہا کہ آخری چیز جو سینہ انسان سے نکلتی ہے وہ حب جاہ ہے۔ صوفی کبھی وعدہ نہیں کرتا اور نہ کبھی دعویٰ کرتا ہے اس کے برعکس ہم آج کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ صوفی یا متصوف جو آدمی بھی ہے، وہ اپنی کسی نہ کسی کوالٹی کا بڑا دعویٰ کرتا ہے۔

مجھ سے ہری پور میں کسی آدمی نے پوچھا تھا کہ کیا آپ خدا کو جانتے ہیں؟ میں نے اسے کہا کہ میں انکار کروں تو جھوٹ بولوں اور اگر اقرار کروں تو دعویٰ ہے۔ اس لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

ہمارے اردگرد جس قدر بھی کلچر اور تفہیم ڈویلپ ہوتی ہے اس میں ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ علم کیا ہے؟ احاطہ علم کیا ہے اور علم جس ہستی میں رکھا جاتا ہے اس کا پیٹرن کیا ہے۔ کائنات میں قرآن سے بڑا علم تھا نہ ہے نہ ہوگا۔ یہ خدا کا علم ہے۔ اس میں افزائش کائنات سے انجام کائنات تک ہر چیز ہے۔ خداوند کریم نے اس بگ بینگ تھیوری سے آغاز اور قیامت تک کائنات کی تخلیق کا پورا نقشہ دیا ہوا ہے۔ اس کے بیچ میں تمام انسانی دانش ورانہ چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ انسان کس سطح پر کیا سوچے گا، کیا کرے گا؟ اس کے پاس کیا اہلیت ہوگی، کیا اہمیت ہوگی؟ یہ عجیب لگتا ہے کہ اگر مغرب کا ایک اسکالر اٹھ کر کہے کہ اللہ کے علم میں نہیں تھا کہ آئن سٹائن Theory of relativity (نظریہ اضافیت) دریافت کرے گا۔ Quantum دریافت ہوگی یا اسی طرح کی کئی اور تھیوریاں دریافت ہوں گی۔ یہ انسان کی طرف سے بڑی احمقانہ سی بات لگتی ہے۔

انسان ہمیشہ اپنے بارے میں مبالغہ آمیزی کرتا ہے۔ اسے دو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ وہ بنادی طور پر خود پسند ہے۔ اس کی خود پسندی کی ایک بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا اور اہم سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پروردگار عالم نے مجھے بنا کر پتہ نہیں کیا ایسا کمال کر دیا تھا۔ حالانکہ قرآن یہ بات نہیں کہتا، قرآن کہتا ہے کہ میں نے ایسے سات آسمان اور ایسی سات زمینیں بنائی ہیں۔ اگر انسان کو پتہ نہ ہو کہ اس قطعہ ارض جیسی سات قطعہ ارض اور ہیں۔ ان پر انسان پل بڑھ رہا ہے۔ اس کو تعلیم دی جا رہی ہے اور اس کا کلچر مرتب ہو رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں سات کائناتوں میں سات انسانوں کی زندگی پھل پھول رہی ہے۔ ان کو ایک ہی آزمائش سے گزارا جا رہا ہے اور جس جنت کے تصور کو ہم نے اتنا محدود رکھا ہے وہ اتنی بڑی گلیکسی ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین بھی اس کی ایک چوتھائی کے برابر نہیں۔

ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے دو چیزیں انسان میں ایک دوسرے کے تضاد میں ہیں۔ ایک تو ذاتی اہمیت جس میں اس کی غلطی پر اللہ نے شروع میں ہی اس سے کہا کہ انہ کان ظلوماً جہولا کہ بلاشبہ وہ دولت عرفان اور عقل کی تحصیل کرتے ہوئے ایک غلطی کر گیا۔ اپنے آپ کو Over Estimate کر گیا۔ جاب کو Under estimate کر گیا۔ اللہ تو بڑا سچا ہے۔

اب سات ارب کی دنیا میں چھ ارب تو مطلق خدا سے غافل ہیں اور جو ایک ارب مسلمان ہیں، ان کو اتنے بڑے دھوکے اور سراب پڑے ہوئے ہیں کہ بمشکل ہم ۵ ، ۱۰ ہزار صحیح مسلمان نکال سکتے ہیں۔ خدا تو ٹھیک کہتا ہے کہ اس نے بڑا آسان سمجھ لیا تھا کہ آئیں گے۔ اللہ اللہ کریں گے۔ ہمارے پاس عقل ہے۔ ہم خدا کو کیوں نہ مانیں گے۔ اقرار خداوند کر کے جنت حاصل کر کے لوٹ جائیں گے۔ یہ انسان کی غلط فہمی ہے۔

بہر حال صحت مند عقل سے خدا کا عرفان حاصل کرنا اور غور و فکر کرنا، عقل کی اصل قدر ہے۔ اللہ نے عقل کے ذمہ ایک کام لگایا ہے۔ باقی ضمنی کام ہیں۔ انا ھدینہ السبیل ہم نے تمام عقل و شعور تمہیں ایک کام کے لیے بخشا ہے۔ اما شاکراً واما کفورا چاہو تو مجھے مانو، چاہو، تو میرا انکار کر دو۔ یہ اولین ترجیح ہمارے تجسس میں ہے اور انسان اس میں ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ اولین ترجیح میں تاخیر ہو جاتی ہے اور زندگی کی کم تر ترجیح حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ تمام لوگ بیک وقت یہ بڑی غلطی کرر ہے ہیں۔

اس کے نتیجے میں اس کے پیٹرن بدلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ عجیب و غریب محسوس کرتا ہے۔ ایک شعر لکھنے میں کیا بڑی کوالٹی ہے۔ ایک وصف ہی تو ہے۔ یوگا والا اپنے آپ کو نرالا کہتا ہے۔ انسان جس چیز میں ارتکاز توجہ کرتا ہے یا سپیشلائزیشن کر لیتا ہے، وہ نرالا سا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی دو ٹوٹے ہوئے شعر لکھنے کی صلاحیت کیا آئی، وہ بدل گیا۔ رنگ تبدیل ہو گیا، بال بکھر گئے، آنکھیں وحشت انگیز ہو گئیں۔ جیسے پتہ نہیں، کیا عجیب و غریب کمال اس کو حاصل ہو گیا۔ اب اللہ کے رسول کو دیکھیے، جس پر کائنات کا سب سے عجیب و غریب عرفان اتر رہا تھا۔ جس پر صبح و شام جبرائیل اترتا تھا جس کی آنکھیں ملاء اعلیٰ کو دیکھتی تھیں۔ جو اپنے درمیان سے حجابات اٹھا کر فرشتوں کو دیکھتا تھا، وہ کبھی ابنارمل یا سب نارمل نہیں ہوا۔

اگر قرآن سب سے بڑی کتاب علم ہے، تو ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ دیکھنا ہے کہ یہ کتاب علم ابنارمل کو گئی ہے یا سب نارمل کو گئی ہے۔ پتہ لگتا ہے کہ نارمل کو گئی ہے۔ جوں جوں علم اور اعتدال بڑھتا ہے، سارے انگریز منصف کہتے ہیں کہ inconsistency is the virture of genis کہ وہ آدمی بڑی عقل والا ہو ہی نہیں سکتا جس میں چند بیوقوفایاں بھی شامل نہ ہوں۔ ہم نے پیغمبر کی زندگی دیکھی ہے، جو دنیا کا نمبر ون آدمی ہے۔ یہ ہم نہیں کہتے اگر کارلائل

نے ہیرو چنا، تو محمد رسولؐ کو چنا۔ اگر مؤرخ نے Tenhgreath men of history منتخب کیے تو نمبر ون محمد رسول اللہ کو چنا۔ ہم نے نہیں کہا، انہوں نے کہا۔ جو دنیا کا نمبر ون آدمی ہے وہ اتنا نارمل ہے کہ زندگی کی ہر راہ پر کھڑا آپ کو راستہ دکھاتا ہے اور یہ وہ بات ہے، جس کو میں مانتا ہوں۔ جذب و مجذوبیت اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن وہ زندگی کا بہترین حصہ نہیں۔

اگر مجذوب بڑے ہوتے۔ خدا کو یہ مستی جذباتیت پسند ہوتی، تو یقیناً اصحابؓ میں کچھ مجذوب بھی ہوتے۔ وہ تو بڑے نارمل لوگ تھے۔ تمام زندگی انہوں نے عملی انداز سے گذاری۔ مگر ایک فرق ضرور ہے کہ جب بھی انہیں اولین ترجیح میں بلایا گیا انہوں نے دیر نہیں لگائی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑے استاد کے تلے ہیں۔ ایک بہت بڑی اکیڈمی آف لیڈرز میں تھے، جو ان کا سب سے بڑی کائنات کا ٹیچر تھا۔ انہوں نے ایک سبق ضرور پڑھایا تھا کہ زندگی میں اللہ کو ہمیشہ ترجیح اول سمجھنا ہے۔

میری زندگی خلق خدا کے درمیان گذرتی ہے۔ میرا عذاب اور ثواب اللہ کے پاس محفوظ ہیں، میں ان درویشوں میں سے نہیں ہوئی، جنہیں میں امرا درویش اس لیے کہتا ہوں کہ ان کے دربان ہوتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ اور انداز ہوتے ہیں۔ آنے والا خوف اور جھجک سے آتا ہے ڈر ڈر کے قدم رکھتا ہے مگر میرے پاس الٹا حساب ہے۔ میرے اور میرے دوستوں کی محبت اتنی شدید ہے کہ ہمارے درمیان کوئی حجاب، سلام نہ دعا کا کوئی تکلف ہوتا ہے۔ ہم لوگ اتنے آزاد ہوتے ہیں کہ میں انہیں دانستہ اس کی اجازت دیتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ذہنی استعداد کو بڑھنا چاہیے۔ جو بھی فرد اطاعت اور بندگی کے سبق دیتا ہے اسے اوپن ہونا چاہیے۔ عقیدت علم کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ میں محبت کی تو اجازت دے سکتا ہوں اگر دو دلوں میں ہو مگر میں اس عقیدت کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا، جو آپ سے سوال چھین لیتی ہے۔ آپ سے تجسس کا گلا آپ کے اندر گھونٹ دیتی ہے اور آپ اندھا دھند ناقابل فہم اور ناقابل یقین انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی علم، ارادت اور کوئی مسند ارشاد نہیں ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی استاد، جو سب سے پہلی بات کرتے ہیں، وہ لوگوں کو بندگی اور عقیدت کا سبق دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ وہ بہت ساری تصوف کی پیچیدگیوں کو نہیں جانتے۔ تصوف علوم ذات اور اپنی ذات کی سائیکاٹری سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں دورِ حاضر کی

نفسیات ختم ہوتی ہے، صوفی کا ادراک وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نفسیات ایک کمتر سیلف کو بہتر سیلف میں ڈال دیتی ہے۔ ایک مجبور و مقہور اور گھٹی ہوئی ذات کو کارآمد بنا کر سوشل کر دیتی ہے مگر اس کے پاس یہ ٹاسک نہیں ہے کہ وہ سیلف کو سرنڈر کر کے قوم کی خدمت کا تصور دے۔

جب تک کمتر سیلف بہتر سیلف ہوتا ہے، ہم نفسیات کے ساتھ ہوتے ہیں مگر جب نفسیات کی یہ سٹیج ختم ہوتی ہے تو ایک صوفی پھر بھی اپنے سیلف کے خلاف لڑ رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے پاس ہمارے لیے کوئی رعایت نہیں۔ و اما من خاف مقامہ ربہ جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا و نہی النفس عن الوی تو اس نے کبھی اپنے نفس کی مخالفت ترک نہیں کی۔ ھوئی مروج فیشن اور رجحانات کو کہتے ہیں۔ ھوئی زیادہ تیزی سے دل و دماغ پر قبضہ کرتی ہے۔ اگر کوئی فلاسفی آ گئی ہے تو دیکھتے دیکھتے دانشورانہ ماحول کو کھا جائے گی۔ اگر کمیونزم، سوشلزم اور تاریخی مادیت کا فلسفہ آ گیا ہے تو ایک نئی ریچ کی وجہ سے ذہن ان خیالات کو بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ ذہن کو اچنبھا ہوتا ہے اور جس چیز سے اس کو اچنبھا ہو، اس کے حصول میں وہ بے چین ہوتا ہے کیونکہ تجسس دانشور کا بنیادی وصف ہے۔

صوفیا کو ان حالات سے بڑے تحمل سے گذرا ہوتا ہے۔ وہ ایسی کسی ابتدائی سٹیج میں فیصلہ ساز نہیں ہوتا۔ اس کا ڈیٹا بہت مکمل ہونا چاہیے۔ ویسے بھی میں جن استادوں کے ساتھ کاموں، ان میں کم درجے کا انٹلکچوئل کوئی بھی نہیں گذرا۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے فلسفی، سب سے بڑے محقق ہیں۔ چاہے وہ شیخ جنیدؒ ہوں، علی ہجویریؒ یا چاہے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یا خواجہ علی حسنیؒ ہوں۔ یہ سارے کے سارے اپنے زمانے کے مکمل انٹلکچوئل ہیں اور اپنے زمانے کی انٹلکچوئل سطح سے گذر کر خدا کو پہنچتے ہیں۔ شکوک و شبہات کے صحرا کو عبور کر کے اپنے مطالب کی فضا رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی بڑا صوفی علم سے خالی ہو۔

صدقات، اہمیت و اثرات

اگر کوئی چیز سود کو ختم کر سکتی ہے تو وہ صدقات ہیں، ویمحق الله الربوا ویربی الصدقات اس کے برعکس میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں، جو جاہلوں کی طرح کہتے ہیں، آج سود ختم

کرو، کل ختم کرو، اس طرح کبھی بھی سود ختم نہیں ہو سکتا، جب تک آپ متبادل مذہبی ادارے قائم نہیں کرتے۔ خدا نے ایک چھوٹا سا قانون بنا دیا ہے، میں حیران ہوں، اتنے سارے علمائے دانش ومذہب ہیں۔ ان کو وہ چھوٹی سی آیت یاد نہیں آتی کہ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات کہ اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ جوں جوں صدقات بڑھیں گے، سود کم ہوتا جائے گا۔ جس ملک میں صدقات کا ادارہ ہی نہیں ہے، وہاں سود کہاں سے ختم ہوگا؟ ہم قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ اللہ کا وضع کردہ قانون ہے۔

آپ اسلام کو ٹکڑوں میں نافذ کر کے اس کی توہین کرتے ہیں، رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ ایسا کبھی ہوا ہے کہ کسی سرمایہ دارانہ یا سوشلسٹ نظام میں کسی اور نظام کی مداخلت ہو؟ کمیونزم نے اپنے نظام میں کبھی خدا کا نام تک داخل نہیں ہونے دیا۔ میکسم گورکی نے ایک خط لینن کو لکھا کہ خدا نے چاہا تو ہم کریملن پہنچ جائیں گے۔ لینن نے اسے لکھا کہ تم نے کیوں خدا کا نام لیا۔ اس نے کہا، یار میں نے رسماً لکھا۔ اس نے کہا، جب تک ہم اس گھسے پٹے لفظ کو اپنی سوسائٹی سے نہیں نکالیں گے، خدا کا تصور زندہ رہے گا۔ ہر نظام اپنے لوازمات میں رائج کیا جاتا ہے۔ ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایک ایک شق اسلام کی لیتے ہیں اور اسے خوب ذلیل کرتے ہیں۔ آپ نے زکوۃ کے سسٹم کو تار رسوا اور ذلیل کیا اور اسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے کہ لوگ زکوۃ دینے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ شیعہ ہو جائیں یا مرزائی۔ قرآن حکیم میں اللہ نے صاف کہا۔ یا ایھا الذین آمنو الدخلو فی السلم کافه. کہ اگر اسلام میں داخل ہونا ہے، تو پورا پورا اسلام لاؤ۔ یہ کیا کہ دس ہزار قانون جمہوریت کے اور ایک اسلام کا۔ مگر اسلام کی جو صورت بحیثیت نظام مولوی دکھا رہا ہے، وہ اتنی ہولناک ہے کہ بڑے سے بڑے دل گردے والا شخص بھی اسلامی نظام کے تصور سے کانپ جاتا ہے۔

ادھر خدا کہتا ہے طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی، ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ ہمارے سماجی تحفظ کے نظام کو زکوۃ سہارا دے رہی ہے۔ صدقات تو پھر پیچھے بچ جاتے ہیں۔ یعنی جو یورپ کے سماجی نظام ہائے تحفظ ہیں وہ ہمارے زکوۃ کے حفاظتی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے پاس مزید بڑے بڑے اسلام کے ادارے ہیں۔ اسلام کیا کہتا ہے؟ اگر آپ کو پانچ وقت کی نماز کی پابندی دشوار لگتی ہے، تو آپ جائیں، یورپ اور امریکہ میں جا کے

دیکھیں، آپ کو ہر جگہ دشواری نظر آئے گی۔ ہر جگہ آپ کو رکاوٹ ان کے سسٹم میں ملے گی اور دنیا کا آخر کون سا ایسا سسٹم ہے، جس کے تمام باشندے اس کو چاہتے ہوں۔ میں امریکہ گیا، تو لوگوں سے پوچھا، کیا تم اپنے سسٹم کو پسند کرتے ہو؟ ان کا جواب تھا، ہم اپنے نظام سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم نے محض ٹیکسیشن کے باعث برطانیہ سے بغاوت کی تھی۔ اب ہماری حکومت ہم پر بدترین ٹیکسیشن لاگو کرتی ہے۔ سو ایسا تو کوئی نظام نہیں ہے جسے سارے اچھا کہیں۔

مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا ہے کہ نماز کیوں ضروری ہے؟ کیا اس سے بچا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نماز لازم کیوں ہے؟ اس کو میں جواب یہی دے رہا ہوں کہ ادارے اہم نہیں ہوتے۔ میرے اور آپ کے لیے اسلام ماننا ضروری نہیں ہے۔ بنیادی طور پر جب میں خدا کو مانتا ہوں، تو میں یہ سوال کیوں کرتا ہوں کہ نماز اور روزے کیوں ہیں؟ اگر میں نے خدا کو مانا ہے، تو باقی سوال غیر ضروری ہیں۔ میں خدا کو مانتا ہوں، تو کہتا ہوں کہ یہ سسٹم اللہ کا ہے، اس لیے میں اس کی پابندی کرتا ہوں۔ اگر میں خدا کو مانتا نہیں، تو میرے لیے اسلام ایک بے کار سسٹم ہے۔ بنیادی سوال کبھی بھی ادارہ نہیں رہا۔ بنیادی سوال پھر واپس جائے گا اور اللہ کی ذات پر جا کر رکے گا۔

امریکہ میں خواتین پوچھتی تھیں کہ کتنا پردہ جائز اور کتنا ناجائز ہے؟ میں نے کہا، آپ نہ کرو پردہ۔ آپ کو کیا اتنی مصیبت پڑ گئی ہے؟ کیا واسطہ ہے آپ کا اللہ سے؟ کتنا مانتی ہو اللہ کو؟ ساری قوم اور امریکہ میں ایک شغل رائج ہے کہ جو چیز پسند آ گئی، وہ اسلام ہے اور جو چیز میری مرضی کے مطابق نہیں، وہ اسلام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بہت خطرناک سیکولر رجحان ہے، جو پوری تعلیم یافتہ مسلم سوسائٹی میں در آیا ہے۔ ایک مسلم عورت سوال کرتی ہے مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے مجھے کیوں نہیں ہے؟ امریکہ میں ہر مسلمان عورت آپ کو یہ سوال کرتی ملے گی۔ کیا تم مجھے، نظام کو یا اللہ کو مان رہی ہو؟ پھر میں نے اس کے ان کے بڑے کھلے اور تلخ جواب دیے۔ جب میں نے ان کو واضح طور پر جواب دیے، تو کہنے لگیں، تم بڑے سنگدل ہو۔ میں نے کہا، حقیقت تلخ ہے تو مجھے سنگدل ہونا پڑے گا۔ آپ لوگ بھی تو بڑے معروضی ہیں۔ حقیقت تلخ ہے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت مرد کو تین ماہ سے زیادہ دستیاب نہیں ہے۔ جو مرضی ہے حساب لگا لو۔ تمام وقت مرد بار آور ہے، عورت نہیں ہے۔

پھر معاشرے میں ہمیشہ جنگ وجدل اور قتل وغارت کا رواج رہا ہے۔ عورتیں ہمیشہ گھروں میں رہنے کے باعث محفوظ رہ گئیں۔ ہم مرد میدانوں میں ہونے کی وجہ سے مقتول ہوتے رہے۔ پھر کیا عورتوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے؟ اس کا نتیجہ؟ یورپ کا ہر گھر فحاشی کا اڈا بن گیا۔ ایک جرمن عورت نے مجھے کہا۔ تمہارے پیغمبر بڑی ہوشیار شخصیت تھے۔ کاش ہمیں دوسرے لوگوں سے شادی کی اجازت ہوتی۔ ہمیں اجازت ہوتی، تو ہمارے خاندان ٹوٹنے سے بچ جاتے۔ ہمارا معاشرہ ٹوٹنے سے بچ جاتا۔ اب تو ہم بکھر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم ایک احمقانہ سوچ رکھتے ہیں کہ وہ ایک دس سال کے لیے قانون بناتا ہے۔ اللہ دس سال کے لیے قانون نہیں بناتا۔ اللہ اولین دنیا سے لے کر آخرین دنیا تک قانون بناتا ہے۔ ایک صدی میں آپ کی آگہی آپ کو قائل کرتی ہے کہ غلاموں کو آزادی ملنی چاہیے۔ او کے! اگر ابراہام لنکن ایک اچھا انسان تھا اور اس نے غلامی بند کر دی تھی، تو اللہ آپ کو منع تو نہیں کرتا کہ غلامی بند نہ کرو۔ لیکن آپ کو کیا پتہ کہ پندرہ بیس سال کی جنگ عظیم کے بعد پھر لوگ اس انداز زندگی کو پلٹ جائیں، جہاں پھر غلام اور آقا ہوں۔ سو خدا اپنے قانون ایک صدی کے لیے نہیں بناتا۔ انسانوں کی ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک وقتی خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی حیثیت کا تعین نہیں کیا جاتا۔ اسے ایک بین الکائناتی رب نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اسے ایک لوکل اور وقتی خدا سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہے کہ قوانین خداوند پر غور کرتے ہوئے ہم اپنی محدود فکر کے ساتھ اللہ کو مقامی بنا دیتے ہیں۔ پھر ہم اسے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس صدی کے لیے علیحدہ قانون کیوں نہ دیا؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا ایک صدی کا خدا نہیں ہے۔

وہ اول و آخر کا خدا ہے اور اس کے اچھی طرح علم میں ہے کہ آج سے دس سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ ایک ایٹمی جھٹکا، لوگوں کو اپنے ہوش وحواس کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ وہ سوتے لوگوں کی طرح زمین پر چلیں گے اور جس کی سماعت نظر اور حواس بچ جائیں گے، وہ سینکڑوں انسانوں کو گدھوں کی طرح ہانکتا پھرے گا۔ یہ ایٹمی جنگ کے مابعد اثرات میں سے ہیں۔ تب آپ کس کو کہیں گے کہ غلام کون ہے اور آقا کون؟

آج کا دانشور صرف تالیاں بجانے والا دانشور ہے۔ اسے ایک چیز بھا جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے، اللہ اتنا غیر جمالیاتی نہیں ہوسکتا۔ اللہ میں جمالیات سب سے زیادہ ہے۔ وہ ایک مدت

اور ایک بنیادی انسان کے لیے ایک قانون بناتا ہے۔ ایک Minimum most advantage پر اس نے آپ کو دنیا میں قائم رکھا ہوا ہے۔ جنت میں جانا کتنا آسان ہے کہ جس نے دل سے ایک دفعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیا، اس پر نارِ دوزخ حرام ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ چیز تبھی ہوگی، جب خلوصِ قلب سے آپ خدا کو اپنی ترجیح اول قرار دیتے ہیں ورنہ ساری عمر ایک منافقانہ طرزِ عمل سے اقرارِ کلمہ جاری رہےگا، جواب بھی جاری ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی عالمِ اسلام پر آفت آئی، کوئی عبدالقادرؒ، کوئی علی بن عثمانؒ پیدا ہو گیا۔ کوئی جنیدؒ آ گیا۔ کوئی نہ کوئی فرد پیدا ہوتا رہا۔ آج انسانوں کو کیا ہوا؟ اب کیا قیامت آ گئی ہے کہ پچھلے سو برس سے امتِ مسلمہ گردشِ افلاس میں اور تباہی و ہلاکت و بربادی کی نذر ہو گئی ہے۔ نیل کے ساحل سے تا بحد کاشغر، آج کوئی عبدالقادرؒ پیدا نہیں ہو رہا نہ کوئی علی بن عثمانؒ اٹھ رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ اس عرصے میں مسلمانوں سے ان کی حقیقی ترجیح گم ہو گئی ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کی بغیر اس کے سربراہ کے پوجا کر رہے ہیں۔ ہم دو نقائص کا شکار ہیں۔ ایک تو ہمیں دانشورانہ احساسِ کمتری ہے کہ مغرب سے آئے ہر حرف کو قرآن سمجھتے ہیں۔ ہمارا سیکولر سٹاف اتنا جاہلِ مطلق ہے کہ چند انگریزی کے لفظوں کو معراجِ انسانیت سمجھتا ہے اور مانگے تانگے کے خیالات سے ننگے بدن کو اس نے ڈھانکا ہوا ہے۔ ورنہ وہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا۔ قرآن کا سمجھنے اور سوچنے کا ایک معیار ہے۔ ہمارا مولوی اس معیار کی نسبت تک نہیں آ رہا۔ وہ ان آیات کی فہم و فراست تک نہیں پہنچتا، جو خدا نے عام دانشور کے لیے رکھی ہے۔

ایک پی ایچ ڈی امریکہ میرے پاس آئے۔ وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے تھے، کہا میں مشکل سوال لایا ہوں۔ جامع ازہر انڈیا اور لاہور سے ہو کر آ رہا ہوں۔ مجھے جواب نہیں ملا۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے، میں بھی نہ دے سکوں، لیکن میں کوشش کروں گا۔ اس نے کہا میرا سوال یہ ہے کہ عیسائیت میں کائنات کی عمر چھ ہزار سال ہے۔ انڈیا کی میتھ لوجی کے مطابق یہ عمر 12 سے 18 ہزار سال ہے۔ اسلام آغازِ کائنات کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا، میں تمہیں ایک آیت سادہ ترجمے کے ساتھ سناتا ہوں۔ اگر سمجھ میں آئے تو سمجھ لینا کہ یہی آغازِ کائنات ہے۔ میں نے اسے ایک آیت سنائی، اولم یر الذین کفرو ...... تم میرا انکار کیسے کر سکتے ہو۔ تمہیں

معلوم نہیں، یہ تمام زمین و آسمان پہلے اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں جبراً پھاڑ کر جدا کیا۔ میں نے اسے انگریزی میں ٹرانسلیٹ کیا۔

How dare you defy, in the beginning the heavens and earth were all one mass then I forcibly tore them apart تو وہ خوشی سے اچھل پڑا By God this is big bang (بخدا یہی بگ بینگ ہے) میں نے کہا Yes, You got it; This is big bang مگر میں سارے علماء کے سامنے یہ آیت پڑھ دوں، تو کوئی بگ بینگ تک نہ پہنچ سکے گا۔ کوئی ایک بھی مولوی اسے بگ بینگ نہیں سمجھے گا۔ یہ علم سے تہی دامنی کی باتیں ہیں۔ وجعلنا من الماء کل شی حی. ہم نے تمام حیات کو پانی سے تخلیق کیا۔ قیامت تبھی ہے، جب قرآن ثابت ہوتا ہے۔ قیامت تک انسان کی ایک جد وجہد ہے کہ قرآن کی کوئی آیت تشنۂ تفسیر نہ رہے۔ یہ ساری آیات متشابہ آیات ہیں۔ جو کل متشابہ تھیں، وہ آج محکم ہیں۔ کل کسی کو کیا پتہ تھا، جب خدا کہتا ہے کہ میں نے یہ آسمان اپنے دست و بازو سے بنائے ہیں۔ میں نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ وانا لموسعون اور ہم انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔

اس کا کسی کو کیا پتہ تھا کہ خدا نے کیا کہا۔ مگر جب آئن سٹائن آیا۔ اس نے نظریہ اضافیت دریافت کیا۔ پھر اس کے اوپر کوآنٹم کی تھیوری آئی۔ ان دونوں تھیوریوں نے ایک ہی بات کی تصدیق کی کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ تب قرآن سمجھ میں آیا کہ دیکھو انا لموسعون ہم کائنات کو وسیع کر رہے ہیں مگر یہ وضاحت ہمیں کسی مولوی نے نہیں دی۔ یہ علم کا بحران ہے کہ کسی مسلمان نے قرآن کی یہ وضاحت نہیں دی۔ بلکہ ان لوگوں نے دی ہے، جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کر رہے ہیں۔

اب ذرا اللہ کو دیکھیں کہ یہ لوگ یا کہ ہم لوگ اسے پسند ہیں؟ خداوند کریم بالکل صاف لہجے میں بغیر کسی پیچ پیچ کے کہتا ہے کہ میرے پسندیدہ لوگ وہ ہیں الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم، جو کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ و یتفکرون فی خلق السموات و الارض اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔ غور تو ہاکنز اور واٹسن کر رہا ہے۔ ہمارا کون سا بندہ غور و فکر کر رہا ہے؟ کیا یہ بدقسمتی نہیں ہے کہ وہ کائنات میں غور و فکر کر رہے ہیں اور پہلے حصے سے خالی ہیں۔ ہم پہلے حصے میں ہیں اور آخری حصے سے خالی ہیں۔

میری تمام جدو جہدان دو باتوں کے درمیان ربط باہم اور تحقیق کی ہے، تاکہ ہر فرد مسئلے کی نوعیت سے آگاہ ہو۔ جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ ترجیحات کو گڈمڈ کرنا ہے۔ ہمیں اللہ کو ترجیح اول قرار دینا چاہیے۔ تبھی ہم مذہب کے رستے پر صحیح طرح چل سکیں گے۔ اسی لیے ہمارا عصر حاضر میں کوئی کردار نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ خدا کہتا ہے **ولا تھنو ولا تحزنوا،** سستی اور غم نہ کرنا **وانتم الاعلون ان کنتم مومنین** مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ہے، تمہیں غالب ہو۔ اگر ہم میں کوئی غالب نہیں ہے، تو اس کا مطلب ہے اس آیت کا آخری حصہ درست ہے۔ اگر ہم غالب نہیں ہیں، تو گویا ہم مومن نہیں ہیں۔ جب ہم مومن ہوں گے، تو ہم ضرور غالب ہوں گے۔ دعوئ مومنیت سے کام نہیں چل سکتا نہ ظاہر وباطن کے فضول دعووں سے کام چلتا ہے۔ غلبہ اس کو ضرور نصیب ہوتا ہے، جو اللہ کا احساس ترجیح اپنے دل میں باندھ لے۔ یہ وہ بات ہے، جو ہمیں اپنی قوم کو سکھانی ہے۔ اپنے لوگوں کو ذہن نشین کرنے اور اپنے علماء کرام کو سمجھانے کی ہے۔

اسلام یا مقصد اسلام

لندن سے مجھے ایک نوجوان نے پوچھا، مجبوری ہے۔ مجھے بتائیں کہ میں سور کا گوشت کھالوں؟ میں نے کہا، کھالو۔ کہنے لگا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے کہا، کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ اللہ نے منع نہیں کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ اللہ سے محبت ہے، تو نہ کھاؤ۔ ہم لوگ اداروں کی قید میں پڑ گئے ہیں۔ جائز اور ناجائز کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن پہلا قدم یہ ہے کہ آپ اللہ کو کتنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں ایک خصوصی سبق، جو آپ کسی چھوٹے یا بڑے کو دے سکتے ہیں، یہ ہے کہ اللہ اور صرف اللہ میری زندگی کی ترجیح اول ہے۔

ایک عیسائی سوال کرتا ہے کہ ہم بھی خدائی مذہب پر ہیں۔ ہم بھی عبادات کرتے ہیں۔ آپ کیوں اتنے اسلام کے بارے میں حساس ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم تم سچ کہتے ہو۔ تم بھی اللہ کے مذہب ہو، ہم بھی اللہ کا مذہب ہیں اور مذہب میں صبح وشام صرف تمہاری نمازیں ہی تو ہوتی ہیں۔ اگر مجھے تمہارے مذہب میں ایک چیز مل جاتی اور بغیر میرے مذہب کے مل جاتی، تو عیسائیت مجھ پر آسان ہو جاتی۔ میں ضرور اس کو اختیار کرتا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ **ومن یبتغی غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه** اگر تم اسلام کے سوا کسی اور رستے پر چلو گے، تو وہ قبول نہیں ہو

گا۔ اللہ مقصود جب کسی ذات کا ہوتا ہے، تو اسلام اس کی مجبوری اور مقصد زندگی بن جاتا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد راستہ ہے، جو آپ کو خدا تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ اولین طلب، جس کے تحت جستجوئے حق اور اللہ کی تلاش میں جو شخص نکلے گا، جب اردگرد دیکھے گا، تو اسلام کے سوا کوئی راستہ نظر نہ پائے گا۔ ان الدین الاسلام اسلام اس کے چاہنے والوں کی مجبوری ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

مگر غلط بات یہ ہوگی کہ آپ اسلام کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور مقصد اسلام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں۔ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔ آدمؑ کی کوئی اور شریعت تھی۔ نوحؑ اور شیثؑ کی کوئی اور تھی۔ اسی طرح ادریسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کوئی اور تھی۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ Ten Commandments اور شریعت محمدیؐ میں بہت فرق ہے۔ جو چیزیں ان کے ہاں حرام تھیں، وہ ہمارے ہاں حلال ہیں۔ جو رشتے ان پر حرام تھے، وہ ہم پر حلال ہیں۔ شریعتوں میں بڑا فرق ہے مگر اس پورے عرصے میں آدم سے لے کر محمدؐ تک دین کا ایک مقصد جو کبھی نہیں بدلا، وہ خدا کی محبت، خدا کی تلاش، اس کا قرب اور قرب ہمسائیگی کی آرزو اور جستجوئے حق کا وہ مقصد اکیلا ہے جو تنہا چلا آتا ہے۔

اطمینان بخش آئیڈیا

Schizophrenic Idealism کو ہم مذہب تو نہیں کہہ سکتے، جس میں ضد اور پاگل پن ہے۔ میں ایک مسلمان ہوں۔ سادہ مسلم۔ میں آپ کو بے تکلفی سے بتاتا ہوں کہ اسلام میرا انتخاب ہے۔ میں کوئی آباؤاجداد کا پیدا کردہ مسلمان نہیں ہوں۔ دنیا کے بہترین نظریات کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے خدا کے بارے میں سب سے زیادہ آرام دہ اور سب سے زیادہ اطمینان بخش نظریہ جو میں نے پایا اور اسے اختیار کیا، وہ اسلام ہے۔ اس کے بعد اگر میں اسلام کو لے کر بیمار ہو جاؤں، جیسے کہ بہت سارے لوگ دیکھے ہیں۔ ان کی صورتوں پر ہر وقت کرختگی نمایاں ہوتی ہے، تو اسلام انسان کے ساتھ اس قسم کی بات نہیں کرتا۔ اسلام کہتا ہے ما انزلنا القرآن لتشقی کہ اس سسٹم میں کوئی مشقت اور کرختگی نہیں۔ یہ آپ کے لیے سکون و عافیت کا دائرہ ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے باوجود کرخت اور بیمار ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ عام آدمی جو اتنا خدا کی طرف نہیں ہے، وہ تو ٹھیک ہے مگر جو مذہبی بنتا ہے، پہلی چیز جو ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہے، وہ اس کا اوکھا پن (Odd) ہے۔ وہ ایک مختلف انسان ہے۔ اس کا طور طریقہ مختلف ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم مذہب اختیار کر کے نفسیاتی طور پر کچھ مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کا انتخاب نہیں کرتے۔ ہم اپنے احساس خطا اور عذر غیر معقول کے تحت اسلام کی طرف رخ موڑتے ہیں۔ میں اسے بھی ایک خوبی شمار کرتا ہوں۔ یہ برصغیر کے انسانوں

میں واحد خوبی ہے کہ باقی دنیا کے لوگ تو گناہ کی اذیت کے باعث کسی اور طرف چلے جاتے ہیں، مگر ہمارے لوگ اتنے اچھے ہیں کہ وہ کوئی خطا کر کے پلٹنے کے لیے اللہ کے راستے ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔

مگر مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ واپسی کا رستہ تلاش کرتے ہیں، تو انہیں راہ میں اس قدر غلط فہمیاں پیدا کرنے والے لوگ ملتے ہیں کہ وہ خدا تک نہیں پہنچ پاتے۔ کیونکہ عقل تو انہوں نے استعمال ہی نہیں کرنا۔ وہ پیروں، فقیروں اور جہلا کے پیچھے بھاگتے ہیں، جو انہیں ترغیب و تحریص کے ذریعے ایک اور ہی قسم کی نااہل مشین کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ ساری بیماری۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم سب حرف سے عمل کو جاتے ہیں۔ ہم سب کا الفاظ کی حد تک بہت اچھا عقیدہ ہے۔ آپ سارے معاشرے سے جا کر پوچھ لیں، خدا کتنے ہیں؟ کہیں گے ایک۔ اس کی تعریف پوچھ لیں، کہیں گے، وہی مارتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی رزق اور بیوی بچے دیتا ہے۔ ہر چیز پر اسی کی قدرت اور اسی کا اختیار ہے مگر جب عملی طور پر نکلیں، تو خیال کریں گے کہ کسی نے کچھ کیا تو نہیں؟ کسی نے کاروبار تو بند نہیں کیا ہوا؟ کہیں گے، کسی نے میرے اوپر جادو تو نہیں کیا ہوا؟ ہم خدا کی موجودگی میں سینکڑوں ہزاروں خدا تخلیق کر لیتے ہیں۔

اب بت تو واپس نہیں آئیں گے۔ حجتہ الوداع والے دن رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ شیطان اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ اب مسلمان کسی بت کی پرستش نہیں کرے گا۔ مگر یہی تمام کے تمام بت اب تجریدی ہو گئے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے خدا کے اختیارات کو ہزاروں خداؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پورا معاشرہ جادو اور سحر کی زد میں آیا ہوا ہے۔ جس عورت سے پوچھیں، وہی کہے گی، کسی نے کچھ کیا ہوا تو نہیں؟ جس پڑھے لکھے سے پوچھیں، کہے گا، کچھ ہوا ہوا تو نہیں؟ یہ کس قسم کا بیہودہ پن ہے، جو ہر جگہ اور ہر شخص میں پایا جاتا ہے؟ جبکہ اللہ میاں نے کسی بیچ بچ کے بغیر کہا ہوا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا۔ خالق اپنی کسی مخلوق کے ساتھ اختیارات شیئر نہیں کرتا۔ ہاں البتہ جب وہ ادارے بنا لیتا ہے، تو اس کے اختیارات کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ جیسے اس نے رحمت کا ایک ادارہ بنایا اور کہا **وما ارسلنک الا رحمتہ للعالمین** رسول اللہؐ سے کہا، جاؤ جا کر میری رحمت کو تقسیم کرو اور اسی حوالے سے حدیث ہے کہ

اللہ معطی و انا قاسم کہ خزانے سب اللہ کے ہیں، میں تقسیم کرنے والا ہوں۔ میرے پاس شفاعت، رحمت اور آپ لوگوں کے لیے کرم ہے۔ مجھے امت کی فلاح و بہبود کی حرص ہے۔ میں تقسیم کرنے والا ہوں۔

اب تھوڑا سا فرق ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خدائی کو آپ الگ کر دیں۔ باقی جتنا بھی احترام، شوق اور جتنی بھی محبت ہے، وہ رسول اللہؐ کے حوالے کر دیں۔ یہ ہے عقیدہ۔ اس اعتبار سے تمام مسلمان بنیاد پرست ہیں۔ یعنی ایک خدا میں ایمان اور رسولؐ کی محبت سے سرشار ہم تمام بنیاد پرست ہیں۔ میں جتنا بھی پڑھ لکھ جاؤں اگر کبھی رسول اکرمؐ کے لبادہ مقدس پر خراش آئے گی، تو میں طیش میں آ جاؤں گا اور اس لیے کہ ان کے ساتھ میری محبت ہے وہ میرے باپ بھی ہیں، ان کی بیویاں اگر میری مائیں ہیں، تو وہ میرے باپ ہیں۔

اور کیا اللہ کا کرم ہے کہ ہزاروں کے ماں باپ ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتے۔ میرے اور کئی دوسروں کے ماں باپ کا یہی حال ہے۔ اگر کوئی ایسے والدین کی پیروی کرے گا، تو اسے مایوسی ہوگی، وہ اپنی روایات اور خاندان سے مایوس ہوگا، لیکن اللہ کی مہربانی سے ہمارا ایک باپ ایسا ہے، جس نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ خود پیغمبر کی ذات ہے۔ پیغمبر ہونا تو بہت بڑی بات ہے ذاتی احساس جو اپنے باپ سے کسی بچے کو ہوتا ہے اس کی نوعیت ہی کچھ اور ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کو آواز نہ دو۔ کیا وہ میرے باپ نہیں ہیں؟ ان کو میں کیوں آواز نہیں دے سکتا؟ اگر مجھے اپنے باپ کی ضرورت ہے، تو میں تو انہیں پکاروں گا۔

یہ حدیث رسولؐ بخاری اور مسلم دونوں میں نقل ہوئی ہے کہ اگر رستہ کھو جاؤ، گم ہو جاؤ، تو آپ اس طرح آواز دے سکتے ہیں اعیوننی یا عبادل الله اے اللہ کے بندو میری مدد کو پہنچو۔ کیا کوئی بندہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے بھی بڑا ہو سکتا ہے؟ اور رسولؐ تو تمام امت کے زندہ باپ ہیں۔ ہم بھی تو آواز دیتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ آپ کا بیٹا بڑے برے حال میں ہے، نکما، نالائق ہو چکا ہے کچھ کرم فرمائیں۔ دعا کریں۔ قرآن کی کیا خوبصورت آیت ہے۔ ''اے پیغمبرؐ! لوگ جب تیرے پاس آئیں اور مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں'' ذرا انداز دیکھیں۔ انداز کیا ظاہر کر رہا ہے۔ خدا کہتا ہے ''اے پیغمبر! لوگ جب تیرے پاس آئیں اور مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور تو بھی ان کے لیے دعائے شفاعت کرے، تو میں انہیں بخش دوں گا۔''

فرض کریں کہ میں پیغمبرؐ کے پاس جاتا ہوں اور کہتا ہوں یا رسول اللہؐ دعا فرمائیں، میری استعانت فرمائیں۔ میں خدا سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ آپ بھی میرے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔ یہ ہے دعا، نہ صرف رسول اللہؐ کے ساتھ، بلکہ ہر اس بزرگ کے ساتھ، جن کے بارے میں آپ کا اچھا گمان ہے۔

نجات کے لیے کلمہ

کلمہ خدا کی وحدانیت اور نبوت رسول اللہ کا اقرار ہے۔ آپ اپنے آپ کو دانشورانہ معیار سے دیکھتے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ جس نے اللہ کو مانا اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا کہ اللہ تو ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کام پورا ہو گیا؟ مگر ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ مذہب کیا ہے؟ میرا انداز فکر اور میری مذہب کی تعبیر کیا ہے؟ جس نے کائنات بنائی ہے، کیوں بنائی ہے؟ مذہب کیوں بنایا ہے؟ اس کے مقاصد تخلیق اور مقاصد نبوت کیا تھے؟ مقاصد کتاب اور مقاصد معاشرہ کیا تھے؟ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اللہ کی تخلیق کا ایک سادہ سا مقصد تھا کہ انا ھدینہ السبیل و اما شاکراً و اما کفورا چاہو تو مجھے مانو اور چاہو تو میرا انکار کر دو، یہی انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد ہے۔

لیکن اللہ کہتا ہے کہ میرا ماننا کافی نہیں ہے۔ میرے ماننے کا طریقہ ایک ہے۔ تم ہو سکتا ہے ہزاروں طریقوں سے آؤ، لیکن وہ میرے طریقے نہیں ہیں۔ میرا طریقہ وہ ہے، جس کا آدم سے لے کر محمدؐ تک میں نے تعین کر دیا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے۔ اس میں میرے احکامات پابند ہیں۔ تمھیں ایک معاشرہ تخلیق کرنے کے لیے اصول دے دیے ہیں۔ اگر تم اصولوں کو نہیں مانو گے یا معاشرے کے تخلیق کردہ وہ پیٹرن تسلیم نہیں کرو گے، تو تم کبھی بھی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام

اب سوال یہ ہے کہ اسلام ہی کیوں؟ قرآن اسلام کے بارے میں کہتا ہے کہ اب یہی خالص مذہب ہے جو آپ کو لے کے آگے جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جزوی خدا کو تسلیم کرنے کا مرحلہ تھا۔ جزوی معاشرہ تھا۔ اس میں کلیتاً ایک بڑی تخلیق کاری نہیں ہو سکتی تھی۔ آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ بھی اللہ کو لے جاتے تھے۔ مگر یہ سارے پیغمبر یہ کہہ چکے تھے کہ ہم جزوی پیغام دے رہے ہیں۔ ہم اس معاشرے کی مکمل تخلیق نہیں کر رہے۔ ایک ایسا معاشرہ، جو سارے کا

سارا مل کر ایک خدائی صورتحال پیدا کرے اور اس میں سے کچھ لوگ خدا رسیدہ ہوں۔ جب اسلام آیا، تو اس نے کھلے بندوں اعلان کیا کہ میں نہ کوئی نیا دین ہوں نہ کوئی نیا مذہب ہوں۔ بلکہ وہی کھلا پیغام خدا مجھ سے مکمل ہو گیا ہے۔ اب پانچویں جماعت پی ایچ ڈی ہو گئی ہے۔ اب کون ایسا شخص ہے جو پی ایچ ڈی کے بعد پھر تختی پر پانچویں لکھے گا؟

اللہ نے واضح کر دیا کہ **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی** کہ آج میں نے دین تمام کیا، ادھر نعمت تمام کر دی۔ ادھر دین مکمل کیا۔ ادھر پیغمبر پورے کر دیئے۔ اس کے بعد کوئی شخص مجاز نہیں ہے کہ تمہیں میرے راستے کی طرف گائیڈ کرے۔ پیغمبر مکمل ہو گئے، پیغام مکمل ہو گیا۔ پیغام ناقابل تبدیل ہے اور پیغمبر ناقابل تبدیل ہے۔ حضور عالی مرتبت آخری پیغمبر ہیں۔ اس کے بعد کہا، **ان الدین عند الله الاسلام** سن لو کہ اب جو بقیہ ماندہ طریقے میرے طرف آنے کے ہوں گے، وہ سب ناقص ہیں، کم ہیں۔ وہ کلی طور پر میرے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکیں گے۔ اب واحد دین جس پر چل کر تم مجھ تک پہنچ سکتے ہو وہ اسلام ہے۔ پھر مزید آگے جا کر کہا **و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه** میرے پاس تم اسلام کے سوا کسی اور رستے پر چل کے آئے، تو میں قبول نہیں کروں گا اور حتمی طور پر کہہ دیا کہ میں ہی مقصود ہوں۔ رستہ اسلام ہے اور واسطہ محمدؐ ہے۔ ان تینوں کے بغیر تم میرے تک نہیں آ سکتے۔

یہ میری عائد کردہ پابندی نہیں ہے۔ میں چاہتا تو کہتا کہ اگر مجھے عیسائیت سے خدا ملتا ہے تو مجھے اسلام میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگر مجھے بدھ ازم میں خدا مل جائے، تو مجھے تو بڑی آسانی ہے۔ اگر ہندو ازم میں خدا مل جائے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ہندو ہو جاؤں۔ مگر جس کو خدا چاہیے، اس کو کسی اور مذہب میں خدا نہیں ملے گا۔ تبدیلی مذہب کا آپ تناسب دیکھیں، تو آپ کو پتہ لگے گا کہ ہر فرد واحد، جو خدا کی تلاش میں تھا، اسے بالآخر اسلام سے رجوع کرنا پڑا۔ تبت کا عظیم لاما مسلمان ہوا، تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو ڈر کے مارے مسلمان ہوا؟ کیوں مسلمان ہوا؟ کیا تو مشقیں نہیں کر سکا؟ اس نے کہا، نہیں! میرے پاس ویسی ہی طاقتیں ہیں، جیسے کہ کسی اور لاما کے پاس ہو سکتی ہیں، لیکن میں خدا چاہتا تھا اور امن چاہتا تھا، جو مجھے اسلام میں آ کے ملا۔

کے۔ ایل۔ گابا جیسے لوگ مسلمان اس لیے ہوئے کہ وہ خدا کی تلاش میں تھے۔ جس کو خدا کی تلاش ہے، اس کو اسلام کی تلاش ہے۔ جس کو اسلام کی تلاش ہے وہ اللہ کے رستے پر محمد

رسول اللہؐ کے بغیر کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ باقیوں کو دعوے کرنے دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ پوری امت میں سے ایک خدا رسیدہ بندہ ڈھونڈ کے دکھائیں، جو خدا، اسلام اور محمدؐ کے بغیر ہو۔ اگر آپ کو مل جاتا ہے، تو ضرور بتائیے۔ ایسا دعویٰ کرنے والا سب سے بڑا ڈھونگ اور ناٹک ہے۔ اس میں اتنی بھی فراست نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھ کر کچھ بتا سکے۔ چہ جائیکہ خدا اس کو علم دے کہ وہ لوگوں کے سینوں میں جھانک کر دیکھ سکے۔ ان کے پس منظر پر نگاہ دوڑا سکے یا ان کی پیشانیوں میں جھانک کر کچھ بتا سکے۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

بازیافتِ خدا بغیر علم

انسان کی اپنی ذات سے جدائی سب سے مشکل کام ہے۔ جب انسان اپنے آپ سے جدا ہونے لگتا ہے تو اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ساتھ رضامند رفیق رکھتے ہیں، جسے نفس کہتے ہیں۔ جب ہم نا رضامند ہوں، تو پھر خدا کے ساتھ ہماری رفاقت میں زیادہ آمادگی ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ خدا کی طرف جاتے وقت قدم قدم پر نفس انسانی ہمیں زنجیر ڈالتا ہے۔ اسی لیے خدا نے کہا ہے کہ اما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس نے اپنے سیلف اور فیشن ایبل تصورات کی مخالفت کی۔

مگر کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی نامعقول چیز کو پسند کرے گا، جبکہ وہ اپنے آپ کو عقلِ کل کہتا ہے؟ ھو الاول ولآخر و الظاھر و الباطن و ھو بکل شی علیم وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن ہے اور سب کو اس نے اپنے علم سے گھیر رکھا ہے۔ آیت الکرسی میں اس کا یہی ادعا ہے کہ میرا اختیار بہت ہے۔ میں جابر و قاہر ہوں ولا یحیطون بشی من علمہ الا بماشا مگر میں نے اپنے علم سے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔ اتنا بڑا عالم کیا مجھ سے یہ توقع رکھے گا کہ میں اس کی جاہلوں کی طرح پیروی کروں؟ یہاں ہمیشہ خدا کے حق میں دلیل موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس نے اس کو پایا؟ وہ جسے ہم استاد کہتے ہیں؟ وہ خوش قسمت روح ہے جس نے تجسسات کی انتہا تک پہنچ کر ہر سطح کی دلیل دریافت کر لی۔ یہی دلیل حضرت ابراہیمؑ نے پائی۔ یہی دلائل آقا و رسولؐ نے دیئے۔

نام نہاد جدید دنیا کی ساری فلاسفی میں نقص یہ ہے کہ انہیں آج تک اپنے فلسفے میں اس نقص کا پتہ نہیں چلا۔ دیکھیں کتنی عجیب سی بات ہے۔ مجھے کوئی ایک فلاسفر بتائیں، جس نے خدا کی تلاش کی ہو اور آخر بیس سال کی تلاش کے بعد کہا ہو کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی خدا کو تلاش ہی نہیں کیا۔ آج تک کسی فلاسفر نے اللہ کو تلاش کیا ہی نہیں۔ وہ تو استدلال کے ایک پیٹرن میں سماجی ڈھانچے کے مسائل کے حل کی کھوج میں ہیں یا وہ ایک ذہنی انتشار کو درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ رسل خدا کی تلاش میں نکلے اور واپس آ کر کہے کہ میں نے اسے بہت ڈھونڈا، مگر اسے نہیں پایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ رسل یہ کام نہیں کرتا، بایزید بسطامیؒ کرتا ہے۔ اس نے کہا، میں نے چالیس برس اللہ کو تلاش کیا۔ جب میں نے اسے پایا، تو معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ہی وہ میری تلاش میں ہے۔ یہ ہے بڑا فرق۔

کسی انتھراپالوجسٹ نے کہا کہ اگر خدا نہ بھی ہوتا، تو انسان نے تخلیق کر لینا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی ضرورت ہے۔ شروع کے انسانی معاشرے میں مذہب کا وجود کیوں پایا جاتا ہے؟ انسان خدا کی تلاش نہیں کر رہا، بلکہ اسے تو پتھر کے دور میں عجیب و غریب منظر نظر آتا ہے کہ پہلا انسان ہی خدا پرست اور پریسٹ ہے۔ پہلا انسان قبریں بنا رہا ہے۔ ان پر پھول نچھاور کر رہا ہے اور دعائیہ کلمات پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ کیا چکر ہے؟ یہ کیسے ہوا کہ پتھر کے دور کا Homosapian پہلا کام مذہب لانے کا کرتا ہے۔ کیا یہ بڑی عجیب و غریب بات نہیں ہے؟

یہ واقعی بہت عجیب و غریب بات ہے۔ اسے یہ لازماً سمجھنا چاہیے کہ کیا مذہب ان کا اپنا تھا؟ میں اس سے انکار کرتا ہوں۔ یہ ان کا نہیں ہو سکتا کیونکہ میری اپنی زندگی کی شہادت یہ کہتی ہے کہ مذہب perception کی آخری ڈگری ہے۔ خدا کو تلاش کرنا اور ڈھونڈنا، جب تک علوم ظاہرہ کی تکمیل نہیں ہوتی، ان میں جب تک تجسس شروع نہیں ہوتا اور آپ اپنے کشف حقائق میں نہیں جاتے، خدا کا ملنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ میں خدا کی تلاش میں اس کو انسانی انکوائری کی فائنل سٹیج سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ کوئی احمق ان پڑھ، خدا شناس بن جائے۔ ایک دنیا کی کامن سول سروس اپنے چھوٹے افسر منتخب کرنے کے لیے ممکنہ حد تک بہترین امتحان لیتی ہے جبکہ رب کائنات کو یہ لولے لنگڑے چننے کے لیے ملے ہیں۔ سب سے نکمے اور جاہل لوگ خدا کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی Dichotomy ہے۔

ہم تو اتنا سا وقت بھی اللہ کو نہیں دیتے، جتنا ہم میٹرک پاس کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ یہ ناانصافی ہے عقل و تجسس میں، میں نے دیکھا کہ ایم اے کرتے کرتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ایک غیر ملکی زبان کی چھوٹی سی ڈگری، جسے میں اب ایک بہت سٹوپڈ زبان قرار دیتا ہوں، اس کی تھوڑی سی مہارت حاصل کرنے کے لیے میرے پچیس برس لگ گئے۔ اگر میں اور مہارت حاصل کرتا، تو میرے مزید پانچ برس خرچ ہو جاتے۔ تیس برس میں میں ایک زبان باضابطہ طور پر نہیں سیکھ سکا۔ ڈاکٹری کے لیے بیس بائیس سال صرف ہو جاتے ہیں۔ اتنے عرصے میں صرف بیچلر آف سرجری، آلات سے آگہی اور موٹی موٹی میڈیسن سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بیس سال مزید لگاتے ہیں تاکہ آپ سپیشلسٹ بن جائیں۔ اس کے برعکس خدا کے سپیشلسٹ ہونے کا ایک تصور بھی نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کہ پوری دنیا میں نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ ہم میں نہیں ہے۔ آج دنیا میں قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ مشرق و مغرب میں خدا کی آگہی کو مطمع نظر بنا کر چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ کوئی وزیرِ اعظم، چپڑاسی کی کرسی پر بیٹھنا پسند نہیں کر سکتا۔ خدا جب تک آپ میں موزوں جگہ نہیں پائے گا، آپ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے تو بڑا آسان طریقہ تلاش کیا ہوا ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں، جو ایک انسان کے چھوٹے شکوک کو دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ انسان میں آگے جا کر بڑے بڑے شکوک پیدا ہوتے ہیں، جو انسان کے اندر سے اٹھتے ہیں۔

مثال کے طور پر مجھے اس کا کیسے علم ہوا کہ آپ کا ذہن کن باتوں میں الجھا ہوا ہے؟ مشرق و مغرب میں کوئی استاد اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے اتنی آگہی دوسری ذات کی حاصل ہے کہ وہ بغیر جانے کسی قسم کی حتمی رائے دے سکے۔ جب آپ علوم کی اس سٹیج پر پہنچتے ہیں، تو پردہ رہتا ہے۔ حیرت نہ کوئی انکشاف ہی باقی رہتا ہے۔ زندگی تمام تر حادثاتی اور واقعاتی غلطیوں کا مجموعہ رہ جاتی ہے۔ انسان اپنی پاکدامنی نہیں دیکھتا، وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں پر نظر رکھتا ہے۔ ایک عمر ایسی آتی ہے جب خطا یاد رہ جاتی ہے، جزا کوئی بھی یاد نہیں رہتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ خطا آپ کو روکنے والی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں نے تجھے پاک کر کے ہی دم لینا ہے چاہے کوڑے مارنے پڑیں۔ آدمی کو سزا ملتی ہے۔ لیکن انسان کو عزت اور محبت ملتی ہے لیکن اسے سزا بھی ملتی ہے جب ایک بڑے استاد کے پاس چیز چلی جاتی ہے۔

میں نے تو استادی اللہ کے رسولؐ سے سیکھی ہے۔ بخدا مجھے حیرت ہے۔ سینہ اس کی علمیت پر شق ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بدترین اور بدتمیز ترین کلاس کا استاد تھا کہ شاگرد اس کے گلے میں پٹے ڈالتے تھے۔ اس پر پتھر برساتے تھے۔ اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ کیا عورتیں اور کیا مرد کون سی دنیا کی اذیت ایسی ہے، جو اس استاد کو انہوں نے نہیں پہنچائی۔ مگر استاد کا سلوک دیکھیں کہ کسی کو گالی دی نہ کسی کو چھڑی ماری۔ نہ کسی پر لعنت بھیجی۔ اس کے برعکس وہ صرف محبت، محبت اور محبت تھا۔ اس نے جنگ جیتی اور بدتمیز ترین کلاس کے افراد اس کے توسط سے دنیا کے بہترین اصحاب رسولؐ بن گئے۔

میں ایسے پیٹرن کو پسند کرتا ہوں۔ وہ کون سا استاد نہیں ہے جو الٹی سیدھی بات کو اپنی ذاتی عزت بنا نہیں لیتا؟ جوابی طور پر ہٹ کرتا ہے۔ غصے ہوتا ہے، شاگرد کی حاضریاں شارٹ کر دیتا ہے اور اس کو کلاس سے نکال دیتا ہے۔ اس کے گھر جاتا ہے اور اس کے والدین سے شکایت لگاتا ہے۔ میں نے کسی کو محمد رسول اللہؐ سے بڑھ کر بڑا ٹیچر نہیں پایا۔ وہ سب سے بڑے استاد کیوں تھے؟ کیونکہ وہ اس واحد ہستی کے ذریعے تعلیم دیتے تھے، جس واحد ہستی کو ہی شرف استادی حاصل ہے۔ علم والا کس طرح آرام سے بیٹھ سکتا ہے؟ اس نے آگے کچھ نہ کچھ دینا ہی ہوتا ہے۔ خدا علیم تھا، تو یہ تعلیم شروع ہوئی **و علم آدم الاسما کلھا** بڑا شوق تھا اللہ میاں کو استاد بننے کا۔ وہ فرشتوں کا استاد نہیں ہو سکتا تھا کہ جن کو اس نے ایک خاص مقصد کے تحت ایک ڈیٹا دے کر مکمل کر دیا تھا۔ ان کو اس نے کیا پڑھانا تھا؟

دیکھیں، فرشتوں نے کتنی معقول بات کی تھی۔ ان بے چاروں کو جب تختی دی گئی کہ چلیں جب آپ چیلنج کرتے ہو کہ تم بھی پڑھ گئے ہو **ثم عرضھم علی المالئکہ فقال انبونی باسما ھولا ان کنتم صادقین** کہتے ہو، تم نے اس بیوقوف کو کیوں اتنا بڑا کر دیا؟ اس جاہل اور ظالم کو اتنا بڑا رتبہ کیوں دے دیا؟ تو اللہ نے کہا، ٹھیک ہے، تم بھی تختی لے لو اور آدم بھی لے لیتا ہے۔ یہ اسما ہیں Go ahead، کرو مقابلہ۔

اس مقابلے میں دس بیس ہزار سال کا عرصہ تو گذرا ہی ہوگا۔ دونوں کو اللہ نے مہلت دی۔ دس ہزار سال بعد فرشتے واپس آئے اور کہا **قالو سبحانک لا علمنا الا ما علمتنا** اے اللہ میاں! تو پاک ہے ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ودیعت کیا ہے۔

ہمارے پاس آگے کا نہ پیچھے کے تجربات کا کوئی علم ہے۔ لوکل آرڈر اور لوکل استحکام ہے۔ جتنا تو نے عطا کیا، اس کے بغیر ہمیں ایک لفظ نہیں آتا۔ اس نے کہا قال یا آدم انبھم باسماءھم اے آدم تو بتا، تو نے بھی تختی لی تھی فلما انباھم باسماءھم وہ فر فر شروع ہو گیا۔ پورے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ نام رکھا، وہ نام رکھا۔ اس کو درخت کہا اس کو لکڑی اور اس کو پانی کہا۔ اس کو اماں کہاں، اس کو ابا کہا۔ اللہ میاں نے بڑے تفاخرانہ انداز میں، جو استاد کا تفاخرانہ انداز ہو سکتا ہے، کہا قال اقل لکم نہیں کہتا تھا، تم سے اے فرشتو انی اعلم غیب السموات والارض میں جاننے والا ہوں، جو زمین اور آسمانوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی اہلیت کتنی اور کس کا میرٹ کتنا ہے، یہ میں جانتا ہوں و اعلم ما تبدون و ما کنتم تکتمون میں اچھی طرح جانتا ہوں، دلوں میں تم کیا ہوس چھپائے پھرتے ہو۔ کیا آرزو تھی، جو شیطان کے دل میں پلتی تھی اور کیا تمہارے دل میں پل رہی تھی۔ مگر افسوس کہ تم اس کے اہل نہیں تھے۔ یہ جو اہل ہے، وہ نا اہل ہے۔ جو جنتی ہے، وہ جہنمی ہے۔ اس میں بیلنس نہیں ہے۔ ایک پاؤں ادھر اور ایک ادھر ہے۔ اس نے سیکھا اور اس نے سمجھنا شروع کیا۔ کیا پتہ، اس کی بنا پر انسان آخرت میں بخشا جائے۔ بہرحال اس نے سیکھنے کی کچھ کوشش تو کی۔

نسبت کی اہمیت

میں نے مغرب کے تمام علماء و فضلا اور دانشوروں کو دیکھا۔ مگر اللہ میاں کسی جگہ بہت سخت ہے۔ ایک جگہ وہ بڑا جذباتی ہے۔ جب حضورؐ کی بات چلتی ہے، تو وہ کہتا ہے، اے پیغمبرؐ، تیری عمر مقدس کی قسم! میں تمہاری زندگی کے ایک ایک لمحے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تیرے اوپر خراش آئے گی، تو میں نے دنیا کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ حضورؐ خدا کے محبوب ترین تعریف کرنے والے ہیں۔ مجھے عیسیٰؑ اور موسیٰ سے کیا تعلق۔ میرا تعلق تو خدا سے ہے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ عیسیٰؑ کون ہے؟ مجھے پتہ چلا کہ وہ خدا کا چہیتا ہے۔ مجھے وہ عزیز ہو جائے گا۔ موسیٰ خدا کا چہیتا ہے، تو میرے لیے وہ قابل احترام ہوگا، محترم ہو گا۔ ورنہ بطور ایک فرد مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر کوئی کائنات کے سب سے محبوب شخص کا انکار کرے گا، تو اللہ سے کیا ہدایت دے گا؟ تحسین، محبت اور رسائی کے اعتبار سے محمدؐ ہی محمود ہیں۔ وہی مقام محمود، مقام شفاعت اور مقام وسیلہ پر فائز ہیں۔

ان سے بڑا اور کون ہے؟ اور اگر آپ اللہ کے بہترین دوست کو برا بھلا کہیں گے یا اس کا انکار کریں گے، تو کیا خیال ہے، اللہ آپ کا بھلا کرے گا؟

اب اللہ کی محبت کیا کرشمہ دکھاتی ہے کہ تین ہزار سال گذر گئے ہیں، ابھی تک ہم حج میں کبھی مقام ابراہیمؑ، کبھی صفا و مروہ اور کبھی رمی جمرات کی مشق کرتے ہیں۔ کیا یہ اللہ کے کام تھے؟ یہ تو ابراہیمؑ کے تھے۔ اپنے دوست سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اللہ کہتا ہے، تم نے یہ رسمیں پوری کرنی ہی کرنی ہیں۔ جو مرضی کر لیں، تمہیں سنت ابراہیمی پوری کرنی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ لوگ حجر اسود کو اس لیے چومتے ہیں کہ وہ جنت سے آیا ہے؟ نہیں اس لیے کہ حجر اسود سے اللہ کے تین دوستوں کے ہاتھ مس ہیں۔ اسے جبرائیلؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہؐ کا مس ہے۔ ہم تو اس علامت مس کو چومتے ہیں۔ اس کا پتھر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مگر تمام لوگوں کا فرض ہے کہ میرے دوستوں نے جس پیار سے یہ پتھر اٹھا کر ادھر لگایا ہے، آپ کو اسے چومنا ہو گا، یہ لذت خیال ہے لذت سنگ نہیں ہے۔

حقیقی راہنمائی کی طلب

پاکستان کو کس چیز کی بنیادی ضرورت ہے؟ ایک خوراک، ایک کپڑا اور ایک مکان ہے اور ہمارے پاس ان کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اگر ہم اپنی خوراک کو مکس کریں۔ جیسے گندم ہماری کم ہو اور ہم اسے چاول کے ساتھ مکس کر لیں، تو یہ ہماری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ یہی چینی کا حال ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری بیوروکریسی زمینی حقائق سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ متاثرین مغرب ہونے کے باعث سپر سٹرکچر کے تصور میں پڑی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتی ہے کہ معیشت اوپر سے اٹھان پکڑے گی جبکہ اکانومی اوپر سے کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

حقیقت میں ہمارے جتنے بھی اکانومسٹ باہر سے آتے ہیں، ان کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں زمینی حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ ہاورڈ اور کیمبرج کے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ میں بھی وہاں جا چکا ہوں۔ وہ ایک غریب ملک کی صورتحال کا ادراک نہیں کر سکتے۔ علم چاہے وہ جتنا مرضی ہے حاصل کر لیں، انہیں گلی اور کوچے کے انسان کی تفہیم ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں کہ میرے ایک دو ڈپٹی کمشنر دوست اس شہر میں آئے اور ہم نے ان کے توسط سے شہر کی

حالت تبدیل کر کے رکھ دی۔ آپ جس طرف مرضی ہے نکل جائیں، گوجر خان آپ کو پاکستان کا شہر نہیں لگے گا۔

دراصل ہم میں سے احساس کمتری کم نہیں ہوتا۔ ہمیں دفتر اور غلام چاہئیں، خدمتگار چاہئیں۔ جب صوفی، ٹیچر اور حکمران اکٹھے ہوں، تب ہمارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ آپ کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ دفاعی سامان کی ہے۔ یہ بھی ہمیں باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت بھی تمام تر ذلت وخواری کے باوجود ہماری یہ صورتحال ہے کہ مجھ سے کسی نے امریکہ میں پوچھا، آپ ایک طرف بھوکے مرتے ہیں اور دوسری طرف ایٹم بم بنا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم امریکہ کی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ امریکہ کر سکتا ہے کیونکہ دنیا کے وسائل میں سے تیرہ فیصد صرف امریکہ کے پاس ہیں۔ ہم آپ لوگوں کی طرح سکائی سکریپر نہیں بنا سکتے نہ ٹوون ٹاور جیسی مناراتی عمارات بنا سکتے ہیں، لیکن ہم تباہی میں آپ کے ساتھ برابر کا شیئر کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی جان بیچ کر بھی ایسے ہتھیار ضرور بنا سکتے ہیں، جو آپ کو مار سکتے ہیں۔ اگر ہم سو سال کا وقفہ دس سالوں میں نکال سکتے ہیں تو اگلے دس برسوں میں ہم آپ کے برابر پہنچ جائیں گے۔

پاکستانی سائنسدان اتنی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں کہ انہوں نے ریڈی ایشن پر قابو پا لیا ہے۔ سٹرٹیجک ایٹم بلاٹ کر لیے ہیں۔ میں موجودہ جنگ (جنگ افغانستان) کے ذرا اس لیے خلاف تھا کہ ہم بہت تیزی سے آگے بڑھنے کی پوزیشن میں آ چکے ہیں۔ اس وقت دو ہزار کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل ہمارے پاس پڑے ہیں۔ تین سالوں کے بعد ہم بڑے سے بڑے ملک پر ہٹ کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی نمبر دو میں ویسے ہی سپیشلسٹ ہیں۔ سب سے بڑی مہارت ان میں کیا ہے کہ اگر کسی ملک نے کوئی زبردست چیز تیار کی ہے، یہ اس میں تھوڑا سا اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا کمال ہے۔ امریکہ اگر کبھی اپنا میزائل ڈیفنس سسٹم بنا بھی لے، تو یہ اپنے میزائل میں کوئی ایسی چیز ڈال لیں گے کہ وہ ان کے سارے ڈیفنس سسٹم کو ناکارہ کر کے رکھ دے گا۔ کسی زمین کی سطح دلدلی یا گیلی ہو، تو کہا جاتا ہے کہ اس میں میزائل دھنس جاتا ہے، مگر پھٹتا نہیں۔ پانی میں بھی نہیں پھٹتا۔ انہوں نے اپنے میزائل کو وہ صفت دے دی ہے کہ چاہے پانی ہو یا دلدل، اس میں ضرور پھٹتا ہے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ یعنی ریورس انجینئرنگ کے بہت سپیشلسٹ ہیں۔ اللہ کرے گا، انشاءاللہ تعالیٰ ہمیں ضرور کوئی فرد ایسا میسر آئے

گا، جو تغیر کا انتہائی دلدادہ ہوگا۔

ہمارا کوئی بھی رہنما اپنے حساب سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ صرف اقتدار کا خواہاں ہوتا ہے اور اس کا سب غصہ عذاب سب اقتدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہمارے حکمران سیکولر فلاسفی پر عمل پیرا ہیں کہ لوگوں کو کس طرح کامیابی سے استعمال کریں اور اقتدار میں آ کر انہیں بھول جائیں۔ یہی کچھ وہ تمام وقت کرتے ہیں۔ ہم نے نا اہلیت کا ایک جہان آباد کر رکھا ہے۔ اگر ایٹمی سائنسدانوں نے اتنا کچھ نہ کیا ہوتا، تو ہماری چھٹی ہو چکی ہوتی۔ یہ لوگ کبھی غریب رہے ہوں، تو انہیں غربت کا پتہ چلے۔ کسی گلی کوچے میں گئے ہوں، تو انہیں پتہ چلے کہ لوگ کس طرح زندگی گذار رہے ہیں۔ تاہم ابھی ہماری حالت غرناطہ کے آخری دور کی طرح کی نہیں ہوئی۔ جس میں جرنیل جنگ کے لیے جاتا تھا، تو اچانک پیچھے سے آواز آتی تھی۔ حضور قبلہ و کعبہ جرنیل صاحب کو زکام ہو گیا ہے۔ فوجیں ہالٹ! فوجیں وہیں رک جائیں۔ اس کے بعد جرنیل صاحب کی خیر و عافیت کے لیے تانتا بندھ جاتا۔ پانچ چھ دنوں بعد وہ ناک ملتے ہوئے اٹھتے اور حکم صادر فرماتے: ''مارچ کیا جائے! ہم قوم کے لیے اس حالت میں بھی قربانی کے لیے تیار ہیں۔''

علم اور اہلِ علم

ایک بندے کی مثال کبھی بھی قانون نہیں بن سکتی۔ تصوف میں کسی بھی بڑے استاد نے اصرار نہیں کیا۔ بلکہ سید ہجویریؒ نے وضاحت کی کہ ہم ہزاروں اساتذہ سے مستفیض ہوئے ہیں۔ وہ علم کون سا ہو سکتا ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ علم مولوی صاحب کے پاس نہیں ہے۔ اساتذہ کے پاس بھی موجود نہیں۔ مگر مغرب میں واٹسن کے پاس موجود ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے پاس ہے۔ میں اس کے پاس جاتا ہی نہیں۔ اس سے ملتا ہی نہیں۔ قرآن کریم کی بنیادی آیت کریمہ ہے کہ یتفکرون فی خلق السموٰت والارض اور زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرو۔ اس میں عمرانیات کا علم ہے۔ کاسمیاتی علم ہے اور اسی میں بین الکائناتی علوم بھی موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں کوئی بھی علمی اتھارٹی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اساتذہ کو تلاش کرنا ہے۔ ان کے مطالعے اور تحقیق کو دیکھنا ہے یا پھر ہمیں مغرب میں جا کر علوم سے براہ راست استفادہ کرنا ہوگا۔

قرآن کریم نے وسیع کا لفظ کائنات کے لیے استعمال کیا ہے والسماء بنینھا و انا

لموسعون ہم نے آسمانوں کو اپنی قدرت سے بنایا اور انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔ آپ کو پورے اسلامی علم کے تناظر میں اس کا جواب نہیں ملے گا۔ آپ کو وسعت پذیر کائنات کے تھیسز آئن سٹائن ہی سے ملیں گے۔ قرآن کی توضیح وتشریح مغرب کا ایک سائنسدان کر رہا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ایک مسلمان کی کیا اپروچ ہو سکتی ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہمارے قرآن کے تراجم میں کیا لکھا ہے؟ یہ معانی لکھے ہیں کہ ہم وسیع تر کر دیں گے کہ ہم نے اس میں کشائش رزق رکھ دیا تھا۔ یہ کیا ہے؟ یہ قرآن کے اصل مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن آئن سٹائن قرآن کے ساتھ مطابقت کرتا ہے۔ میرے استاد اس آیت مبارکہ کے ساتھ ترجمہ کا حق ادا نہیں کر پائے۔

آج کے زمانے میں نبی کریمؐ کی وہی حدیث ہے کہ علم مومن کی میراث ہے۔ جہاں سے ملے، وہ لے لے۔ تم ایک نہیں دس ہزار استاد پکڑ لو، لیکن ہو سکتا ہے استاد اپنی جہالت کے مقام پر بیٹھے ہوں۔ تم ہی کو حریص علم ہونا چاہیے۔ جہاں سے آپ کی دانائی اور وژن کشادہ ہوتا ہے اور جہاں سے علم حاصل ہوتا ہے، وہ استاد دین کا ہو یا دنیا کا، اس سے علم حاصل کرو۔ تصوف کے علوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ تصوف کا آدھے سے زیادہ علم تو نفسیات دانوں کے پاس ہے۔ وہ زیادہ نفسیات دان اور کم صوفی ہیں۔ ان کی بنیادی شناخت ذات تو صرف یہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اگر علم کا دوسروں پر اطلاق ہو، تو نفسیات ہے اور اپنے اوپر اطلاق ہو، تو تصوف ہے۔

ایسے نفسیات دان جو آج کل اسلامی یونیورسٹیوں میں تشنگی علم کی سیرابی کر رہے ہیں، ان میں سے کتنے صوفی بن کر نکلے ہیں۔ وہ صوفی ازم کا مطالعہ ہی نہیں کر رہے، بلکہ صرف ذات برائے ذات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کی تمام معلومات کا نتیجہ صرف ڈگری ہوتا ہے۔ فطری طور پر تصوف کا آدھا علم سائنس دانوں سے متعلق ہے اور آدھا نفس ذات سے وابستہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے پاکستان دیکھا ہے۔ اساتذہ دیکھے ہیں اور تصوف کے اساتذہ بھی دیکھے ہیں۔ میں ان کی غیبت نہیں کرنا چاہتا۔

گیارہویں کیوں منائیں

پوچھتے ہیں کہ یہ گیارہویں شریف کیا ہے؟ آپ گیارہویں شریف نہ منائیں، بارہویں شریف منالیں۔ اگر آپ کو بارہویں شریف پر اعتراض ہے، تو آپ تیرہویں یا چودہویں

شریف منالیں۔ مگر خیرات وصدقات کے ارادے سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے بتانے دیجیے کہ گیارہویں کی نیت کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی بات کی خاطر آپ پورے ادارے اور مکتبہ فکر کی توہین نہیں کر سکتے۔ نیت یہ ہے کہ کسی آدمی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت تھی۔ اس نے چاہا کہ میں زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسا کر جاؤں کہ اپنے حبیب کی محبت حاصل کر سکوں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر جمعرات گیارہویں شریف کو ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے لیے نہیں بلکہ خاص اللہ کے لیے۔ لیکن ثواب حضرت شیخ کی نذر کروں گا۔ اب بخاری شریف کی حدیث سامنے رکھتے ہوئے ایک شخص عبدالقادرؒ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے اس کی نذر کر رہا ہے، تو آپ کو اس پر اعتراض کیا ہے؟ آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟

آپ اعتراض کریں گے کہ یہ بدعت ہے۔ اس میں کیا برائی ہے؟ کیا اس قسم کی خیرات کی کوئی سند نہیں ہے؟ کیا یہ بدعت ہے یا گیارہویں بدعت ہے کہ تم چاند کی گیارہ کو کیوں دیتے ہو۔ چاند کی گیارہ کو نہ دیں، دسویں کو دے دیں، پندرہویں کو دے دیں تاکہ آپ کو اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ دن اس لیے فکس کیے جاتے ہیں، جیسے آپ بچے کی سالگرہ مناتے ہیں۔ کسی فنکشن کے لیے بلاتے ہیں۔ لوگوں کا بکھراؤ اتنا ہے کہ آپ جھٹ سے کوئی دعوت نامہ جاری کر کے لوگوں سے یہ تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ اس میں شریک ہوں۔ فاصلے اتنے ہیں کہ ایک دن پیغام، تار یا ٹیلی فون سے آپ کہیں کہ آج ہی آ جائیں، تو کوئی بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ اس سے بھی بڑے شہر ہیں جن کی معاشرت اتنی تنگ اور تیز ہے کہ جب تک آپ سات دن پہلے اطلاع نہ دیں، کوئی پہنچ نہیں سکے گا۔ سات دن پہلے آپ کہتے ہیں کہ گیارہ تاریخ کو بچے کی سالگرہ منانی ہے، آپ پہنچ جائیں۔ مقررہ تاریخ کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کا تقرر مذہبی نہیں ہے، یہ تو آپ کی آسانی کے لیے ہے۔

مجھے انگلینڈ سے سوال کیا گیا کہ سالگرہ اسلام میں حرام ہے یا نہیں؟ میں نے کہا، کسی اور مذہب میں شاید حرام ہو، اسلام میں تو بالکل حرام نہیں ہے۔ اس نے کہا، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا سالگرہ پر کیا ہوتا ہے؟ لوگ ملتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور بچوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ان تین چیزوں میں کون سا غیر اسلامی فعل ہے؟ اسلام تو یہ درس دیتا ہے کہ بلکہ

بڑے واضح انداز میں کہتا ہے کہ اللہ کو دو نیکیاں بہت پسند ہیں۔ حسنِ اخلاق اور کھانا کھلانا۔ اگر آپ کسی کو گھر بلا کر کھانا کھلاتے ہیں اور اس کے عوض کیا طلب کرتے ہیں کہ ہمارے بچے کے لیے دعا کی جائے تو اس میں کیا کارِ حرام ہے؟ آپ انگلینڈ میں مہمانوں کو شراب نہ پلایئے گا، شراب نہ پلانا، جوا نہ کھیلنا یا ایسا پاپ میوزک نہ چلانا، جس میں لڑکیاں اور لڑکے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ہلکی ہلکی موسیقی رکھ لینا، کیا تھوڑی سی خوشی بھی اللہ کو پسند نہیں ہے؟ کیا وہ تمہارا بدمزاج پروردگار ہے؟ وہ اپنی مخلوق، اپنے لوگوں کی اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کرتا؟ یہ تصور اور رویہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہے اسلام تو مذہب ہی دعوت کا ہے۔ ہم ایک ملک وقوم کے طور پر اسی وجہ سے ذلیل وخوار ہوئے ہیں کہ ہم نے مواخات کو ترک کر دیا ہے۔ اگر ہم آج بھی اسے قائم کر لیں تو ہمارا کلچر اسلامی بن سکتا ہے۔

بدعت کی تعریف

بنیادی طور پر بدعت زمانے میں موجود ہے۔ زمانے کے تغیر میں موجود ہے۔ جو زمانے کے تغیر میں موجود ہے وہ بدعت حسنہ کہلاتی ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ بدعت اصول میں بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص چھٹی نماز کا نعرہ لگا دیتا ہے تو یہ بدعت ہے۔ میں نے بڑے پیر فقیروں کو چھٹی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ بعض پیر خانوں پر اگر جائیں، تو آپ کو ضرور پڑھنا پڑتی ہے۔ تہجد آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ پڑھیں نہ پڑھیں، بندوں نے اسے وہاں لازم قرار دے رکھا ہے ورنہ بڑے حضرت صاحب بات بھی نہیں کریں گے۔ جس چیز کو شرع سے زائد بنا لیا جائے، وہ بدعت ہے۔ شرع نبی کریمؐ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ حلال حرام ختم ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص حلال وحرام میں فقیہانِ اسلام کی حجت کے بغیر کوئی چیز شامل کرتا ہے یا بڑھا دیتا ہے، وہ بدعت ہے۔ اگر نمازیں پانچ ہیں، تو چھٹی نماز بدعت ہے۔ اسی طرح چار نمازیں بھی بدعت ہیں۔ اصولِ دین میں کوئی تغیر بدعت ہے۔ زمانہ جدید آ گیا ہے اور ہم کہیں کہ روزے فضول ہیں، یہ بدعت ہے، اگر آپ روزے نہیں رکھ سکتے، تو پھر کھانا کھلاؤ۔ تمہیں وہ کسر پوری کرنی پڑے گی، جو قرآن وشرع نے تمہیں بتا دی ہے۔ اس میں انحراف ممکن نہیں۔ تم زنا کی سزا کے خلاف ہو۔ بدعت میں ڈی این اے کو شامل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ڈی این اے زندہ گواہ ہے۔ اگر زنا بالجبر کا

کیس ہے پھر آپ اس پر ڈی این اے کی شہادت کا ٹیسٹ لے سکتے ہیں۔

چونکہ خداوند کریم کا طریقہ زنا کی سزا میں بخشش کا یہ نظر آتا ہے کہ اس میں چار زندہ گواہوں کی شہادت بالکل ضروری ہے۔ ڈی این اے اس وقت شامل ہوگا، جب زنا بالجبر کی شہادت کی تصدیق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سخت ترین سزا کے لیے سخت ترین طریقہ اپناتا ہے۔ اس حد تک فقہ استدلال دیتی ہے کہ مرد اور عورت ننگے بدن چارپائی پر بیٹھے ہیں یا لیٹے ہوئے ہیں اور بوس و کنار میں مصروف ہیں، پھر بھی ان پر حد نہیں لگائی جا سکتی، جب تک کہ چار گواہ موجود نہ ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ جتنی سزا سخت ہے، اتنی ہی تصدیق سخت ہے۔ یہ ناممکن بن جاتا ہے۔

بلاشبہ خدا سزا دینا چاہتا ہے، لیکن وہ خارجی عوامل کی بنیاد پر ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سزا نہیں ہے، بلکہ ثواب کی بات ہے کہ ایک آدمی آگاہ ہو جائے، میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، وہ ایک اتھارٹی کے پاس جاتا ہے کہ مجھے پاک کیا جائے۔ میں اپنے گناہ کی سزا طلب کرتا ہوں۔ یہ اس کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس کی بخشش اللہ کے ہاں ہے۔ مگر ایک شخص وہم پرست ہونے کے باعث سمجھتا ہے کہ گناہ کا اس وقت تک ازالہ نہیں ہوتا، جب تک کہ میں پاک نہ ہو جاؤں۔ میں اپنی جان دے کر ہی اس گناہ سے بچوں گا۔ وہ خلیفہ کے پاس جاتا ہے کہ میں نے یہ خطا کی ہے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے پاک کیا جائے۔ اسے پاک کیا جاتا ہے۔ پہلے آپ پتھر مارتے تھے اس وقت یہ طریقہ رائج تھا۔ یہاں میں اس کو بدعت نہیں کہوں گا مگر میرا خیال ہے کہ موت تک سنگ زنی سوسائٹی کے باقی لوگوں کو نفسیاتی لحاظ سے متنبہ کرنے کے مترادف ہے۔ اس میں ٹائم کا مسئلہ ہے۔ تلوار تو اس وقت بھی موجود تھی۔ تلوار سے سزا کیوں نہیں تجویز کی گئی؟ پتھر کیوں، سٹون بڑا بے رحم لفظ ہے۔

لیکن حقیقت میں زنا آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ زنا بالجبر آگ کی طرح نہیں پھیلتا، بلکہ پورا معاشرہ اس کے خلاف متحد ہو جاتا ہے، لیکن باہمی رضامندی سے زنا اندر ہی اندر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا جاتا ہے اور پورا معاشرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس چیز سے منع کرنے کے لیے ایک نفسیاتی خوف بیدار کیا جاتا ہے۔ زنا اخلاقی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مضبوط قوم کی بنیاد کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے افراد نہ امانت دار ہیں نہ ہی کسی کسوٹی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

چار شادیوں کی اجازت

شادی ایک معاہدہ باہمی ہے۔ دنیا کی ہر مہذب قوم اپنے معاہدے کی حفاظت کرتی ہے۔ اگر تم اپنے معاہدے کی حفاظت نہیں کر سکتے، تو اس سے جان چھڑا لیں۔ اسے چھوڑ کر دوسری سے بیاہ کر لیں۔ تمہیں اللہ نے اجازت دے رکھی ہے مگر چونکہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ عورت خطرات میں گھری ہوئی ہے اس کے بچوں کا غیر محفوظ ہو جانا اسے نظر آتا ہے۔ اس کا خاوند possessive and chauylnistic ہے۔ انتشار اور خلفشار بڑھ جاتے ہیں اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔ غیر وفاداری کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتی ہے اور یہ پورے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جاتی ہے۔

مجھے ایک شخص نے بتایا کہ آپ کی تبلیغ کی وجہ سے میں مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا، ایک زمانہ تھا، میں بہت کرپٹ تھا، میں عورتوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا، مجھے کسی کی پروا نہ تھی مگر جب سے میں نے تبلیغ شروع کی ہے مجھے بڑا سکون و قرار ہے۔ اب مجھے زن پرستی بالکل پسند نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی عورتیں اپنی خاص عشوہ و اداؤں سے فریب دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں، حتیٰ کہ وہ سیکس کی بھی پیشکش کرتی ہیں، میں کہاں جاؤں؟ تو میں نے کہا کہ گھر سے نہ نکلیں اور کیا ہو سکتا ہے۔

حسین بن منصور حلاج

حسین بن منصور حلاج کا واقعہ قطعاً مشکوک ہے اور کسی خاص معیار پر پورا نہیں اترتا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو جذب و مستی کو بڑا پسند کرتے ہیں۔ کچھ بزرگوں کے دعوے بڑے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس جائیں اور فوراً کہے کہ ہاں بچہ کیا مانگتا ہے؟ انا الحق کے بعد تو ہم نے ہی انا الحق کہا ہے۔ وہ اس دعوے کو بڑا دعویٰ سمجھتے ہیں کہ منصور کے بعد وہی اللہ بن بیٹھے ہیں۔ منصور نے ایک سادہ سی غلطی کی۔ اس کی تصنیف اور شاعری قابل قدر ہے۔ اگر اس کی شاعری اور تحریر سے ہی تعریف کرنا مقصود ہے تو پھر قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ قرۃ العین کی شاعری اتنی گرانقدر اور خوبصورت ہے کہ میرے جیسا سخت ترین معیار رکھنے والا

انسان بھی اس کا آدھے سے زیادہ دیوان یاد کر لیتا ہے۔ اس کی شاعری واقعی قابلِ داد ہے۔ میں اس کی شاعری کے بارے میں نہیں بتا سکتا، بڑی مشکل سے ایسے اچھے شعر کہیں نظر آتے ہیں۔

آپ معیار کو بھی تو کسی معیار پر چیک کرتے ہیں۔ آپ کے پاس قرآن ہے حدیث ہے اور رسولؐ کی ساری زندگی کا نمونہ ہے۔ یہ بذاتِ خود بہت بڑا معیار ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے کبھی کیوں نہ کہا کہ میں انا الحق ہوں۔ زیادہ حق تو ان کا بنتا ہے۔ تو یہ خرافات ہیں۔ ایک مستی و سکر کا ایسا بیان ہے جس کے پیچھے کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر بہت سارے اظہار اور آرا اس کے خلاف جاتی ہیں۔ مورخین جیسے کہ ابن کثیر اور ابن ندیم نے حسین بن منصور حلاج کے خلاف بہت سارے دستاویزی ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اس پر فتویٰ اسی وجہ سے لگا تھا کہ اس نے گھر میں کعبہ بنایا ہوا تھا۔ ادھر کیا جاتے ہو، ادھر ہی طواف کرو۔ حج قبول ہو جائے گا۔ وہ بھی رائے ونڈ تھا۔

مجموعی طور پر یہ زوال کا دور ہے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے واقعات بہت ہیں۔ امریکہ جب سپر پاور بن رہا تھا، ہپی تحریک ابھری، جو ایک صوفیانہ تحریک تھی۔ Psychic - Delic شروع ہو گئے۔ جیسے ایل ایس ڈی کا نشہ شروع ہوا اور لوگوں نے تفریحات پر جانا شروع کر دیا۔ یہ ایک Fatigue کی سائیکی ہے، جو کہ وقت کا ساتھ نہیں دیتی۔

اب اپنے گھروں میں دیکھ لیجیے کہ ایک شخص اچھا کما رہا ہے۔ کھا پی رہا ہے لیکن دوسرا بھائی اس جیسا نہیں بن سکتا اور وہ اس پر تنقید شروع کر دے کہ یہ گدھا ہے، نالائق ہے، ہماری طرف دیکھو، اتنی محنت کی، یہ کیا، وہ کیا، حتیٰ کہ اس مقام پر پہنچا۔ جبکہ تو نالائق ہے کسی مقام پر پہنچ کے دکھا۔ اس میں ایک ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ اس ردعمل کے نتیجے میں وہ افسردہ اور اداس ہو جاتا ہے۔ ڈیپریسڈ ہو جاتا ہے اور آخرکار سائیکی ڈیلک بن جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ہر طاقتور زمانے یا اقتدار کے اعلیٰ ترین زمانوں میں یہ جو Lesser reactions ہیں، یہ نئی Pyschic - delic تحاریک شروع کرتے ہیں۔ اس سرگرمی سے فرار ڈھونڈتے ہیں۔ فرض کریں، جب مسلمان لڑنے کے لیے فوج کی بھرتی شروع کریں، تو ان میں کچھ لوگ جوش و خروش کا مظاہرہ کریں کہ ہم مالِ غنیمت پائیں گے، لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے، جن کو تلوار سے نفرت ہوگی۔ بزدلی میں جائیں گے اور وہ تصوف کی طرح چلے جائیں گے۔ انہوں نے افیون پینی شروع کر دی۔ بہت ساری خرافات اقتدار کے زمانے میں ردعمل کے طور پر اٹھتی

ہیں اور زوال کے زمانے میں سند بن جاتی ہیں۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے۔

اصل میں آپ کو فقر کی طلب نہیں ہوتی، بلکہ اقتدار کی طلب ہوتی ہے۔ اس میں فقر کو رسوا کیا جا رہا ہے۔ میں جب لاہور میں تھا، تو لوگ پوچھتے کہ میں فلم ایٹمی پٹاخہ بنا رہا ہوں۔ یہ فلم مقبول ہوگی یا نہیں۔ اب ایسے لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ فلاں کے پاس کالا علم ہے، کالے علم سے لوگ کام کراتے ہیں کیونکہ پہلا دن ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی خرافات ہے، جس کو خدا کی تلاش کا نام دیا جاتا ہے۔ اب تو بہت سارے لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

بہت سارے لوگوں کا کاروبار مدھم پڑ گیا ہے۔ بہت سارے پیر اپنی گدیوں سے نیچے آ پڑے ہیں۔ انہیں علم تھا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ انہوں نے غلط کام شروع کیا ہوا تھا۔ وہاں ایک ایسا شخص آ گیا، جو لوگوں کو قائل کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ اس کے پاس جائیں گے، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ سالہا سال گذارنے کے باوجود بھی لوگ اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ سیدھے فلاں پیر کے پاس جائیں گے۔ پھر آ کر بتاتے ہیں کہ ہم تو ویسے ٹیسٹ کرنے گئے تھے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ ٹیسٹ کر کے وہیں رہ جاتا تھا۔ اللہ کا بندہ اللہ کے سوا کسی چیز پر توکل نہیں کر سکتا۔

فطرت کی تعریف

فطرت تین عناصر پر مشتمل ہے۔ ایک تو آباؤاجداد کی صدیوں سے چلی آتی ہوئی جبلتیں ہیں۔ جبلتیں، جو ہمارے وجود میں اتنی گہری ہیں کہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی جانورانہ رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسری، وہ فطرت ہے، جو ہمیں والدین سے ملتی ہے اور تیسری اس تربیت کا حصہ اور وہ اکتسابی ہوتی ہے۔ یعنی ایک Genertic دوسری Immediate parental اور تیسری Acquired عادتیں۔

سب سے مشکل جینیٹک فطرت ہے، جسے توڑنا مشکل ہے۔ مثلاً جنسی خواہشات اربوں سال کے تسلسل کے باوجود ختم نہیں کی جا سکیں۔ ہم ان خواہشات کو سدھار سکتے ہیں، ختم نہیں کر سکتے۔ ان کی خاطر جانے کیا کیا بن سکتے ہیں۔ کھانا ہم نے ضرور کھانا ہے۔ کھانا بقا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے، ہم نے تمام جانوں کو بخل جان پر جمع کیا ہے۔ جو بقا کو ہٹائے گا، شہید کہلائے گا اور شہید کا مرتبہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ زمین پر اور آسمان پر بھی۔

جسے نفس کہتے ہیں، وہ پیچھے کی طرف، وراثتی اور جینیٹک عادات کی طرف مراجعت کرتا ہے اور اکتسابی عادات کبھی کبھی فساد اور مکروفریب بن کر رہ جاتی ہیں۔ سپریم کورٹ کے بہت بڑے عادل جسٹس ہوئے ہیں مگر جب ڈانس کرنے اور شراب پینے کی باری آئی، تو اپنے سیکرٹری کی بیوی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

علم کی انتہا حیرت

دنیا میں جتنے بھی مسائل کے حل کے تھیسز اور سسٹم بنے ہیں، وہ جزوی وضاحت دیتے ہیں۔ سوائے اس آدمی کے، جس کی اللہ کی طرف توجہ ہے۔ جو اللہ اور اس کی پروامنگ کو جانتا ہے۔ جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے زندگی میں خیرت کبھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اقبال کہتا ہے کہ علم کی انتہا حیرت ہے اور عشق لاانتہا ہے۔ مگر دراصل اقبال بھی صوفی نہیں تھا۔ وہ بہت اعلیٰ درجہ کا فلاسفر تھا۔ علم وہی ہے، جس میں حیرت نہ ہو۔ جب آپ خدا کو جانتے ہیں، تو آپ کو کوئی حیرت نہیں رہتی۔ انکشاف سے پیدا ہوئی حیرت اعتراف شکست یا اعتراف کمتری ہوتی ہے۔ مجھے اپنی بندگی کا اعتراف ان چیزوں سے ہوتا ہے، جو خدا میرے اردگرد بڑے عجیب وغریب انداز میں بکھیرتا ہے۔ مگر وہ عقلی حیرت کا باعث نہیں ہے۔

جب آپ اللہ کو مان لیتے ہو، تو عقل کی حیرت تمام ہو جاتی ہے۔ فرض کریں، یہاں ایک ستارہ ٹوٹ کے گرتا ہے۔ وہ زمین و آسمان میں معلق ہو جائے۔ نیچے گرے نہ اوپر ہی کو جائے، تو ہو سکتا ہے، سائنسدانوں کو حیرت ہو کہ کس چیز نے اس کو بیچ میں روک دیا۔ مجھے نہیں ہوگی کہ مجھے پتہ ہے، میرے اللہ نے یہ کیا ہے۔

ایک مرزائی نے مجھ سے سوال پوچھا کہ تم سائنسز میں اتنا ادراک رکھتے ہو۔ کیا تم مانتے ہو کہ پیغمبر جسمانی طور پر اوپر گئے تھے؟ میں نے اسے سوال کیا کہ جناب کیا اسے میں نے بھیجا تھا، تو پھر تو مجھے حیرت ہوتی۔ یا کسی سول سرونٹ یا کسی صدر نے بھیجا تھا؟ اگر آپ کے اور میرے نزدیک اللہ نے بھیجا ہے، تو میں آپ سے یہ سوال کروں گا کہ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ نہیں کہ وہ کسی بندے کو جسمانی طور پر آسمان پر لے جائے، وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں نے کہا، ڈائریکٹ سوال پر آؤ۔ کیوں ادھر ادھر جا رہے ہو۔ جب تم اللہ کو مانتے ہو، تو یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ جو چاہتا ہے، کر سکتا ہے۔ اس کے بعد حیرت نہیں ہوتی۔ تشکر اور انکسار رہ جاتا ہے۔ سیکھنے کا جذبہ رہ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کی ہر بات اس کے علم کے بغیر اپنی روح اور قانون کے بغیر نہیں چل سکتی۔ ہمارا کام یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام واقعات کو سمجھیں کہ وہ کون سے اطرافی علوم ہیں، جنہیں تلاش کریں، جو اللہ کی حکمت کا باعث بنتے ہیں۔

مانے والوں میں فرق

اس میں دو پیٹرن ہیں۔ ایک تو مذہب کا مقررہ پیٹرن ہے۔ اس میں ہو سکتا ہے ایک شخص شروعات میں ہو۔ ایک انجام میں ہو۔ ایک مسلم اور ایک مومن ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ کسی تہذیبی دور میں لوگ جب اسلام یا کسی دیگر مذہب پر عمل کر رہے ہوں، ایک شخص کو ہم کہیں، یہ بنیاد پرست ہے۔ اس کو عقل نہیں ہے۔ یہ کولہو کے بیل کی طرح مذہب پر عمل کر رہا ہے۔ ایک سابقون لاولون کی طرح جد وجہد کر رہا ہے۔ غور وفکر کرتا اور اللہ کے راستے میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر ایک شخص کے بارے میں اللہ کہتا ہے **الا ان اولیاء اللہ لاخوف الیھم ولا ھم یحزنون.** یہ ولی ہیں۔ ان کو کوئی خوف اور حزب نہیں ہے۔ یہ میرے بندے ہیں۔ اس کے آگے کچھ لوگوں کے بارے میں خدا کہتا ہے، یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ ہیں۔ یہ صدیقین اور شہداء ہیں۔ یہ مر کے بھی نہیں مرتے۔ ان کی زندگی قائم رہتی ہے۔ مزید خدا اس سے بھی آگے کے مراتب کے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ آگے بڑھنے والے سابقون میں سے ہیں۔

یہ ایک ہی تحریک ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ درجاتی فرق ضرور ہے مگر یہ اختلافی فرق نہیں۔ اس میں ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلم اور مومن میں فرق اس لیے ہے کہ دونوں میں سے ایک کسی اور چیز کو مانتا ہے اور دوسرا کسی دوسری چیز کو مانتا ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ مراتب ذہن وفکر کے لحاظ سے ہر ایک کی تفہیم مختلف ہے۔ جوں جوں لوگ آگے بڑھتے ہیں، جنہوں نے زیادہ محنت کی اور جو خدا کے زیادہ قریب تر ہوئے، اس کی بنیاد پر ان کے درجات مقرر ہوں گے اور یہ کہ لوگ خدا سے کتنی دوری پر کھڑے ہوئے۔ ایک اللہ کے حرم میں ہے، تو ایک اللہ کی بارگاہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ ایک آسمان ہشتم پہ، تو ایک چہارم اور ایک آسمان اول پر براجمان ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کا رستہ کوئی اور یا ان کی مجلس کوئی اور ہے۔ وہ جو اللہ کے حرم مقدس کے باہر چپڑاسی کی حیثیت سے کھڑا ہے اور جو اندر کسی تخت عنایت پر بیٹھا ہوا ہے وہ ہیں ایک ہی۔ وہ ایک سسٹم اور ایک مکتب فکر کے لوگ ہیں۔ مکتبہ فکر میں بہت سی حیثیتیں مدغم ہوئی ہوتی ہیں۔ اس حیثیت میں چیف ایگزیکٹو اس کائنات کے محمد رسول ﷺ ہیں۔ اس کا اعلان اللہ نے قرآن پاک

میں کیا۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین.

اب چیف ایگزیکٹو کے تعینات ہونے کے بعد پتہ چلا کہ چیف ایگزیکٹو کے کچھ پیغامات اور کچھ کام ہیں۔ پتہ چلا کہ چیف ایگزیکٹو کا سارے کا سارا اقتدار قرآن ہے۔ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کتاب کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ دوسروں کو زندگی بسر کروائے اور لوگوں کو حیات ابدی و سرمدی اور خدا کی قربت کے راستے دکھائے مگر اس نے سارا کچھ ڈلیور نہیں کیا کیونکہ اس سے پہلے بہت سارے لوگ گذر چکے تھے۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ تو آخر زمانہ میں اللہ کے اس رسول نے درمیان میں آنا تھا، تو خدا نے یہ کیا کہ اس چیف کے چھوٹے چھوٹے جملے اور آیات پہلے لوگوں کو بھی بانٹ دیں۔ حضور ﷺ سے پہلے قرآن میں سے ایک آیت اٹھا کے آدم کو دے دی اور کہا چل بھئی آدم! اس آیت کے مطابق تو ہدایت یافتہ ہے۔ آپ اس کو پڑھاؤ۔ ایک نوح کو دے دی۔ ایک شیث کو، حتیٰ کہ موسیٰ کو دس احکام دے دیئے۔ حضرت عیسیٰؑ کو داخلی و باطنی شریعت دے دی، مگر پورا قرآن نہ دیا۔ کیونکہ پورا قرآن ان کا تھا نہیں۔

یہ پورا پیغام اور پوری کتاب جس کی تھی، اس نے بعد میں آنا تھا۔ مگر اس کی شان یہ تھی کہ اس کی پارٹی یا نبی کی طرح کے کچھ لوگوں نے پہلے بھی پیغام ڈلیور کیا۔ فرض کیجیے، میں آدمؑ، نوحؑ اور شیثؑ کو مانتا ہوں اور موسیٰ اور ابراہیمؑ کو بھی جانتا ہوں، مانتا آ رہا ہوں اور مذہب سے جزوی پیغام حاصل کرتا چلا آ رہا ہوں۔ پھر میں محمد رسول ﷺ تک پہنچ کر ان کا انکار کر دیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ میں مذہب کا سب سے احمق ترین طالب علم ہوں۔ یہ انتہائی احمقانہ بات ہو گی کہ میں کتاب کے جزو پر تو اعتبار کرتا ہوں اور مجھے سو فیصد پتہ ہے کہ کتاب کا اول و آخر سچ ہے جبکہ باقی جو پوری کتاب لانے والا ہے اس کا انکار کر دیتا ہوں۔ یہ خدا اور اس کے پیغمبر چیف ایگزیکٹو کی توہین ہے۔ اب ایسے لوگوں کی نجات بڑی مشکل ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو ذاتی رجحات کے تحت اس کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر جو اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گیا، اسے عیسائی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ عیسائیت کے پاس تو قوانین اور طرز زندگی نہیں ہے۔ اس میں صرف نیات کی چند باتیں شامل ہیں۔ ایم اے کے بعد مجھے دوبارہ اپنے نام کی تختی پر پانچویں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ پراگریسو مذہب ہے۔ اول و آخر آگے بڑھتا ہے۔ قرآن نے صرف اتنی بات کہی کہ دیکھو، پیچھے

سے تھوڑا تھوڑا مذہب آ رہا ہے۔ ہر چیز ادھوری تھی۔ انسان اور پیغام ابھی مکمل نہیں تھا۔ اب آخری پیغمبر آ گیا ہے۔ پیغام مکمل ہو گیا ہے، اس لیے اب مزید کسی پیغمبر، کسی اور مذہب اور فیصلے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ پیغام بھی مکمل ہو گیا اور پیغام کی حفاظت کا بندوبست بھی ہو گیا۔ **انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون.** حضور ﷺ کے بعد کسی اور پیغمبر کے آنے کا تصور استہزائی ہے۔ یہ مذاق ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں نے تکمیل کرنے کے بعد بھی ادھورا پن اور قرآن لکھنے کے بعد بھی کچھ قرآن کی مزید گنجائش رکھی ہو۔ یہ بڑی احمقانہ سی بات ہے اور یہ خدا کے پیغام کو براہ راست مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ جب وہ صاف طور پر یہ کہتا ہے **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت.** ایک جگہ کمال کا لفظ اور ایک جگہ تمام کا لفظ استعمال کیا، **واتممت الیکم نعمتی.** ادھر ہم نے پیغام پورا کر دیا اور شاندار ترین پیغام کو تکمیل تک لے گئے۔ ادھر ہم نے پیامبر پورے کر دیے۔ اس کے بعد خدا اپنے پیغمبروں اور اپنے پیغام کی توہین نہیں کر سکتا۔

میں ان لوگوں کی بات نہیں کرتا، جو دنیا دار یا کمیونسٹ ہیں۔ ان کی بات کرتا ہوں، جن کے پاس دیگر چوائس بھی تھے۔ انہوں نے اگر موت کو چیلنج لیا اور اپنی کارگزاریوں کو خدا بنا لیا، تو انہیں کرنے دیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن وہ لوگ جو خدا کو جانتے اور اس کی خدائی کو تسلیم کرتے ہیں، ان کے پاس سوائے اللہ کے رسول ﷺ کو ماننے اور قرآن کو تسلیم کرنے کے اور کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے پاس اسلام کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے، تو وہ قطعی مذہبی نہیں ہیں۔ چاہے وہ عیسائی ہوں یا یہودی۔ یہی ان پر عذاب کی بنیاد ہے۔

قبر کی بھینچ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قبر کی بھینچ سے کوئی ذی روح آزاد نہیں۔ ہوتے، تو سعد بن معاذؓ ہوتے۔ وہ اس قدر خوبصورت کردار کے مالک تھے کہ رسول کریمؐ نے خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کا مطلب ہے کہ تھوڑے سے وقت کے لیے پورے انسان کو چند لمحوں کے لیے اس کے پورے جسمانی وجود میں جگایا جائے گا، اس کے بعد اس پر موت واقع ہو جائے گی۔ یہ دوسری زندگی اور دوسری موت ہے، جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ ایک وہ موت، جو بیرونی طور پر ہم پر وارد ہو گی۔ ہم قبر میں چلے گئے، چھوڑنے والے چلے جائیں گے۔ ہم کو دوبارہ اپنے پورے وجود کی

صحت میں چند لمحوں کے لیے اٹھایا جائے گا۔ اس وقت یہ سوال پوچھا جائے گا۔ یہ کوئی سائیکی سوال نہیں ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ بیٹا! جب میں مر جاؤں، تو کچھ دن میری قبر کے سرہانے رکنا، تاکہ میں آنے والوں سے مانوس ہو جاؤں۔ تمام اصحاب رسول قبر کے سوال و جواب پر یقین رکھتے تھے۔ جب یہ سوال ہو جائیں گے، اس کے بعد آپ کو جہنم یا جنت کا پاسپورٹ دیا جائے گا۔

قبر کی بھینچ اسی لیے کہتے ہیں کہ جسم کو اس اذیت کا احساس ہوگا۔ کیونکہ یہ احساس کہ ہم دوبارہ زندہ ہوئے ہیں اور قبر کی تاریک کوٹھڑی میں ہیں، جس کو ہر سمت سے وسعت دی جائے گی۔ تبھی اس کو بھینچ کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی گرفت سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ اس عمل کے دوران کوئی استثنٰی نہیں۔

تلاش خدا سے لاتعلقی

صدمات کی وجہ سے انسان زیادہ سیکھتا ہے۔ اب بھی آپ دیکھ لیجیے کہ ایک بڑے شاک کی وجہ سے انسان کی ساری ترقی سست پڑ جاتی ہے۔ ایک بڑا شاک...... شیل شاک...... اٹامک شیل شاک، جو آگے آنے والا ہے، اس کی مدت پانچ سے دس سال ہے۔ اس شاک کی وجہ سے جتنی ترقی آپ دیکھ رہے ہیں، دماغ اس کے دھماکے کے اثرات سے شل ہو جاتا ہے۔ اس میں جو بہترین تیزی کی صفات پیدا ہوئی ہیں، یہ ڈل ہو جاتی ہیں اور پھر انسان ماضی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ وہ صفات چھنتی نظر آتی ہیں۔ ایک حدیث مبارک کے مطابق قرآن اٹھا لیا جائے گا۔ قرآن اٹھا لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فہم اور فراست، جو قرآن کے لیے بہرصورت ضروری ہے، وہ ختم ہو جائے گی۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ علم ختم ہو جائے گا اور اس کی وضاحت یہ فرمائی کہ علم ختم ہونے سے یہ مراد ہے کہ عالم ختم ہو جائیں گے۔ جب ہم جدید ادوار کی جانب دیکھتے ہیں، تو ہمیں اس قدر یک طرفہ علم نظر آتا ہے۔

کسی نے آج تک علم کی تلاش نہیں کی۔ اگر علم کی تلاش کی ہے، تو خدا کی تلاش نہیں کی۔ تمام مغربی فلسفہ اور جدید ترین تحقیقات کا یہی المیہ ہے کہ یہ لوگ اٹھ کر خدا کے خلاف بول لیتے ہیں اور ان کا ڈیٹا اتنا کمزور ہوتا ہے، کبھی برٹرینڈ رسل کو نقل کریں گے، تو کبھی آئن سٹائن کو۔

یعنی ان کی اپنی سوچ اور اپنی تحقیق خدا کا قرب ہی نہیں حاصل کر پاتی۔ تمام دنیا جو خدا کے خلاف فیصلے دیتی ہے، ان میں یہ بنیادی کمزوری موجود ہے کہ انہوں نے کبھی خدا کو تلاش نہیں کیا۔ وہ صرف اپنی ذاتی و سماجی مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان مسائل کو حل کرتے ہوئے ان کو خدا رکاوٹ نظر آ رہا ہے۔ کبھی وہ مذہب کو افیون کہہ دیتے ہیں۔ کبھی اسے ماضی میں الجھا ہوا قرار دیتے ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ جادوگری کے آثار ہیں۔ کبھی اس کو حماقت فکرانسان قرار دیتے ہیں۔ کبھی اسے ضرورت انسان قرار دیتے ہیں۔ مگر خدا کے قائل نہیں۔ وجہ واضح ہے۔ ان میں سے کسی نے خدا کو تلاش نہیں کیا۔

دعا مانگنے سے احتراز

ہر آدمی اللہ کے ساتھ اپنی ذات میں مساوی حیثیت سے کھڑا ہوتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی ذاتی زندگی، تفہیم اور تعلیم سارا کچھ آتا ہے۔ ہم نے جس طرح زندگی گذاری، جس طرح خدا کے بارے میں سوچا۔ مگر دعا آپ نہیں بھی مانگنا چاہتے، تو بھی مانگنا چاہیے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ دعا نہ مانگنے سے اس میں دو بڑی خامیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو دعا نہ مانگنا خود پسندی پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ چاہت ہے، جو آپ کے وجود اور آپ کے صحت خیال سے ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو دعا اس حد تک مانگنی چاہیے، اس حد تک نہیں مانگنی چاہیے۔ یہ ذہنی نرگسیت Narcissism ہے۔

دوسرا دعا نہ مانگنے والا ایک ایسا گداگر ہے، جو بخیل ہے۔ قرآن نے ہمیں خطاب کر کے کہا ہے کہ والہ غنی و انتم الفقرا کہ فقیر کا کام تو مانگتے رہنا ہے۔ کسی نہ کسی ڈھنگ سے مانگنا چلتا رہتا ہے۔ بعض انسان میں بعض عدم کے ایسے نقائص ہوتے ہیں کہ ان سے آگہی مشکل سے ہوتی ہے۔ بعض سادہ سی خطا کاریاں ہوتی ہیں، جن کو ہم جانتے ہیں۔ جیسے جھوٹ بولنا، تکبرات ظاہرہ وغیرہ۔ مگر کچھ خفی ہوتی ہیں، جو اتنی نازک ہوتی ہیں کہ ان کا حساب زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تمام زندگی ایک دعا ہے۔ میں تقریباً روزانہ رسول اللہ ﷺ کی ڈیڑھ سو دعائیں پڑھتا ہوں اور اس خیال سے پڑھتا ہوں کہ چاہے میں جدید دور کا پڑھا لکھا ہوں، میں نے پوسٹ گریجویشن لٹریچر سمیت بہت سے مضامین میں کر رکھی ہے۔ ممکن ہے میری ذہنی سطح عام

اساتذہ اور طلباء سے نسبتاً زیادہ ہو۔ اس کے باوجود جب میں اپنے رسولؐ کی دعائیں دیکھتا ہوں، تو میں یہ پاتا ہوں کہ ان کے پڑھنے میں میرے لیے بڑی فلاح و بہبود ہے۔

پھر دعا کے کچھ معانی ہوتے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی دعا، جو میں نے لکھی ہے، اسے جامع دعا سمجھتا ہوں، اللھم انی اسئلک العفو و العافیہ، اس دعا میں لفظ عافیت کے بارے میں رسول اللہؐ کی وضاحت بڑی عجیب وغریب ہے۔ حضرت عباس ابن عبدالمطلب کو یہ دعا عطا ہوئی۔ وہ پیسے کے معاملے میں بڑے چکر میں رہتے تھے، وہ حضورؐ کے پاس آئے کہ بھتیجے مجھے مال وغیرہ کی کوئی دعا دے۔ ایک دن حضورؐ نے کہا کہ چچا میں آپ کو ایک بہت اچھی دعا دیتا ہوں اور یہ دعا بتائی۔ اللھم انی اسئلک العفو والعافیہ، فرمایا، چچا! آج تک انسان نے اللہ سے عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں مانگی۔ مجھے عافیت کے مطالب پتہ نہیں تھے۔ اس کا جو مطلب میں جانتا ہوں، وہ بڑا معمولی سا ہے۔ مگر جب میرا رسولؐ یہ کہے کہ عافیت سے بہتر کوئی چیز اللہ سے کسی انسان نے نہیں مانگی، تو میرا خیال ہے کہ یہ ایک جامع لفظ ہے جو جسمانی، ذہنی اور آپ کے تمام روحانی مسائل کو دور کرتا ہے۔

اب یہ دوسری دعا دیکھیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ نے مجھے جامع الکلام بنایا ہے۔ یعنی میں جو بات کہتا ہوں، وہ ایک مجموعی بات ہوتی ہے۔ یہ دعا بخاری اور مسلم میں مروی ہے ان کے خواص بھی حضورؐ نے ساتھ بتائے۔ دعا ہے اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجر نامن خزی الدنیا و عذاب الاخرہ. جب میں اس کا اردو ترجمہ پڑھتا ہوں، تو یہ مجھے ایک مکمل دعا لگتی ہے کہ اے اللہ میرے تمام کاموں کا انجام بہتر فرما دے اور مجھے دنیا کی رسوائی اور عذاب آخرت سے بچا لے۔ اس کا ایک اور فائدہ حضور اکرمؐ نے فرمایا، کہ اس دعا کے پڑھنے والے کو موت کے سوا کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ یہ وہ وصف ہے، جو میں اپنی کسی دعا سے اس میں پیدا نہیں کر سکتا۔

اسی طرح یہ دعا ہے، اللھم اعنا علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک۔ یہ دعا انعام کے طور پر حضورؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو دی۔ یہ اصحاب صفہ میں میں سے تھے۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں خود بلا کے کہا کہ اے معاذ! کیا تجھے ایک بہت اچھی دعا نہ دوں؟ فرمایا، ضرور یا رسول اللہ! اور آپ نے انہیں یہ دعا دی۔ اب اس دعا میں ایک بہت بڑا

فلسفہ ہے۔ لفظ اعنا پر غور کریں کہ اللہ مجھے اپنے ذکر پر شکر پر اور حسنِ عبادت پر میری مدد فرما۔ وہ تمام لوگ جو یہ دعویٰ رکھتے اور خیال کرتے ہیں کہ وہ عبادت اپنے زور پر کرتے ہیں، درست نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تمام عبادات کی بنیادی اپروچ میں آیا آپ ذہنی طور پر خدا کے ساتھ کمیٹڈ ہیں کہ نہیں۔ قرآن کی آیات کے مطابق وہی اختیار والی بات ہے۔ **انا ھدینا السبیل و اما شاکراً و اما کفورا،** چاہو تو مجھے مانو، چاہو تو میرا انکار کردو۔

انسانی کیمسٹری میں فرق

ساری زندگی کی کیمسٹری تو ایک ہی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی میں دو دل اور کسی میں دو دماغ یا چار آنکھیں ہیں۔ جب کیمسٹری ایک ہو گی، تو اس کی اقدار اور جبلتیں بھی ایک ہوں گی۔ حصولات میں فرق ہو سکتا ہے لیکن اس کی بنیادیں ایک ہوں گی۔ ہم جبلی اقدار سے لڑتے ہوئے ایک ہی دور سے گذرتے ہیں۔ خواہشیں کرتے ہیں کہ ہمیں یہ اور یہ حصولات مل جائیں۔ مجموعی طور پر پوری نسلِ انسانی کی شرق و مغرب میں بنیاد ان کے اعلیٰ اور ارفع کاموں پر نہیں ہے ان کی جبلی اقدار اور جسمانی بناوٹ کی بنیاد پر ہے۔ اس ایک یکساں کیمسٹری کی وجہ سے ہے، جو نسل انسان میں جاری و ساری ہے۔ اگر ہم دس پاکستان، دس امریکہ اور دس روس کے بندوں کا تفصیلی سروے کر لیں، تو پتہ چلے گا کہ ہماری پیدائش، تعلیم اور بڑھنے، پھلنے پھولنے کا طور طریق اور کسب و اکتساب کا وہی پیٹرن ہے۔ خواہشات کا مقرر انداز ہے۔ ان کی زندگی میں خدا اور خدا کی پہچان ذات اور اللہ کے علم کے سوا باقی زندگی کے تواتر میں قطعی کوئی فرق نہیں۔

امریکہ میں لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے مکان میں رہتے اور سردیوں میں کمبل اوڑھتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے اور مر جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہم کرتے ہیں۔ وہ بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم انٹارکٹیک نہیں بھی گئے، تو وہاں کے لوگوں کے بارے میں بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہاں انسان کیا کرتے ہیں۔ یہ کلچر اور تعلیم کا فرق ہے لیکن یہ کہ وہ کھاتے ضرور ہیں۔

اب جو فرق پڑا، وہ الہیاتی تھا۔ اللہ نے انسان کو کوئی بات سکھائی انسان نے سیکھی۔ اب اس کی اقدار میں فرق پڑنا شروع ہو گیا۔ دوسرا بندہ اس لیے اس کو غیر مہذب نظر آیا کہ اسے وہ تہذیب اور رہنے کے انداز میں مختلف نظر آیا۔ اسے خود کو کسی ضابطے اور دائرے میں اپنی زندگی

پابند تھی۔ جبکہ دوسرا آزاد اور شعور اور عقل سے بے بہرہ دکھائی دیا۔ اس طرح وحشت، بربریت اور تہذیب میں فاصلہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ ان فاصلوں کی وجہ کبھی مذہب، کبھی آزمودہ تہذیب، کبھی ثقافتی پہلو اور کبھی انسانی ہنر ہوا، لیکن زیادہ تر انسانی شناخت اور انسان کی عمومی اقدار میں آج بھی انسان کا بدترین اور اعلیٰ ترین انسانی اقتدار ہمیں اللہ کی وجہ سے اتنا ہی وحشی اور غیر انسانی لگتا ہے جیسے قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ ہم نے قوموں کو اس وقت پکڑا، جب وہ اپنی معیشت پر اترا رہی تھی۔ جب ان کے اعلیٰ ترین مکانات، ان کے شاندار باغات، شان و شوکت کے مظاہرات، بڑے نمایاں ہو چکے تھے، اللہ نے عین اس وقت ان کو پکڑ لیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں پکڑا؟ خدا نے خیال کیا کہ یہ لوگ اس کے مقاصد میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اس کے خیال میں وہ مہذب نہیں ہیں، جو اس کی جنت کی تہذیب کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ ایک وہ معیار ہے، جس میں میں کسی کو مہذب اور غیر مہذب قرار دیتا ہوں۔ ایک وہ ہے، جس میں خدا کسی کو مہذب اور غیر مہذب قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے میرے نزدیک مغربی تہذیب بہت مہذب اور بڑی با اختیار ہو۔ بڑے سلیقے والی ہو۔ انہوں نے بڑی اعلیٰ ایجادات کر لی ہوں مگر جب انہوں نے خدا کو ماننے سے انکار کر دیا، تو ان کے تمام کمالات معدوم ہو گئے اور وہ غیر مہذب اور مردود قرار پائے۔

اس کے برعکس ایک سادہ سا آدمی، جس کے پاس اتنا مال نہیں ہے محنت کرتا ہے روٹی کما کر بال بچوں کو پالتا اور مشکل سے بھی زیادہ مشکل میں رہتا ہے۔ جس کے پاس کوئی بڑا مکان نہیں ہے۔ ذرائع زندگی معمولی سے ہیں مگر وہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ جمنٹ جو اوپر سے آئے گی، اس میں یہ آدمی معزز چنا جائے گا۔ جبکہ صدر بش غیر مہذب فتنہ سمجھا جائے گا۔ یہ سوال کہ فیصلہ کرنے والی ذات اصل میں کون ہے؟ کن کے ذمے انسانی شناخت اور کس کے ذمے انسانی ترقی کا ٹیسٹ ہے؟ کس نے ہمیں پاس اور کس نے فیل کرنا ہے؟ اس بات کو جاننے کے لیے دوبارہ ہمیں اس سوال سے رجوع کرنا ہوگا کہ آیا میں خدا میں یقین رکھتا ہوں یا نہیں رکھتا اور پھر یہ سوال کہ آیا وہ موجود ہے یا موجود نہیں ہے؟ پورے کا پورا کائناتی ایشو ہیر پھیر اور گھوم پھر کر انہی دو سوالوں پر آ جاتا ہے کہ آیا خدا ہے کہ نہیں ہے اور اگر ہے، تو کیا میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ نہیں رکھتا؟

غلام احمد پرویز کا تھیسز

پرویز دراصل کم معلومات کا بندہ تھا۔ اس کی سائنسز میں بی ایس سی تک تعلیم تھی۔ اس نے اہل یورپ کی انفارمیشن تو مکمل طور پر لے لی، لیکن وہ اس سے اپنا حل نہیں نکال سکا۔ مگر اس کے پاس وہ جامع ناج نہیں تھا، جس سے کوئی علمی نتیجہ نکلتا ہے۔ اپنی کم علمی کی وجہ سے اس کو کوئی دو حدیثوں پر اعتراض تھا۔ ابو ذرؓ کی ایک حدیث کہ رسولؐ نے فرمایا، جانتے ہو، سورج کہاں جاتا ہے؟ کہا، اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ کہا، یہ عرش معلی کو جاتا ہے۔ اسے پلٹنے کا حکم ہوتا ہے۔ ایک دن ہوگا، اسے پلٹنے کا حکم نہیں ہوگا۔ پرویز صاحب نے کہا کہ سورج تو کہیں بلندی کو نہیں جاتا۔ یہ تو مدار میں چلتا ہے۔ ریگولر ہے۔ کہیں بھی رکتا نہیں۔

دراصل اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ سائنسز اس سے کہیں آگے جانے والی ہیں، جا سکتی ہیں۔ سورج ایک مخصوص رفتار سے اپر گلیکسیز کو جاتا ہے۔ Solar Apex اسی کو کہتے ہیں۔ اس کا آپ ترجمہ کریں، تو عرش معلی کہہ سکتے ہیں۔ Apex میں جا کے یہ دوبارہ پلٹتا ہے۔ حدیث دراصل اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح بہت سے ہمارے عالم ایسے ہیں، جنہوں نے جلدی میں فیصلہ کیا۔

غلام جیلانی برق مرحوم نے بھی یہی کہا تھا۔ برق بہت ہی آگے بڑھ گیا، لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ لفظ اللہ کے نہیں ہیں، تو ہماری تو مذہب کی اساس ہی ختم ہو جاتی ہے۔ رجوع کر لیا تھا، تو اللہ اس کو بخش دے۔

جعلی نبوت اور کامن سنس

مرزا غلام احمد کی مثال دیکھیں۔ مسلمان اس وقت غریب تھا۔ نوکریوں کی تلاش میں تھا۔ کسی جگہ اس کو ٹھکانہ نہیں ملتا تھا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ بھوکا کفر کے بڑا قریب ہوتا ہے۔ انگریز نے ایک سازش سوچی۔ اس نے مرزائیت کو تخلیق کیا۔ وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا اور انہیں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ کرنل Halroyd کی کتاب Respected Family of Punjab میں لکھا ہے کہ مرزائی برطانیہ کے سب سے قابل اعتماد لوگ تھے۔ لوگوں کو یہ لالچ دیا گیا

کہ جو مرزائی ہوگا، اسے جاب ملے گا۔ بلکہ خود مرزا صاحب نے اپنے پہلے 313 متبعین کی لسٹ بنا کر انگریز کو دی اور کہا کہ بڑی مشکل سے میں نے یہ لوگ اکٹھے کیے ہیں۔ ان کو جاب نہیں دو گے، تو یہ لوگ مذہب چھوڑ جائیں گے۔

ان تمام چیزوں کے پیچھے یا تو ایک اعلیٰ ذہنی سطح کا ضدی پن ہوتا ہے، جو ان میں ایک ذہنی رویہ پیدا کرتا ہے یا ان میں کوئی نقص ذہن ہوتا ہے کہ یہ کوئی اعتدال پذیر لوگ نہیں ہوتے۔ ان کی دنیاوی خواہشات بلند و بالا ہوتی ہیں اور وہ ہر قیمت پر ان کا حصول چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک سید کرسچین ہے اور ہر آدمی کو پتہ ہے کہ جاب، منی اور امریکہ کے باعث اس نے یہ بہروپ دھار رکھا ہے۔ آپ لوگوں کو دعوت دے کر دیکھیں کہ امریکہ جانے کے لیے عیسائی ہونا ضروری ہے، تو آپ کو ہزاروں فارم بھرے ہوئے آئیں گے۔

یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سچ ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اگر ہزاروں، کروڑوں بندے بھی اس طرف کو چلے گئے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو معاشروں کا خاصہ ہے۔ حرام بہت ہے، حلال تھوڑا ہے۔ یقین بہت کم ہے اور بے اعتباریاں بلاشبہ سارے زمانے پر مسلط ہیں۔ قابلِ غور بات ہے کہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں بڑے بڑے دانشور، جو فلسفہ اور علم الکلام پر غور کر رہے ہیں۔ کاسمیات پر تفکر اور بیالوجی اور حیاتیات پر تحقیق میں مصروف ہیں۔ جو ایٹم کا جگر چیر رہے ہیں، ان کو خدا کا کوئی ہوش نہیں۔ وہ اس کے طلب گار ہی نہیں ہیں۔ آخر کیوں؟

خدا کو مسترد کرنا بڑا آسان ہے، کیونکہ آپ کو خدا کی طلب نہیں ہے۔ جب کسی کی طلب ہی نہ ہو، تو اس کے لیے اس کو مسترد کرنا کیا مسئلہ ہے۔ آپ ان تمام فلاسفروں، سائنسدانوں اور دانشوروں کو، جو یورپ کی پوری اکیڈیمک لائف میں گذرے ہیں، ایک سائنسدان یا فلاسفر ایسا بتا دیں، جس کی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ میں نے چودہ پندرہ برس خدا کو تلاش کیا، میں اسے مسترد کر رہا ہوں، کیونکہ میں نے اس کو کہیں نہیں پایا۔ صرف ایک بندہ بتا دیں، جس نے اتنا تردد کیا ہو۔ جس نے تلاش ہی نہیں کی، اس کے دعوے کیا معنی رکھتے ہیں۔ ایسے کسی فرد کے دعوے کو تو ہم نہیں مان سکتے، وہ چاہے رسل ہی کیوں نہ ہو۔

میرے نزدیک رسل ایک ایسا احمق ہے، جو ہر چیز پڑھ کے یقین کرتا ہے، مگر سب سے پڑھی لکھی چیز پر احمقانہ رائے دیتا ہے۔ ہم ان لوگوں کو کیسے دانشور مانیں؟ اپنے اس قسم کے رویے

اور طرزِ عمل کے ساتھ ان کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ البتہ جس چیز کے پیچھے انہوں نے محنت کی، خدا نے انہیں اس کا صلہ دے دیا۔ Principia Mathematica لکھ لیا۔ رائس نے ڈبل ہیلیکس دریافت کر لی۔ فلیمنگ نے پنسلین ایجاد کر لی۔ یہ سب درست ہے۔ جو چیز انہوں نے تلاش کی، وہ ان کو مل گئی۔ انہوں نے خدا کو کب تلاش کیا کہ ان کے فیصلے ہم ان کے مانتے پھریں۔ ضروری نہیں کہ انہوں نے اسے ماننے کے لیے تلاش کرنا ہوتا، لیکن صرف ایک سٹیٹ منٹ دکھا دیں کہ ان میں سے کسی نے 22 برس اللہ کو تلاش کیا ہو اور 22 برس بعد کہا ہو کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایسا کوئی واحد فلاسفر دنیا میں نہیں ملتا۔ ان کی بات کو کیسے قابل اعتبار سمجھیں۔

مجھے امریکہ کے ایک بہت بڑے استاد نے کہا کہ میں نے اللہ کو ڈھونڈا ہے۔ مجھے اللہ نہیں ملا۔ تمہیں اللہ کیسے مل گیا۔ میں نے اسے کہا، تم نے اسے کیسے ڈھونڈا ہے۔ اللہ حسابی تحقیق کی کوئی ضمنی پیداوار نہیں ہے۔ اسے لازماً انٹلکچوئل تجسس میں ترجیح اول ہونا چاہیے۔ اللہ اپنی جگہ پر ملتا ہے۔ وہ مخلوق سے کم تر سٹیٹس میں نہیں ملتا۔ یہ اس کی توہین ہے۔

تعلیم سے آراستہ کون؟

بالعموم ہر معاشرے میں اس کی ضروریات، خیالات، اس کے عزائم اور مزاج کے مطابق اس کا نصاب تعلیم متعین ہوتا ہے یا اس کے تھیسز خصوصی کمٹمنٹ کے تحت اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں، مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس انتہائی اہم شعبے کا کوئی آئیڈیل متعین نہیں ہے۔ تعلیم کے بارے میں ایک بات تو یقینی ہے کہ ہمیں تعلیم کو واضح شعبوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ تعلیم ہے، جسے ہم سائنسی تعلیم کہتے ہیں۔ وہ سائنسی رجحانات ہیں، جو زمانے میں پنپ رہے ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ تعلیم ہر بندے کا حق ضرور ہے، مگر اس حق کو استعمال کرنے کے کچھ تحفظات ہونے چاہئیں۔ اگر جملہ تمام لوگوں کو تعلیم کے ادوار میں داخل کر دیا جائے، تو وہ ایک ہجوم سا بن جاتا ہے، جس میں کسی انفرادی ذہانت کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم تعلیم کی درجہ بندی کریں۔ ذہانت کی شناخت اور تشخص کے لیے کچھ ایسا طریقہ کار متعین کریں، جس سے کوئی انفرادی ٹیلنٹ آغاز ہی سے اپنی راہ پر پڑ جائے اور وہ آگے بڑھتا ہوا اس ملک کا نامور سائنسدان بنے۔

ہمارے ہاں تعلیم بعض طبقوں کے لیے مخصوص ہو گئی ہے۔ مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے لوگ اپنے بچوں کے لیے تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے بچوں کو جلد کام اور محنت پر لگا دیتے ہیں۔ بیرونی دنیا میں چائلڈ لیبر کو سخت ناپسند کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ملک کے والدین مجبور ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو چاہے وہ چھوٹے یا بڑے ہوں، کام پر لگا دیں۔

پھر ہمارے ہاں مذہبی تعلیم کا ایک شعور ضرور موجود ہے، بچے کچھ اور پڑھیں نہ پڑھیں، شروع میں قرآن ضرور پڑھ جائیں۔ مساجد میں یہ کام بڑی تندہی سے ہوتا ہے مگر وہاں بچوں کو قرآن حفظ کرانے کا خبط ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بچے میں کیا صلاحیت ہے، نہ وہ ان میں رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے حفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں، جنہوں نے قرآن یاد کیا اور بھلا دیا۔ یہ معاشرے کے لیے بدقسمتی کی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے تمام نصاب تعلیم نہ متوازن ہیں اور نہ جدید۔ ہم لوگ لگے بندھے دھروں کے ساتھ نصاب اٹھا کے بچوں کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ جب میں چھوٹے بچے کا بستہ اور اس کا بوجھ دیکھتا ہوں، تو یہ مجھے جلدی تھکنے والے بچے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر والدین شکایت کرتے ہیں کہ شروع میں بچے بڑے ذہین، شاندار اور اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر جوں جوں وہ آگے بڑھے، انہوں نے تقصیر کے میلان کو ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ کلاسوں سے فرار اور والدین کا حکم ماننے سے اجتناب ہے اور وہ ان کے احکام ماننے کی منشا کے خلاف بہت زیادہ ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

تیسرے نمبر پر مجھے مغربی طرز تعلیم سے مکمل طور پر اختلاف ہے۔ مغربی طرز تعلیم سے میں نے آج تک کوئی بڑی شخصیت اٹھتی نہیں دیکھی، جو ملک کے مفاد کی خاطر کام کر سکتی ہو۔ اس میں جتنا بھی سیکولر ماحول ہے، اس سے آزادروی اور غیر وابستگی کا طرز عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں پیدا ہوتے ہی بچوں کے سرہانے امریکی جھنڈا رکھتے ہیں۔ تمام عرصہ ان کو امریکن ازم کا ابلاغ دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ بڑے ہوتے ہیں، تو وہ اپنے ملک پر فخر کرتے اور اس کے محافظ بن جاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے سکولوں میں اپنے ملکی تشخص کی تعلیم کو باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی تعلیم سے اختلاف کو اپنے دانشورانہ معیار کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ احمقانہ طرز عمل ہماری پوری سوسائٹی کے لیے تخریب کاری کے مترادف ہے۔ یہ تخریب کاری کسی کو نظر ہی نہیں آ رہی۔ اس سے ہم نہ صرف مذہب کو کھو رہے ہیں بلکہ ہم ہر قسم کی اس کمٹمنٹ سے بھی محروم ہو رہے ہیں، جو مسلمان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا زہر قاتل ہے، جو تعلیم کے ذریعے ہمارے بچے بچے کے دماغ میں جا رہا ہے۔

مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ ماں باپ کو اگر آپ نالائق ترین بچہ بھی دے دیں، مگر وہ انگریزی بول سکتا ہو، تو وہ سمجھتے ہیں کہ مقصد تعلیم پورا ہو گیا۔ یہ وہ شدید ترین احساس کمتری ہے جس کے زیر اثر یہ لوگ انگلش سکولوں کو کم نہیں کر رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔ ان کے کورسز مشکل ہیں۔ بعض اوقات پروفیشنل سکول بڑی اچھی تعلیم بھی دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں، مگر تعلیم کے مقاصد میں جو بنیادی مقصد خیال ہونا چاہیے، کہ تعلیم اپنے ملک، معاشرے یا کائناتی مقصد کے کسی کام آئے، وہ یہ لوگ نہیں کر رہے۔ بلکہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ہر تعلیم یافتہ لڑکا امریکہ اور یورپ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظام تعلیم کے ذریعے گویا ہم پاکستانی نہیں، بلکہ امریکی، برطانوی اور یورپی شہری تیار کر رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ان تعلیمی اداروں نے ایک ٹھیکے کے تحت مغربی ممالک کے وفادار طالب علم تیار کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی تعلیم اس سے بھی زیادہ ناقص ہے۔ مذہبی تعلیم کے نام پر جو پیٹرن دیا جاتا ہے، اس میں احساس کمتری ہے۔ ایک طرف مغربی تعلیم حاصل کرنے والا بچہ شاندار ماحول میں اور اچھے میز پر بیٹھتا ہے۔ ایک نفیس ٹائپ کی استانی یا سمارٹ استاد سے سبق پڑھتا ہے اس کے برعکس ایک دوسرا بچہ مٹی پر بیٹھا جوتی اور مار کے خوف سے حفظ کر رہا ہے یا پڑھ رہا ہے اور چوروں کی طرح سوچ رہا ہے کہ کس طرح اس تعلیم کو چھوڑ کر یہاں سے فرار کی راہ اختیار کرے۔ وہ مذہبی تعلیم کا کوئی معیار قائم کرنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔

از غلام لذت قرآں مجو
گرچہ باشی حفظ قرآں مجو

ان بچوں کا اس مقصد کے لیے استحصال کیا جاتا ہے کہ وہاں آپ کو اچھی روٹی ملے گی۔ ان کے ذہن میں آتا ہے کہ مذہب شاید ہے ہی بھیک مانگنے کے لیے۔ اس سے ان میں ایک آزاد اور مضبوط مسلمان کی شخصیت پیدا نہیں ہوتی۔ میں قنوطی نہیں ہوں کہ پاکستان میں ہر قسم کی تعلیم سے اختلاف کر رہا ہوں۔ لیکن زیر نظر تعلیم میں درجہ بندی تو ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ کمتر سے بہتر تعلیم کے درجات مقرر کریں۔ جب تعلیم کی ماہیت جگہ جگہ تبدیل ہو جائے گی، تو اس تعلیم سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ ہمارے حکمران یا سیاستدان تعلیم ہی کی بات کریں گے، لیکن اپنے بچے چاہیں گے کہ وہ امریکہ کے شہری بنیں، انہیں مغربی تعلیم حاصل ہو، یہی حال فوجیوں اور سویلین

بیوروکریسی کا ہے۔

سو ایک ایسی بے حسی ہمارے نظام تعلیم اور محکماتی تعلیم پر طاری ہے کہ آئے روز یہی جھگڑا پڑا رہتا ہے کہ آج اسلام کتاب میں سے نکل گیا، آج اسلام آ گیا۔ کچھ مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہر وقت یہ اور وہ کی سازش کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس قسم کی حرکتوں کے حوالے سے پیشہ ور قسم کے لوگ ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ یہ صرف ایک اکیلے بڑے ذہن اور دماغ کا کام ہے۔ پورے نظام تعلیم پر نظر ثانی ہونی چاہیے اور ہمیں ایک مقصد، ایک امیج اور ایک تخلیقی مقصد کے تحت پورا نظام تعلیم چلانا چاہیے۔ اس میں کوئی بنیادی فرق یہی ہو سکتا ہے کہ سائنسی تعلیم کے لیے ذہین بچوں کو موقع دینا چاہیے۔ انہیں آگے بڑھانا چاہیے مگر مناسب کمٹمنٹ کے بغیر نہیں۔ کمٹمنٹ کا حصہ دونوں تعلیمات میں برابر ہونا چاہیے۔ اگر آپ خواندہ لوگ چاہتے ہیں، تو میٹرک یا ایف اے کے بعد آپ بچوں کو ٹریڈ ایجوکیشن کی سہولت فراہم کریں۔ اس کے بعد یہ جائز نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو لاکھوں اور کروڑوں لوگوں سے بھر دیں بلکہ آپ ان کو پڑھنے لکھنے کے ساتھ کام کے قابل کیجیے۔ ملک میں پروفیشنلز کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ملک کو کتنے انجینئرز اور کتنے ٹیکنیشنز اگلے برسوں کے لیے چاہئیں۔ انتہائی نالائق لوگ ڈیٹا مرتب کرتے ہیں۔ پبلک کے سامنے جھوٹ بولنے کے ذمہ دار ہیں اور صبح و شام بڑی ترتیب سے جھوٹ بولتے ہیں۔ سیکولر ایجوکیشن کا ایک بڑا نقص یہ نکلا ہے کہ ہر حکمران نے اپنے لیے طے کر رکھا ہوتا ہے کہ میں نے غیروں کے سامنے سچ بولنا ہے، جبکہ اپنوں کے ساتھ جھوٹ بولنا ہے یہ اسی تعلیم کا اثر ہے۔

میں اپنی بھی تعلیم پر غور کرتا ہوں۔ ہم ٹاٹ سکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی برائی لگتی نہیں تھی۔ مگر اس وقت ایسے کوئی تقابل بھی موجود نہیں تھے۔ ایک ہی طرح کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی دہائیوں میں جس طرح ہم نے تعلیم حاصل کی، اسے میں برا نہیں کہوں گا۔ اس وقت دستیاب ذرائع وہی تھے۔ اب لوگ ہر بچے کو انجینئر اور ڈاکٹر تو بنانا چاہتے ہیں، میں نے یہ نہیں دیکھا کہ کوئی والدین اپنے بچے کو اچھا مسلمان بھی بنانا چاہتے ہوں۔ حالانکہ اچھا مسلمان بننے میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کے دونوں پیشے شامل ہو جاتے ہیں مگر وہ بنیادی ترجیحات نہیں ہیں۔ استاد اتنا بے وقار ہے کہ وہ پڑھانے کی بجائے اپنی بے وقاریت کا

انتقام بچوں سے لیتا ہے۔ اس کی اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی مقام اور احترام نہیں ہے۔ وہ ایسا مجبور ہے کہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں ذلیل اور رسوا ہوتا ہے۔ اس پیشے کا بالائی لوگوں، سروسز اور حکومتوں میں اتنا عدم احترام ہے کہ ایک ٹیچر کو وہ عزت حاصل نہیں ہے جو اسے حاصل ہونی چاہیے اور میرا نہیں خیال کہ جو قوم اپنے استادوں اور اپنے بچوں کو وقار اور عزت نہیں دے سکتی، اس قوم کا کوئی مستقبل ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے۔ پھر بھی ہمارے لوگ وطن پرست اور خدا پرست نکل آتے ہیں، تو یہ محض اللہ کا کام اور نوازش ہے۔ اس میں اس سلسلہ تعلیم کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔

تعلیمی پالیسی کیسی ہو؟

ہم سب لوگ اس قدر رنگی واقع ہوئے ہیں کہ شاید میری تنہا رائے اتنی اہم خیال نہ کی جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ اپنے اندازِ فکر، خیال اور منصب کو سمجھیں اور اپنے مسائل کو دیکھیں۔ اس وقت مجموعی طور پر ملک میں اپنے مسائل کو سمجھنے کا ایک مکمل بحران ہے۔ ہمیں ہر اشارہ کسی صاحبِ اقتدار سے ملتا ہے۔ ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں اور اسی کو بہترین پالیسی کہتے ہیں۔ بہت سی تعلیمی پالیسیاں اس ملک کے مزاج اور اس سرزمین سے مطابقت ہی نہیں رکھتیں مگر جو صاحبِ اقتدار ہے وہ اپنے ہی تصورات کا شکار ہے اور وہ چاہ رہا ہے کہ آپ اس کی پیروی کریں۔ نہ صرف اس کی پیروی کریں، بلکہ اس کی تعریف و توصیف میں تمام ذرائع ابلاغ کو مات بھی کر دیں۔ اس قسم کے طریقہ کار سے ہمارے ہاں تبدیلیاں نہیں آئیں گی۔ یہ کسی فردِ واحد کا کام نہیں، نہ یہ سیمینارز کا کام ہے۔ بلکہ وہ ماہرینِ تعلیم جن کے پیچھے تجربہ ہے، ان نوجوان ماہرینِ تعلیم کے ساتھ مل کر جو دورِ حاضر کے تقاضے سمجھتے ہیں اور جن کے رجحانات ملک اور دین کی طرف مستحکم ہیں، مشترکہ تعلیمی پلان تیار کریں۔

اگر مجھے کہا گیا، تو میں اس میں غیر معاون رویہ اختیار نہیں کروں گا، نہ اپنے لیے اختیارات استعمال کروں گا۔ ہم لوگ بالعموم صورتحال کو ملکی، اخلاقی اور نظریاتی نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ اختیارات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کا بھی ہے جو نظریات کا بہت پرچار کرتے ہیں اور جن کے مضامین اور تنقید سے اخبارات بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمیں تنقید کا پہلو

کچھ گھٹانا ہوگا اور تعمیری و نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ یہ کام ماہر اساتذہ اور ماہرین تعلیم ہی کر سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ احتیاط ضرور ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ ہم ایک نیا نظام تعلیم اور نصاب مرتب کریں جس کے تمام پہلو ہماری نظر میں ہوں۔

مثلاً میرے خیال میں قرآن پڑھانے کا موجودہ طریقہ کوئی طریقہ تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ پانچویں یا آٹھویں جماعت تک قرآن ناظرہ ہر قیمت پر پڑھایا جانا چاہیے۔ اس کے بعد دسویں تعلیم تک اس کا ترجمہ ہر کلاس کے لیے ختم کرنا لازم ہو۔ اس کے بعد بھی قرآن کو ایک ایسا لازمی اسلامیات کا مضمون ہونا چاہیے، جو آگے جاکے قرآن، حدیث، اسوۂ حسنہ اور دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کا احاطہ کرے۔ اس سے مجموعی طور پر ایک مذہبی کلچر پیدا ہوگا۔ اس وقت کلچرل مذہب مساجد میں پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ مساجد میں چند طالب علم ہیں، جن کی اوسط ان طالب علموں کے مقابلے میں بہت کم ہے، جو عمومی سکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔

سب سے بڑا ہمارا مسئلہ مذہب کے بارے میں یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں جو تجسس پایا جاتا ہے اور سوالات ہیں، ان کے جوابات نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے لوگ اور اساتذہ تیار کرنا ہیں، جو ہر سطح پر ان کے تجسس کا مداوا کرسکیں۔ اس وقت زیادہ تر تجسس جدید علوم اور جدید تصورات میں سے ابھر رہا ہے اور سائنسی ایجادات میں سے برآمد ہورہا ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب کو جامع اور حتمی تصور کرتے ہیں، تو یقیناً اس مذہب میں تمام وضاحت طلب جواب اور باتیں موجود ہیں۔ جدلیات کی اللہ خود تائید کرتا ہے **وجادلهم بالتي هي احسن** اور ان کے ساتھ ایک اچھی بحث کرو۔ مگر ایک اچھی بحث کرنے والے اساتذہ کو بھی اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ موجودہ اور جدید آلات تعلیم سے واقف ہوں اور ماضی بھی ان کے پاس ایک خوبصورت اور معتبر روایت کی طرح زندہ ہو۔ تب جاکے مذہبی تعلیم کے رخ استوار اور درست ہوں گے۔

اس کے ساتھ ہمارے جتنے بھی کورسز ہیں، ان میں کچھ عملی پہلو ہونے چاہئیں۔ مثال کے طور پر کالج اور سکولوں کی سطح پر ہم سائنسی تعلیم محض زبانی تعلیم کی صورت میں پاس کررہے ہیں یا ان کو سادہ سی مساوات سکھا رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی عملی تجربہ گاہیں ہر جگہ ہونی چاہئیں، جہاں لڑکے تھوڑے سے جوش و جذبے کے ساتھ اپنے تجربات کوئی صورت دے سکیں۔ ہم یورپ کی مثالیں تو دے دیتے ہیں، مگر یورپ میں تقریباً ہر گھر میں ایک ورکشاپ ہے جبکہ ہمارے بہترین

سکولوں میں بھی ورکشاپس نہیں ہوتیں۔ ہمیں ہر قسم کی ورکشاپیں تیار کرنی چاہئیں۔ پریکٹیکل ورکشاپس، سیمینارز وغیرہ۔

ہمیں طلباء کے اندر عملی رجحانات کو پروان چڑھانا چاہیے تاکہ وہ شروع سے ہی اپنے تعلیمی نصاب کو عملی نصاب کی حیثیت سے بھی دیکھیں۔ اس سے بچے کی بے ہمتی، توجہ کی کاہلی اور شرق و مغرب کے درمیان موجود خلا کم ہوں گے۔ لوگ ذہنی، فکری اور عملی طور پر پروگراموں میں شرکت کریں گے اور سکول اور کالج محض گپیں ہانکنے کے ادارے نہیں رہیں گے۔ بدقسمتی سے موجودہ وقت ہمارے پوسٹ گریجویٹ لیول پر بھی مذہبی اور سماجی میدانوں میں بڑے بچگانہ اور ساہ لوحی پر مبنی سوالات ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے، جس کو پر کرنے کے لیے ایک ملک گیر سطح کی مشاورت ہو۔ اس میں دوسرے ممالک کی مشاورت بھی شامل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے لیے پاکستانی اور مسلمانی نصاب تیار کرنا چاہیے اور یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں۔

دینی تعلیم، نہج اور سطح

پوسٹ گریجویشن تک اسلام چلنا چاہیے کیونکہ لوگوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اسلامیات نصاب نہیں ہے اور یہ بطور نصاب پوسٹ گریجویشن اور نوکری کے لیے نہیں ہے۔ اسلامیات ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ اسلام ہماری اپروچ، ہماری پوری زندگی پر ایک مکمل ناقدانہ نظر ہے۔ اسلام انتہائی ترقی یافتہ مذہب ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت زمانہ ابھی وہاں تک نہیں پہنچا، جہاں تک اسلام اور اللہ کی نظر ہے۔ وہ تو کائنات ختم کر کے اور قیامت کی خبر دے کے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا ایج کی تبدیلیوں سے بے خبر ہے۔ یہ انہی احمقوں کا خیال ہو سکتا ہے، جو اپنے آپ کو جدید تر سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کا عہد زمانوں کے توسط سے کاٹ لیا گیا ہے۔ کیا انسان اکیسویں صدی میں اتنی ترقی کر گیا ہے کہ خدا کو اس کے امکانات کا علم نہیں تھا یا خدا اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے کہ وہ جدید تر تبدیلیوں کو سمجھ نہ سکے۔ اس قسم کے جاہلانہ خیالات کو اس وقت ہی روکا جا سکتا ہے، جب آپ خدا کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ آپ نے قرآن کو اچھی طرح پڑھا اور نصابِ اسلام سے اچھی طرح واقف ہوں۔

میرے خیال میں پہلی کلاس سے اسلام کی تدریس شروع ہونی چاہیے اور پوسٹ

گریجویٹ لیول تک یہ لازمی نصاب کے طور پر جائے۔ اس نصاب میں رفتہ رفتہ پیش رفت ہو۔ جیسے ناظرہ اور ترجمہ ہے۔ اس کے بعد احادیث اور فقہ کو اس میں شامل کیا جائے۔ زمانے کے جدید مسائل کو گریجویشن کی سطح پر زیر بحث لایا جائے۔ پوسٹ گریجویٹ سطح پر آپ فقہی مسائل کو درآمد کر سکتے ہیں اور ان پر ایک سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں۔

اسلام کو کم تر حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کریں گے، تو ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ زمانے میں خاسر و حائب ہوں گے۔ اس کو ہماری ہر تعلیم کے انجام تک جانا چاہیے۔ تبھی آپ دین کی ایک صحیح تعلیم دے سکیں گے اور دین سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اس طریقہ تعلیم سے جس پر ایک عمومی اور جاہل مولوی کی گرفت ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہمارا ہر بچہ جو کسی سکول میں داخل ہو گا، وہ امامت کے قابل بھی ہو گا۔ آپ کو امام ڈھونڈنے کے لیے مدرسوں میں جانا نہیں پڑے گا۔

اس کے پاس جو بے یار و مددگار مسجد میں بیٹھا ہوا ہے۔ اپنے معاملات میں کھویا ہوا اور اپنے لیے طاقت اور عروج کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اکٹھے چلنے کی صورت میں آپ صحت مند اثرات کی طرح چلیں گے اور نمایاں ہوں گے۔ تب بچوں کو نیچرل اسلام کی تعلیم ملے گی۔ ان کو علیحدہ کریں گے، تو یہ ساری تعلیم عطائیوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔

اس وقت یہی کچھ ہو رہا ہے۔ دیوبند سکول نے مختلف گھروندے بنائے ہوئے ہیں۔ کبھی آپ کو جھنگ نظر آتا ہے، تو کبھی کئی اقسام کے جیش بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان چیزوں کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔ اسلام میں ایک امت اور ایک خیال ہے۔ ایک کمٹمنٹ اور ایک تحریک ہے اور جب ایک محرک سے کوئی تحریک شروع ہوتی ہے، تو اس میں امریکہ نہ انگلینڈ کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی۔ پھر ہم سب کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم نے موقع پر کیا کرنا ہے۔ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ ہم سے ہمارا معاشرہ اور ہمارا سکول ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اسلامی اور دینی تعلیم ابتدا سے لے کر ایم اے تک تواتر کے ساتھ ہر طالب علم کے ساتھ رہنی چاہیے۔

آزادیٔ نصاب و تعلیم

اس کا گلہ قوم کو نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا گلہ ان احمق حکمرانوں کو دے سکتے ہیں، جنہوں

نے اختیار ملک کے لیے نہ عوام کے لیے ڈھونڈا بلکہ ان کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اقتدار اور خیال کے لیے اور اپنے آپ کو مستحکم کرنے کے لیے غیروں کی امداد سے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ کوئی آئیڈیل صورتحال نہیں ہے۔ پانچویں تک اگر حساب لازم ہے اور میٹرک تک انگریزی بھی لازم ہوتی تھی، تو میرے خیال میں ایک مضمون کو لازم کر دینا اتنا دشوار عمل نہیں تھا۔ مشکل صرف اتنی ہے کہ ہماری کسی کی کمٹمنٹ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ نہیں ہے۔ اپنے اپنے مقاصد کے ساتھ ضرور ہے۔ ہر طرف یہ شور برپا ہے کہ معیشت بگڑ گئی ہے۔ معیشت بہتر کی جائے۔ معیشت میں مدد چاہیے۔ اگر کل آئی ایم ایف آپ سے کہے کہ آپ کی ظہر اور عصر کی نمازیں کارآمد نہیں ہیں اور یہ اقتصادی نظام میں خلل ڈالتی ہیں، تو کیا آپ ان کو چھوڑیں گے؟ اور پرسوں آپ کو کہیں کہ حج بے مقصد اور ضیاع وقت ہے اور قربانی نامناسب اور خطرناک ہے تو کیا اس کو بھی آپ ترک کر دیں گے۔

اگر آپ اتنے ہی گر گئے ہیں، تو پھر اسلام کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کھلے طور پر یہ اعلان کر دیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں بلکہ اپنے نام ترک کر دیں اور اپنا تشخص بدل دیں، لیکن یاد رکھیں، اللہ کا دین پھر بھی غالب ہے۔ ان ہزاروں بچہ سقہ کی حکومتوں سے اللہ کا نظام نہیں ٹوٹ سکتا۔ جب میں خدا کی بات کرتا ہوں، تو میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو بزدل محسوس نہیں کرتا۔ میں اپنی زندگی کے تحفظات کے لیے بزدلی برت سکتا ہوں، مگر جہاں خدا اور رسولؐ کا معاملہ ہے میرے ذہن میں جارحیت ہے نہ استعداد ہے۔ نہ میں سمجھتا ہوں کہ زمین و آسمان میں کوئی شخص خدا کی مرضی کے درمیان حائل ہو سکتا ہے۔ یہ جتنے بھی پروگرام اپنے استحکام کے لیے بنا رہے ہیں، اللہ کے ہاتھ میں ایک پل کی ان کی میعاد نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص خدا اور رسولؐ کی خواہش کے خلاف لڑ سکتا ہے۔ خداوند کریم کہتا ہے کہ تم میں جتنے بھی آسیب اور وسوسے ہیں، یہ تارعنکبوت یعنی مکڑی کے جال ہیں۔ لوگ اپنے گرد اور اپنی قوم کے گرد بھی بنتے ہیں۔ پاکستان ان مکڑی کے جالوں میں پھنسا ہوا ہے اور خدا کہتا ہے کہ حق ایک پتھر کی طرح آتا ہے اور وہ سارے جالے توڑتا ہوا نکل جاتا ہے۔

مگر لوگ میری بات کیسے تسلیم کریں گے؟ وہ خدا کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ اس کے مقابلے میں امریکیوں کو زیادہ مانتے ہیں۔ آج کی خبر کے مطابق دنیا کی طاقتور قوم اپنے بارہ

بندے چھڑانے کے لیے خوست سے پیچھے ہٹنے پر آمادہ ہوئی۔ کیا یہ وہی طاقت ہے، جس کے بل بوتے پر وہ ساری دنیا کو ڈرانے نکلے ہیں؟ اس کا مطلب ہے کہ اس قسم کا ایک اور دھماکہ اس پوری قوم کو اتنا نروس کر دے گا کہ یہ اپنے سایوں سے بھی گھبرائے گی۔

کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے اور کوئی بھی شخص خدا سے نہیں لڑ سکتا۔ خدا تو کہتا ہے کہ تم مجھے چیلنج کرنا چاہتے ہو، سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو پھانسیاں لگا لو یا خودکشی کر لو، تمہارے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہے گا۔ میں اس صورتحال سے خوفزدہ نہیں ہوں، نہ ہی میں غیر ملکی آرا کے سیلاب سے مرعوب ہوں۔ غیر ملکی کسی بھی رائے یا کلچر میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ مستحکم ہو۔ کوئی بھی کلچر اس وقت دنیا میں مستحکم کلچر نہیں ہے۔ عارضی فیز کا کلچر ہے، حرکت پذیر کلچر ہے، از خود ہی ان میں بحران پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی وہ اپنے آپ کی نفی کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی دوام کے خلاف کوئی کلچر دو چار دن کا ہیجان تو پیدا کر سکتا ہے مگر اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو پچھلے پندرہ سو برس سے ان ہیجانات کو ایک ایسے بزرگ کی طرح دیکھتا ہے، جس کی گود میں بچے کھیل رہے ہوں اور وہ مختلف شرارتیں کر رہے ہوں۔ یہ اتنا وسیع طاقتور اور بلند حوصلے والا نظریہ ہے کہ پچھلے پندرہ سو برس سے ہر فتنے کو دیکھتا چلا آیا ہے۔ ہمارے مذہب کو ان بوا صفت انفرادی نظریات سے لڑنے کا بہت تجربہ ہے۔ ان کا اور اسلام کا کوئی میچ نہیں ہے۔ میں ایمانداری سے آپ کو کہہ رہا ہوں کہ کوئی نظریہ خدا اور رسول کے نظریے سے طاقتور نہیں۔

البتہ اگر آپ آدھے نظریے سے لڑیں گے، تو آپ کارکردگی نہیں شو کر سکتے۔ اگر آپ اسلام کو صرف عقیدہ کی حد تک پیش کریں گے اور اسلام کا داخلی تشخص، اقدار، مابعدالطبیعیات اور اس کی بالائے نفسیاتی طاقت اس کے ساتھ نہیں ہو گی، جو خدا اور رسولؐ کے توسط سے ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے، تو پھر آپ ایک بیکار کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ جنگ مولوی نہیں، صرف مسلمان لڑ سکتا ہے۔

سکول آف ایکسی لینس

میں ان کے نظام تعلیم پر پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ ان کا نظام دنیوی، ارزل اور غیر مہذبانہ لگتا ہے۔ دو چیزوں کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، جو غلطی سے گڈمڈ ہو کے ہمیں مشکل

میں ڈالتی ہیں۔ ایک تو ہم مولوی کے کلچر کو اسلامی کلچر سمجھتے ہیں۔ یہ حماقت کی بات ہے۔ اسلامی کلچر کی مولوی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ایک طرف وہ مذہب ہے، جس نے دنیا کو اعلیٰ ترین اقدار دیں، جو اس وقت مشرق و مغرب میں موجود ہیں۔ یہ سب ہمارے مذہب سے اثر پذیر ہیں۔ وہ قرطبہ سے مغرب میں آئی ہوں۔ قسطنطنیہ سے اس عظیم تہذیب کی ضمنی پیداوار ہیں، جس کے ذریعے سے یورپ کو کلچر کی پہلی ہوا لگی ہے۔ یہاں آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تحریک اصلاح مسیحیت و احیائے علوم، جو یورپ میں شروع ہوئی، یہ براہ راست قسطنطنیہ کے سقوط کا نتیجہ ہے، جس کے بعد وہاں سے مسلمان حکماء کی کتابیں چلیں۔ خیالات کو وسعت ملی اور یہ آگے بڑھ گئے۔ ہم چونکہ اپنے علماء کے کام کو آگے نہیں بڑھا سکے، ہم زوال پذیر ہو گئے اور وہ ہم سے بازی لے گئے۔

تب ہمارے کلچر کا یہ عالم تھا کہ جب ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ شارلیمین کو گھڑی بھیجی، تو میرا نہیں خیال کہ آج بھی آپ کو اتنی خوبصورت ایجاد کہیں نظر آئے۔ مذکورہ گھڑی میں بارہ گھنٹوں میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ ہر گھنٹے بعد ایک شاہسوار باہر نکلتا اور بگل بجاتا تھا۔ یہ مکینیکل انجینئرنگ کی بڑی کلاسیکی مثال ہے۔ اس وقت بادشاہ کے سب درباری خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے کہ یہ کوئی جادوگری آ گئی ہے۔

وہ مکینیکل انجینئرنگ آگے نہیں بڑھی۔ مسلمان حکماء، سائنسدان اور حکمران فتوحات میں مگن ہو گئے۔ ذاتی اقتدار و اختیارات میں چلے گئے۔ حکومتیں زوال پذیر ہوئیں، اہل یورپ اسی تجسس، جو انہیں مشرقی ایشیا سے نصیب ہوا، اٹھا کے بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن روبہ انحطاط مطالعے میں چلا گیا۔ ان مفسرین اور مقلدین کے ہاتھوں میں چلا گیا، جنہوں نے اسے مقامی خانقاہی انداز میں گروپوں کی صورت میں پڑھانا شروع کیا۔ عالمگیر وسعت چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں بٹ کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ وہ کلچر بھی جاتا رہا۔ مسلمان ذہن کی فراخی جاتی رہی اور اس کے ساتھ اس کا رویہ، قوت اور شان و شوکت بھی ہوا ہو گئی۔

ہمیں پیچھے مڑ کے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیچھے مڑ کے وہ دیکھتا ہے، جس کے ناتے پلٹ نہ سکیں۔ یہ نہیں ہے کہ آج قرآن نہیں ہے کل قرآن بھی تھا۔ قرآن تو ہر زمانے میں اسی عزت و حرمت کا مالک ہے اور وہی کتاب ہے، جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے۔ اب بھی قرآن کو پلٹ جانے سے

ہم اسی نصاب کو پا سکتے ہیں اور اسی رویے اور کلچر کو حاصل کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں اپنے چرچ کو ختم کرنا ہو گا۔ چرچ ہمیشہ ایک ملکیتی اور خبطی رویے کا مالک رہا ہے۔ ہم اس چرچ کو ختم کر کے انہی تعلیمات کو فراخدلانہ اپنے بچے بچے تک اکیڈیمک ذرائع سے پہنچائیں۔ ان کو غور و فکر پر آمادہ کریں۔ اس وقت تو عالم یہ ہے کہ آپ مذہب کے خلاف سوال نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ لوگ نہیں ماننا چاہتے، لوگ جواب چاہتے ہیں۔ جب آپ کے پاس جواب نہیں ہے تو لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ مولوی کے پاس جواب نہیں، وہ سمجھیں گے کہ اسلام کے پاس جواب نہیں، کیونکہ ہم نے بدقسمتی سے اپنی نمائندگی اس نالائق کو دی ہوئی ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ مولوی کا وجود ختم ہو، سب مولویوں کو رکھ لیں ان سے سکولوں میں تعلیم دلوائیں۔ وہ اپنی نوکری دیں۔ بچے ناظرہ تک ان کے ساتھ چلیں۔ دسویں تک بچوں کو پڑھائیں اور ان کے بعد آپ بہتر استادوں کو چنیں۔ ان میں سے جو اچھے استاد آگے بڑھ سکتے ہوں، ان کو آگے بڑھائیں مگر چیزوں کو لازماً منطقی طور پر آگے بڑھنا چاہیے۔ جیسے لیکچرار سے پروفیسر تک بات جاتی ہے۔ چیزوں کو ایسے دانشوروں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، جو اپنی ابتر تقسیم کو خود ختم کر سکیں اور اختلافاتِ طبعی سے نکل کر اور سوال و جواب کے بحران سے آگے مستحکم عقیدے کے ساتھ کمٹ منٹ کرنے والے ہوں یا کر چکے ہوں۔ وہی ان باتوں کا جواب دیں گے۔

اسی لیے قرآن حکیم نے کہا کہ متشابہات کا جب شور پڑ جائے، اور تیرے ذہن میں اندیشے لاحق ہو جائیں تو ہرایرے غیرے کے پاس نہ جانا۔ ان کے پاس جواب نہیں ہوں گے۔ والرسخون فی العلم یقول کل من عند ربنا پھر علم میں راسخ لوگوں کے پاس جانا فی اسئل اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون پھر اگر تم نہیں نہیں جانتے ہو، تو ان اہل ذکر کے پاس جانا، جو علم بھی رکھتے ہیں۔ یہ اہل ذکر کون ہیں؟ یہ وہ نہیں ہیں، جو خالی تسبیح لیے پھرتے ہیں یا خالی خانقاہوں میں محرابوں کے نیچے اپنے آپ کو بند کیے بیٹھے ہیں۔ یہ وہ راسخون ہیں، جنہیں قرآن کہتا ہے والذکر اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض، جو صبح و شام، دوپہر اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔

خدا کے بندے کے پاس دو ڈیٹا ہیں۔ He accomplishes his feelings with the God, and he accomplishes his education with the world.

(وہ اللہ کے ساتھ اپنے احساسات کی تکمیل کرتا ہے اور دنیا کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کرتا ہے) یہ لوگ ہیں۔ جو آگے چل کر پڑھائیں گے۔

میں بھی اس عظمت خیال کا ایک خوشہ چیں اور دریوزہ گر ہوں، جو اللہ اور رسولؐ کی ہے۔ مجھے کسی بھی کلچر، سماجی نظریے یا مغرب سے آنے والے کسی بھی بھاری بھرکم خیال کے مقابلے میں، کسی دلیل کے حوالے سے، کبھی کوئی تہی دامنی کا احساس نہیں ہوا، نہ مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ میں آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ میں کبھی کسی مغربی فلسفے یا نظریے سے مرعوب نہیں ہوا۔ یہ کوئی ارتجاعی بیان نہیں ہے، اس لیے کہ میں پہلے سے اللہ اور اپنے رسول سے متاثر تھا۔ عقلاً، ذہناً اور اخلاق کے اعتبار سے اور تعلیم اور اس کے رویے کے لحاظ سے متاثر ہوا۔ مجھے اس میں سے کوئی اتنا بڑا مفکر نظر نہیں آتا، جو اس تعلیم کے امیج کو ختم کر سکے۔

میں اس کے باوجود ان سے حسد نہیں کرتا۔ آج بھی اگر یورپ کے کسی مفکر نے اچھی بات کی ہے تو میں اسے اپنا اثاثہ علمی سمجھتا ہوں۔ اس میں حسد کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ تو صرف علم کو شیئر کرنے والی بات ہے، ادھر سے آئے یا ادھر سے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خدا کے بارے میں مجھے علم نہیں دیں گے مگر وہ مجھے خدا کی زمین اور کائنات کے بارے میں تو علم دے سکتے ہیں۔ مجھے ان سے دبنے کی ضرورت ہے نہ ذہن میں اتنا کمتر، رسوا اور ذلیل محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ جب بھی آپ کی آنکھ کھلے، آپ پر یورپ کی سیادت کا پردہ اس طرح تنا ہوا ہو کہ آپ اپنے آپ کوئی دلہن کی طرح سمجھنے لگیں۔ جس کا پتہ نہیں، کتنا جابر خاوند پہلی مرتبہ اس کے پاس آ رہا ہوتا ہے۔

میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے لوگوں کی آنکھوں میں یورپ کا نام سنتے اور ان کی درسگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے عجیب سے ستارے چمک اٹھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان درسگاہوں سے نکلا کیا ہے؟ ان درسگاہوں سے نکل کے سارے لوگ سائنسدان تو نہیں ہو گئے۔ کسی اکیلی جگہ پر کوئی ایک اکیلا شخص وہاں بھی تخلیقی کام کر رہا ہے۔ کوئی سویڈن میں ہے تو کوئی ہالینڈ میں بیٹھا ہوا

ہے۔ کوئی انگلینڈ اور کوئی امریکہ میں کام کر رہا ہے۔ بات پھر انہی اکیلے افراد تک جائے گی، جو علم و عرفان کی تلاش میں رات دن ایک کیے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی سیلاب کی بات نہیں ہے کہ پورے سلسلہ تعلیم میں جاری ہو۔ ہمارے کتنے لوگ مغربی تعلیم سے نکلتے ہیں، جنہوں نے آگے بڑھ کر ملک وملت کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دے دیئے ہوں؟ دیکھیں اور سروے کریں کہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں، وہ تو نکلے ہی مغرب کے لیے ہیں۔ ادھر ہی جا کر پروان چڑھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑے فوجیوں کے بچے بھی وہیں کی روٹی کھا رہے ہیں۔ انہوں نے کون سا پاکستان آ کے صبر و آشتی کے ساتھ ملک کی خدمت سرانجام دینی ہے۔ باپ ادھر خدمت انجام دے رہا ہے، ساری اولاد ادھر خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ وہ اپنے ملک کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ یا اپنے لوگوں سے حیلہ سازی کر رہے ہیں۔ یہ بالائی طبقہ ہمیں ڈاج کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی اور اپنے انداز کے سکول کھولے ہیں، جن میں پاکستان نام کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بیکن ہاؤس وغیرہ اپنے ماحول کے لیے ایک پاکستانی جنریشن کو امریکی شہریت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کون واپس پلٹتا ہے کہ میں بڑی خدمت گذاری کا حق ادا کرنے واپس آیا ہوں؟ شفا انٹرنیشنل کے ڈاکٹروں میں اگر کوئی خاصیت واپس آنے کی ہے تو وہ ان میں اپنے گھریلو کلچر اور اس تعلیم کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اپنے بچپن میں، اپنے بزرگوں اور اپنے ماں باپ سے لی۔ ان میں اگر حب وطن اور حب خدا ہے تو یہ ان کی میراث ہے۔ یہ اسے سکولوں سے لے کر نہیں آئے۔ ہاں میں اس میں شک کروں گا، اگر ہمارا آدمی وہاں جائے اور کہے میں اس ساری چلتی پھرتی دنیا کو دیکھنے کے بعد اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں، نہ کوئی اور بیوقوف ہو سکتا ہے کہ ہم روز روشن میں ان ترقیاتی کاموں کو نہ دیکھیں یا اس صفائی کو نہ دیکھیں۔

مگر مجھے ایک بات یہ بتائیں، اگر یورپ صاف ہے اور ہم گندے ہیں، تو کیا یہ مذہب کا قصور ہے؟ مذہب اسلام کہتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے، تو وہ پندرہ سو سال پہلے سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ آپ پورے اسلام کے آدھے حصے سے محروم ہیں۔ صفائی نہیں ہے تو آپ میں نصف ایمان کیوں ہو؟ اور پھر نصف ایمان میں بھی اگر آپ کی آرزو، خواہش اور خیال کا مرکز تمام تر یورپ اور اس کی درسگاہیں بن جائیں، تو اس کا مطلب ہے کہ آپ باقی

ایمان سے بھی محروم ہیں۔ کیا دو ٹوک یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ اللہ کے حکم سے پاکستان خالی خولی ایک بنجر اور ویران زمین ہے؟ اسی لیے تو پہلی کتاب میں نے ''کشت زرباز'' لکھی تھی۔ بظاہر یہ ایک ویرانہ ہے۔ ایک ایسا ویران ملک، جہاں سے کوئی شگوفہ پروردگار نہیں کھل رہا۔ جہاں کوئی دلجوئے آرزو خداوند نہیں ہے۔ اگر زمین اللہ کی ہے۔ الارض للہ، تو پھر اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا کوئی کونپل یا شگوفہ کیوں نہیں کھلا ہوا۔ اگر ایسا ہے، تو آپ اسے ایک ویرانہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح پوری مسلم دنیا ایک ویران وبنجر ایریا ہے۔ اس میں سے کوئی ایسی شخصیت، وجود یا کوئی ایسا طبقہ اور خیال سامنے نہیں آرہا، جس کا مطلوب ومقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔

جو مذہبی لوگ ہیں، ان کو یہ پیغام جانا چاہیے کہ آپ اس معاشرے میں بدترین خلاقیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا تمام کا تمام رخ اسی انداز کا ہے۔ جیسے اندھیروں میں شیاطین ایک دوسرے کے گلوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ آپ اپنے اردگرد ایسی تاریکی پھیلا رہے ہیں، جس میں صرف طبقاتی جنگیں ہیں۔ مذہبی قتل وغارت ہے۔ ایک دوسرے کے لیے نفرت اور منافرت ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی اسلامی بھلائی نہیں پائی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہی کچھ ان کی ملکیت اور وہ اسی کے حامل ہیں۔

ہر آدمی اپنی جگہ سوچتا ہے کہ ہمارے اس تمام رویئے میں اسلام کہاں ہے؟ نماز تو اسلام نہیں ہے۔ یہ تو ایک طریقہ ہے۔ اس طرح عیسائی اپنی طرز عبادت رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی اپنی طرز عبادت ہے۔ طریق عبادت کو کبھی بھی نظریہ نہیں کہیں گے۔ آپ کس حد تک خدا میں ایمان رکھتے ہیں۔ آپ اس سے کس حد تک مسائل کے حل کے لیے رجوع کر رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ زندگی کی اقدار میں کتنا مذہب کو استعمال کر رہے ہیں؟ کس خیال سے زندگی گذار رہے ہیں؟ کس کمٹمنٹ سے آپ اپنے معاشرے کی اقدار کو دیکھ رہے ہیں؟ ایسی کوئی چیز پاکستان میں نہیں ہے۔

جتنا عرصہ میں نے پاکستان میں گذارا ہے، مجھے ابھی تک کوئی مخلص حکمران دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ اپنی عادات ومقاصد کے لحاظ سے تھوڑے بہت مسلمان بھی ہوں مگر کسی شخص کو پاکستان بننے کے بعد اس کمٹمنٹ کا خیال تک نہیں آیا، جس کے لیے یہ ملک وجود میں آیا، ایسی حالت میں اللہ آپ سے کیسے راضی ہو سکتا ہے؟ وہ تو اللہ کی مرضی ہے، راضی ہونا۔ مگر میرے پاس

ایسی کوئی جمع تفریق نہیں، جس سے میں کہوں کہ اللہ ہم سے بہت خوش ہے اور ہماری خرمستیوں کی داد دے رہا ہے۔

اسلامائزیشن آف نالج

نالج کی اسلامائزیشن نہیں ہوتی۔ یہ کانسیپٹ کوئی اتنا وقعت والا نہیں ہے۔ علم آپ کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح خدا کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے علوم مسلمان نہیں ہوا کرتے۔ انتھروپالوجی مسلمان نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے کسی زمین کی تحقیق کی ہے، تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحقیق مغربی ہے، اب اسلامی تحقیق یہ ہوگی۔ تحقیق تو وہی رہے گی۔ ہاں اس کے نقطۂ نظر سے فرق پڑ جائے گا۔ جیسے ایک شخص نے دنیا کے نقطۂ نظر سے تحقیق کی ہے۔ مگر ہم اگر اللہ اور اس کی کتاب کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ احوال ملتے ہیں۔ جہاں خلا ہیں اور کہاں سائنسز رکتی ہیں، ہمارے پاس اس خلا کو پر کرنے کے لیے قرآن موجود ہے۔ انسان کی حیاتیاتی تخلیقی تاریخ اور تاریخ حیات میں بہت ساری گم کڑیاں فوسلز کی سٹیج پر ہیں کہ کب سے انسان نے سوچنا شروع کیا؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔

جب آپ مذہبی ہیں، تو آپ کو یہ مسئلہ نہیں درپیش ہوتا۔ آپ کو پتہ ہے کہ ایک بہت بڑی بالائی قوت ہے، جس نے یہ تخلیقات سرانجام دی ہیں۔ اس نے اپنے اوقات کے تحت انسان کی نشوونما کی۔ اسے آگے بڑھایا۔ سب کچھ اللہ کی کتاب میں درج ہے اس طرح مستقبل کی معلومات اور واقعات سے متعلق سب کچھ قرآن و حدیث میں درج ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں قیامت کا بتایا گیا ہے اور طریقہ کار قیامت کا بھی پتہ ہے۔ خدا کہتا ہے **اذا الشمس کورت و اذ النجوم انکدرت** ہمارا نظام شمسی اندھا ہو جائے گا۔ سورج بجھ جائے گا۔ ستارے ماند پڑ جائیں گے اور چاند اور سورج پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم نے یہ تمام دریافت کرنا ہے کہ یہ کب واقع ہوگا۔ مگر اللہ نے اس سب کی صورت بتا دی ہے۔

اسی طرح انسان کہاں تک آگے بڑھے گا؟ اس کا انجام کیا ہے؟ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دوزخ اور جنت خالی سزا اور جزا نہیں ہے۔ یہ انسانی منفی اور مثبت حرکات کے مختلف پہلو بھی ہیں۔ ایک کو شہر آسیب ملتا ہے اور دوسرے کو شہر بہشت ملتا ہے۔ کچھ لوگ پاس ہو کر ادھر نکل جاتے

ہیں اور کچھ ادھر آ جاتے ہیں۔ خدا کے ہاں یہ دنیا بہت چھوٹا اور معمولی سا کیمپ ہے۔ مگر اس کے انجام اتنے بڑے اور کائنات کی وسعتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی ایک مثال رسول اللہؐ نے دی ہے اور کیا مثال وہ ہے جو ایک سائنسدان نے دی ہے۔ ذرا دونوں پر غور کریں، تو آپ کو پتہ چلے گا کہ مثال دونوں ایک ایسی ہیں مگر ایک مثال پندرہ سو برس پہلے دی گئی اور ایک آج کے زمانے میں دی گئی۔

سائنسدان کہتا ہے کہ اگر ساری دنیا کے ریگستان اکٹھے کر لیے جائیں، تو ہماری دنیا ریگذاروں کے ذرات اور کائنات اور ستاروں کی تعداد میں ریت کا ایک ذرہ بنے گی۔ بلکہ شاید اس سے بھی کمتر۔ جبکہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اس جہان میں اس دنیا کی یہ حیثیت ہے کہ ایک بہت بڑا جنگل ہو اور اس جنگل میں ایک حلقہ پڑا ہو۔ اگر آپ دونوں مثالوں کی ڈرائی عظمت کو دیکھیں تو دونوں جس مقصد کو سمجھاتی ہیں وہ بڑی وضاحت سے سمجھ میں آتا ہے۔ اگر تازہ ترین سائنسی سٹیٹ منٹ نہ بھی ہوتی تو ایمیزون کے جنگلوں میں پڑا ہوا حلقہ پھر بھی اتنا ہی فاصلوں کی وسعت کے پہلو کو اجاگر کر رہا ہوتا۔

یہ مشکل اور دشوار کام نہیں ہے۔ ہم نے خود سے ڈیٹا جمع کرنا ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے کہ خدا تخلیق کار اور خالق ہے۔ خلاقِ عالم ہے اور اس نے طریقہ کار کے تحت چیزوں کو تخلیق کیا ہے۔ آج کا بہترین ترقی یافتہ انسان خلاق نہیں ہے۔ وہ محض اس طریق کار کو دریافت کر رہا ہے، جو اللہ نے بنیادی طور پر بنایا ہے۔ انسان کو اشیاء کی نیچر کا علم نہیں ہے۔ وہ صرف ان کے طریق کار کو جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کلوننگ آ گئی ہے تو کلوننگ میں انسان نے کوئی جین تخلیق نہیں کر دیا، بلکہ وہ اس جین کے عمل اور ردِعمل کے پیٹرن کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ریلیشن شپ تبدیل ہو رہی ہے اور یہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اللہ کی قدرت، اس کی تخلیق اور اشیاء کی فطرت اور ان میں ریلیشن شپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ خلا بڑا خلا نہیں۔ یہ گیپ اس لیے بڑا نہیں ہے کہ اگر بہترین ٹیکنالوجی کی مشین یورپ ایجاد کر لے اور آپ کوئی ایک عام سا بندہ وہاں بھیج دیں، تو وہ تین سے چھ ماہ میں وہ ٹیکنالوجی سیکھ کے واپس آ جائے گا۔ کارکردگی کا صدیوں کا گیپ ایجادات میں ہوتا

ہے یا ایسی دریافتوں میں، جو پچھلے پورے کے پورے سیٹ اپ کو ایک دھماکے سے تبدیل کر دیتی ہے۔ ٹیکنالوجی میں کبھی زیادہ بڑا خلا نہیں ہوتا۔ مشین کا بنانا مشکل ہو سکتا ہے، اس کو سیکھنا اور چلانا مشکل نہیں ہو سکتا۔

ملکوں کے اندازے کے بالکل برعکس کہ پاکستان ایٹمی طاقت نہیں بن سکتا، ڈاکٹر قدیر خان ہالینڈ سے طریق کار سیکھ کے آئے اور انہوں نے ایٹمی پروگرام تعمیر کر کے آپ کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ ایک دماغ ہے، جس کے پاس مہارت اور انسٹرومنٹ دستیاب ہیں، جس سے وہ کسی دوسرے کی کارکردگی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ہمارے پاس یورپین کے مقابلے میں الحمدللہ بہترین دماغ موجود ہیں۔ وہاں وہ دماغ لگے بندھے ایک ہی نسلی تناسب سے نکلتے چلے آ رہے ہیں جبکہ یہاں دنیا کی بہترین نسلیں ملی جلی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ چوٹی کی دماغی ذہانت پاکستان میں ہے۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ ہمیں کسی قسم کی جھجک یا شرم کا احساس ہو۔ ہمیں اپنے مقصد سے غرض ہونی چاہیے۔ ہم نے ان سے سیکھنا ہے، ان سے سیکھ کے آ جائیں۔ ان کو خدا سمجھنا شروع نہ کر دیں۔

تعلیم میں زبان کا کردار

جب زبانیں تشکیل پا رہی ہوتی ہیں، تو ان میں کوئی ملک زیادہ اور کوئی کم ترقی کر گیا ہوتا ہے۔ جو عنصر زبان میں متعارف ہوگا، اس کے زیادہ تر الفاظ عوام کی زبان پر ہوتے ہیں اور لوگ انہی کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً پیپا سونک اور سونی جیسے الفاظ سے ہم ان کی ایجادات کی وجہ سے آشنا ہیں۔ اب اگر پیپا سونک کو آپ اردو میں ڈھالنا چاہیں، تو مشکل ہو جائے گی۔ اسی طرح جب انگریزی زبان ترقی پذیر تھی، تو اس کی محض یہ خوبی نہیں تھی کہ یہ انگریزی کی زبان ہے بلکہ یہ ایک ایسی بھوکی ننگی زبان تھی، جس نے ہر قوم کی زبان سے اپنا حصہ لے لیا۔ دوسری طرف جہاز رانی کی جتنی اصلاحات ہیں، وہ ولندیزی ہیں۔ جہاز رانی اس وقت زیادہ تر سویڈن اور نیدرلینڈ کے پاس تھی۔ اس کی جتنی اصطلاحات انگریزی میں آئی ہیں، وہ ولندیزی سے آئی ہیں۔

انگریزوں میں ایڈمرل کا لفظ عربی سے لیا گیا ہے۔ یہ اس وقت عربی کا لفظ تھا۔ امیر البحر بگڑتا بگڑتا ایڈمرل ہو گیا۔ اسی طرح اردو زبان اتنی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ عربی، فارسی

اور برصغیر کی دیگر علاقائی زبانیں اس کا ماخذ ہیں۔ انگریز جب برصغیر میں آئے، تو اردو نے بہت سارے انگریزی الفاظ اپنے اندر سمیٹ لیے، وہ اس کا حصہ بن گئے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے جو مزدور پیشہ لوگ انگلینڈ گئے، ان کے بچے جب ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے تھے، تو ان کی ان پڑھ ماؤں کے دل شاد ہو جاتے تھے اور وہ سمجھتی تھیں کہ بچہ واقعی پڑھ گیا ہے۔

انگریزی زبان امتیاز کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جس کو انگریزی بولنا آتی ہے، وہ مقاصد حیات مکمل کر بیٹھا ہے۔ اگر آپ راہ گذر میں کسی سپاہی سے شائستہ اردو میں بات کریں، تو وہ آپ کو لفٹ ہی نہیں کراتا۔ مگر جب انگریزی میں جملہ بولا جائے، تو اس میں سو سال کا غلامی کا اثر عود کر آتا ہے۔ وہ آپ کو تھینک یو بھی کہے گا اور سیلوٹ بھی مارے گا۔ ہم غلامی کی وجہ سے یہ اثرات آ گئے ہیں۔ خاص طور پر ہمارا اپر کلاس طبقہ، جسے ہم شائستگی کی مثال سمجھتے ہیں، وہ انتہائی نچلے درجے کی کمٹمنٹ سے وابستہ ہے میں نے ابھی تک بالائی اور اعلی طبقہ میں اس قسم کا کوئی ذہن نہیں دیکھا، جوان چھوٹے چھوٹے کمپلیکسز سے آزاد ہو۔ میرے پاس کچھ مہمان آئے۔ وہ اردو نہیں، پنجابی سمجھتے تھے۔ ادھر پنجابی گھروں سے اٹھ کر انگلینڈ گئے تھے۔ پنجابی گھروں میں بولی جاتی ہے اور باہر ان کی کارکردگی انگریزی تھی۔ مگر بیچ میں جو رابطے کی زبان ہے، وہ اسے نہیں سمجھتے۔

یہ پوری قوم کا کمپلیکس ہے۔ بعض اوقات مجھے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہمیں آپ کی اردو سمجھ میں نہیں آتی، آپ انگریزی میں بات کریں۔ جب انگریزی میں بات کرتا، تو کہتے، ہمیں یہ بھی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کسی اور زبان میں بات کریں۔ تو زیادہ تر ہمارے ہاں چلنے والی انگریزی کوئی اچھی انگریزی نہیں ہے۔ کام چلاؤ انگریزی ہے۔ اس میں کسی خیال کا اظہار نہیں ہوتا۔ چنانچہ انگلش سکولوں کے پروان چڑھنے والے بچوں میں تصورات کی پشت پناہی نہیں ہوتی۔ کوئی اخلاقی پروان نہیں چڑھتی۔ ان کی زبان امریکی زبان کی طرح ہے کہ آدھی زبان اور آدھا اشارہ چل رہا ہے۔ باقی جملہ وہ ہاتھ پیر ہلا کے اور بدن گھما کے پورا کرتے ہیں مگر جب کسی آرٹیکل وغیرہ کی انگریزی لکھنی پڑ جائے، تو لگتا ہے، جیسے ان کو موت پڑ گئی ہو۔ اس میں اپنے خیالات کو مجتمع کرنا اور انہیں ادا کرنا، ان کے بس کی بات نہیں۔ جب ذہن ہی نہیں پختہ ہوں گے، تو زبان کیا مدد دے گی۔

البتہ آج کل کے مغربی سکولوں کے بچوں کی انگریزی گرامر ہم سے بہتر ہے۔ وہ ایک رواں گرامر ہے مگر جب خیال اوپر جائے گا، تو بیا کام ہو جائیں گے۔ ان کو خیال کی کوئی تربیت حاصل نہیں۔ ہمارے Logical Constructs ان سے بہتر ہیں۔ ہم خیال کو کچھ اپنے مطلب کی انگریزی یا اردو میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہ ان میں اور ہم میں ایک فرق ہے۔ انگریزی کا کمپلیکس اگرچہ اب کم ہو چلا ہے، مگر ابھی اس کی گرفت ہشت پا کی طرح ہمارے معاشرے کے نظام اور شعبوں پر کلی طور پر حاوی ہے۔ ہمیں اردو بولنے والا بندہ وقار والا نہیں لگتا۔

دوسری طرف اردو زبان بولنے والے اپنی زبان کی نفاست پر اتنے نازاں ہیں کہ وہ پنجابیوں کو عقل کا فائدہ ہی نہیں دیتے۔ ان کو احمق سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ وہ زبان اچھی بول لیتے ہیں، اس لیے وہ اپنے کو زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ یہ وہ مغالطے ہیں، جو مختلف قوموں اور حکایت خیال میں زبان کی استعداد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہم نے زبان کو بطور سٹیٹس سمبل بنایا ہوا ہے کہ جو انگریزی بولتا ہے، وہ بہت تعلیم یافتہ ہے اور جو اچھی نفاست سے اردو بولتا ہے وہ صاحب ذوق ہے۔ اس لیے اقبال پر بھی اس وقت کے اردو والے لوگ بہت اعتراض کرتے تھے کہ ان کی زبان فصیح نہیں ہے۔ انہیں زبان کا پتہ ہی نہیں۔ "ہمیں وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی" میں بھو جی "عار" کو مونث باندھا ہوا ہے۔ یہ کیا ہے وہ کیا ہے؟ اس قسم کے گرامری تناؤ اور تفاخرات اس جاہلانہ منطق کا نتیجہ ہیں کہ اگر زبان فصیح نہیں ہے تو دماغ بڑا گھٹیا ہے۔ وہ زبان کو براہ راست دماغ کی استعداد پر لاگو کر دیتے ہیں۔

اسی طرح انگریزی والا یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو انگریزی نہیں آتی، تو وہ بالکل ہی احمق ہے۔ اس کے پاس دماغ کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ غلط فہمیاں اس معاشرے میں گزشتہ بیس برس سے ہیں۔ پہلے زیادہ تھیں، اب کم ہو رہی ہیں۔

قومی زبان کا کمپلیکس

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نظام تعلیم مربوط نہیں ہوا۔ زبانوں میں ارتباط وجود نہیں پا سکا۔ سائنس سے اردو مترادفات کو پروان نہیں چڑھایا جا سکا۔ مثلاً گیس بننے کے عمل کو اردو میں عمل تصعید کا نام دیتے ہیں۔ صعود کو جانا، بلند ہونا۔ میٹر کا ترجمہ مادہ کرتے ہیں۔ آسان ہے۔ مگر جب

آپ ٹیکنالوجی میں جاتے ہیں، تو اردو میں اس کا اظہار اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات آپ کو انگریزی کے ایک لفظ کے لیے دو اردو کے لفظ استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے جتنے ترجمے دیکھے ہیں، وہ آسان نہیں ہیں، مشکل ہیں۔ اس میں ایک وجہ تو یہ ہے کہ سائنس کی زبان آرٹ کی زبان سے مختلف ہوگی۔ جو زبان ہم انگریزی زبان کے مترادف یا متضاد الفاظ کی صورت میں تیار کریں گے، وہ تھوڑی سی مشکل ضرور ہوگی۔ انگریزی مروجہ زبان ہے۔ اس میں زیادہ مانوسیت پائی جاتی ہے۔ جب تک مسلسل اردو کے الفاظ کو سمجھنے کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا، صورتحال یہی رہے گی۔

اس کے علاوہ باہر سے اطلاعات کا سیلاب آ رہا ہے۔ وہ زیادہ تر غیر ملکی زبانوں میں ہے۔ اگر جرمنی سے ایک آرٹیکل آ گیا، تو ہمارے عقلمند سائنسدان چھٹی کر جائیں گے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ڈھونڈیں گے اور پھر اردو میں لائیں گے۔ ان کو زبان کا یہی مسئلہ ہے کہ انہیں ان کے اردو میں مترادفات دستیاب نہیں ہیں۔ ابھی تک کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی قابلِ تسلیم کوشش نہیں ہے۔ اگر انہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان کے مترادفات یا متخالف اردو الفاظ بنائیں اور ان کو قابلِ اظہار زبان کی شکل و صورت میں ڈھالیں۔ ہم ان کو کورسز میں رائج کریں گے، تو شاید بات آگے بڑھتی بھی۔ چونکہ یہ کسی کورس میں رائج نہیں ہو رہے، اس لیے ان کے کام کا ایک دوسرے پر ڈھیر لگ رہا ہے۔ اردو کو ابھی تک اس قسم کی پذیرائی نہیں ملی ہے۔ وہ باضابطہ طور پر دفتری زبان ابھی بھی نہیں ہے۔ ہر جگہ انگریزی کا چلن ہے۔ جس ملک میں سول سرونٹ کے لیے اچھی اردو جاننا لازم نہ ہو، اس میں کیا پیش رفت ہوگی؟

قومی زبان، اردو یا انگریزی

اردو کے علاوہ ہمارے پاس رابطے کی کوئی اور زبان نہیں ہے۔ رابطے کی زبان صرف بالائی طبقے کی نہیں دیکھا کرتے۔ یہ نہیں ہے کہ سرحد یا سندھ کا ایک پڑھا لکھا آدمی ادھر آ کے انگریزی میں کام چلا لے گا۔ یقیناً، وہ چلا لے گا۔ مگر ایسے کتنے لوگ ہوں گے؟ جب ایک مزدور پیشہ سندھ میں جاتا ہے تو اسے سندھی سیکھنی پڑے گی یا وہ اردو سے کام چلائے گا۔ بالائی سطح پر چند ایک لوگوں کے لیے انگریزی ممکن ہے ٹھیک ہو، مگر نچلی سطح پر عوام کے لیے وہ زبان ہونی چاہیے،

جوان میں رابطے کا کام دے۔ مختلف طبقاتی معاشروں اور جگہوں کو مربوط کرے۔ سو اردو ہی وہ زبان ہے جو سارے طبقات، خیال اور اہل زمین کو اکٹھا کرتی ہے۔

اسی طرح زبان کلچر پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جب کوئی اردو بول رہا ہوتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ مہذب ہے۔ جب انگریزی بول رہا ہوتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ باس ہے۔ وہ کلچرڈ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ایک فرق ہے۔ انگریزی والے کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ شاستہ اور خلیق آدمی ہے بلکہ اس کے بارے میں عوام میں رائے ہوگی کہ وہ بدتمیز اور گنوار ہے جو رعب کے لیے انگریزی مارتا ہے اور ہمیں رعب سہنا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی بڑا یا چھوٹا صاحب اردو بول رہا ہو، تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑا اچھا اور صاف ستھرا شخص ہے؟ اس کی زبان بڑی نرم ہے۔

اردو بلاشبہ ایک مہربان زبان ہے۔ دنیا کی واحد زبان ہے جس میں شائستگی کے بے شمار لفظ ہیں۔ اتنی ادب آداب کی خلیق زبان دنیا میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اردو میں آپ دو چار لفظ استعمال کر کے اس کا مزاج تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ اس میں خاصیت موجود ہے۔ یہ کتنا غلط خیال ہے کہ لشکر کی زبان کو آپ کلچر کی زبان کہیں۔ اس کے باوجود اردو میں اتنا ثقافتی تنوع اس لیے آیا ہے کہ اس کا آغاز ہی کرُسی کے لیے ہوا۔ مختلف الخیال اور مختلف النوع لوگ اکٹھے ہوئے، تو انہوں نے انداز میں نرمی اختیار کر کے دوسرے کو مخاطب کرنا چاہا۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کی شائستہ ترین زبان ہے۔ مگر یہ کہنا کہ یہ زبان صرف دلی اور لکھنؤ والوں کو آتی ہے، غلط ہے۔ انہوں نے صحیح اور مقفع الفاظ استعمال کر کے شائستگی کی زبان کو شاہانہ زبان بنا دیا۔ اب دلی کی زبان کو اس لیے قلعہ معلیٰ کی زبان کہتے ہیں کہ یہ Hyper - Tonned زبان ہے۔ Hyper - Tonned زبان کو ہم وہ اردو نہیں سمجھتے، جو لوگوں میں چلتی ہے۔

یا مثال کے طور پر رنڈیوں کے مزاج کے مطابق کہ امرا بھی اپنی تہذیب کے لیے بچوں کو ان کے پاس بھیجتے تھے۔ غور طلب بات ہے کہ کیوں بھیجتے تھے؟ اس لیے کہ رنڈی ایک ایسی مخلوق ہے، جس نے ہر ایک کو اخلاق سے اندر لانا ہے اور اخلاق سے وداع کرنا ہے۔ وہ ایک ایسی کمرشل زبان تخلیق کر رہی تھی، جس کا مقصد صرف پیسہ تھا۔ آپ یورپ چلے جائیں، آپ کو وہاں رنڈیوں کی زبان ایک جیسی لگے گی۔ اگر آپ نے پیسہ ڈال دیا، تو ان سے سنیں گے Very well done، تھینک یو، Have a nice time اور اگر پیسے نہیں ڈالے، تو وہ چیختے ہوئے آپ پر جھپٹے

گی، Where is money? Hey Man Come over here

یہ ایک طوائف کی زبان ہے۔ کیونکہ طوائف کے کوٹھے پر جانے والے ہر ایک شخص کا پیسے کے لحاظ سے استقبال کیا جاتا ہے۔ جو اس نے کلچر اور زبان استعمال کرنی ہے، وہ ملنے والے پیسے کے مطابق کرنی ہے۔ اس میں رکھ رکھاؤ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بہت سارے طبقات میں گانے بجانے یا سر کے حصے کو ان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ ان لوگوں نے اس وقت کے مسلمانوں کی اعلی سوسائٹی کے ساتھ لکھنؤ میں ربط ضبط استوار کر لیا تھا۔ اس لیے ان لوگوں میں بھی کلچر آیا۔ بلکہ طوائفوں نے خصوصی کلچر تخلیق کر لیا، چاہے ان کے پس پردہ غلاظت کا ایک دریا بہہ رہا ہو۔ مگر ان کی پردہ داری کی ظاہری سطح وہ خوبصورتی، اہتمام اور تنوع کی تھی، جس میں شائستگی اور اخلاق بہت برقرار رہا۔

دلی کی زبان مختلف ہے۔ یہ محکم اور اختیارات کی زبان تھی۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کو غیر مہذب ہونے کا طعنہ دیتے رہتے تھے۔ ان دونوں طبقوں کی زبان ہمیں سوٹ نہیں کرتی۔ پاکستان میں اردو قابل عمل، مستعمل اور صاف ستھری ہو۔ اس میں عمومی ادب آداب ہونے چاہئیں۔ اس میں تعلیم یہی دینی چاہیے کہ آپ اس میں قلعہ معلی کے الفاظ استعمال نہ کریں۔ ''طلسم ہوشربا'' کی زبان دیکھیں، تو آج کے دور میں اس کا ایک صفحہ بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہم لوگوں کی دیوانگی اپنی جگہ، جنہوں نے اس زبان کا مطالعہ کیا یا فورٹ ولیم میں جو انداز اور زبان ڈویلپ ہوئی، وہ اب زیادہ استعمال میں نہیں۔ تاہم اس کا جاہ و جلال اپنی جگہ سلامت ہے۔

وہ ایک ماضی کی بات ہے۔ اب جو اردو ہو، وہ قابل عمل زبان ہو۔ تمام صوبوں اور لوگوں میں یہ رابطے کی زبان ہے۔ یہ ایک خوبصورت زبان ہے۔ اسے بولتے ہوئے انسان کو قلبی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ تذکیر و تانیث کی بحث میں نہ پڑیں، نہ طنز و تشنیع میں، جو اہل زبان کی طرف سے آ رہے ہوتے ہیں۔ اہل زبان اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی حماقت ہے کہ وہ اہل زبان ہیں۔ جو زبان بطور ایک رابطہ زبان کے ترویج پائی ہو، اس میں اہل زبان کون ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی اہل زبان نہیں۔ اہل زبان تو وہ ہے، جس نے گھر بیٹھ کے یا اپنے ماحول کے مطابق اس میں بہت سارے لفظ متعارف کرائے ہوں۔ جسے فارسی اور عربی آتی

تھی اور وہ ایک خصوصی ملغوبہ بناتا رہا ہو۔ اردو ایسی زبان نہیں ہے۔ یہ رابطے کی زبان ہے۔ شروع ہی یہ رابطے سے ہوئی اور اب تک یہ بطور رابطے کی زبان چلی آ رہی ہے۔

پنجابی بولنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ یہ آپ کی مادری زبان ہے اور آپ بڑی فصاحت سے اس میں بول سکتے ہیں، لیکن پنجابی میں جملہ لکھنا بڑا مشکل ہے۔ آپ آسانی سے اردو ہی میں لکھتے ہیں۔ جب آپ اردو کو موقع دیں گے صاف ستھرا بنائیں گے، تو یقیناً یہ ہمیں باہمی رابطے اور تعلق میں مدد کرے گی۔

یورپ سے علم کی واپسی

اب بات وسائل پر چلے گی۔ وسائل ایک خارجی چیز ہے۔ اس کا شاہین کے دماغ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا سائنسدان ایٹم بم بنا چکا ہے۔ ہائیڈروجن اور ایٹم کا ٹیکٹیکل بنا سکتا ہے۔ وہ ہر چیز بنانے کا اہل ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ اگرچہ رئیس ترین ہمارے ہی لوگ ہیں۔ اسلامی امہ اکٹھی ہوتی ہے۔ ہمارے لوگ امت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرح سوچتے ہیں۔ ایک جان کی طرح ہوتے ہیں اور پاکستان، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کو ان کے اپنے اپنے شعبوں میں سپورٹ کرتے، تو ان کی مہارت سے پوری اسلامی امت کو فائدہ ہوتا۔ سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوتا کہ ہمارے پاس ایک طاقت ہے، جو ہر وقت ہمارا ساتھ دے سکتی ہے۔ ہر چیلنج کو قبول کر سکتی ہے۔ اس میں قصور ہمارا اپنا ہے، مغرب کا کوئی قصور نہیں۔

مرض، علاج اور خدا

قرآن حکیم میں اللہ کہتا ہے کہ میں ہی مرض دیتا ہوں اور میں ہی شفا دیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر طرزِ عمل ٹھیک کر لیا جائے کہ ہم مرض اور شفا کس سے منسوب کر رہے ہیں، تو پھر ہمیں صحت کے ساتھ کوئی بنیادی اختلاف نہیں رہ جاتا۔ جیسے کہ اللہ نے کہا، ولا نبلونکم بشی من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس واثمرات میں پانچ چیزوں سے انسانوں کو آزماؤں گا۔ ان میں سے ایک چیز بلا، مصیبت، بیماری وغیرہ ہے۔ ولباسا وضرا وذلزلو کہ ہم نے انہیں بیماریوں سے، سختیوں سے چھوا اور ان کو سخت ترین زلزلوں میں ڈالا۔ حتیٰ کہ وہ پکار اٹھے۔ اے پروردگار کہاں ہے ہماری صحت؟ حضور گرامی مرتبتؐ کی حدیث مبارک ہے کہ اللہ نے تین ہزار بیماریاں پیدا کی ہیں۔ ایک ہزار کی شفا دعا میں ہے، جبکہ دو ہزار کی دوا میں ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر یہ ہماری زیادہ سوچ بچار کی وجہ سے ہمارے اندر کا سسٹم باہم تعاون نہیں کر رہا ہوتا۔ ذہنی تناؤ یا فکری پیچیدگیاں ہمارے بدن پر اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ جلد کے بیشتر مسائل ہماری اپنی سوچوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ امراض سزا کے طور پر آتے ہیں۔ مثلاً آپ زکوٰۃ نہیں دیں گے، تو آپ کو ایک خوفناک بدنی بحران سے گذرنا پڑے گا، لیکن یہ غیر مسلم کے لیے بجا نہیں ہے۔ اگر آپ حدود کراس کر رہے ہیں، تو اس کے نتائج آپ کے بدن پر کسی نہ کسی صورت میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ پھر اس میں

وقفہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے کو ٹھیک کر لیں، توبہ کر لیں، تو وہ مرض دور ہو جاتا ہے۔ اگر نہ کریں اور چلتے چلے جائیں، تو پھر وہ مرض اپنی آخری حدود کو پہنچتا ہے اور اس میں جان چلی جاتی ہے۔

بہت سے امراض موت کا باعث ہیں۔ جیسے خداوند کریم نے آنے اور جانے کے بڑے طریقے رکھے ہیں۔ مگر نارمل طریقہ جانے کا وہ نہیں ہے، جس کو لوگ بیماریوں میں عموی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ انسان بالعموم چاہتا ہے کہ خدا اسے معقول انداز میں زندہ رکھے اور معتدل انداز میں دنیا سے اٹھا لے۔ مثال کے طور پر یہ ایک دعا کی جاتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! موت تک ہمیں ہمارے پاؤں پر رکھنا۔ کوئی ایسی بے بسی اور لاچاری کی زندگی نہ دینا۔ دورِ حاضر میں گردوں اور شوگر کی بیماریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور یہ خالصتاً تشویش اور فکرمندی (Anxiety) کا حصہ ہیں۔ جگر اور ہیپاٹائٹس کی بہت سے لوگوں کی بیماریاں میری تسبیحات سے کم ہوئی ہیں۔ کچھ کے طبی نتائج بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔

یہ انسانی ذہن کی پیدا کردہ بیماریاں ہیں۔ بے حد و حساب خواہشات کی تیزی ان کے سکون و اعتدال کو برباد کر دیتی ہے۔ پھر ہر چیز ان کو بیماری کے رخ پر لے جاتی ہے۔ کچھ یہ عذاب و ثواب کا حصہ ہونے کی وجہ سے بھی ہے۔ کچھ بیماریوں کو اللہ نے باعث ثواب اور کچھ کو باعث عذاب بنایا ہے۔ ایک شخص مثال کے طور پر میرے پاس آتا ہے کہ جی مجھے دم کر دو۔ میں اسے دم نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی منشا یہ ہے کہ جس چیز کی علم و حکمت اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی ہے اور اس کے ذریعے آپ سینکڑوں اور لاکھوں لوگوں کے لیے باعث نفع بنتے ہیں، اس کے لیے ضد کرنا کہ جی دم پڑھو، میں ٹھیک ہو جاؤں، غلط ہے۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بہت سی بیماریوں کا علاج اللہ نے انسان کو بخشا ہوا ہے اور انسان کر رہا ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ میں نے انسان کو حکمت عطا کی ہے اور اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی کہ حکمت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے یوت الحکمة من یشا و من یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا کہ جسے حکمت عطا کی، گویا اسے خیر کثیر عطا کر دیا۔ ڈاکٹر اللہ تعالیٰ کے اسی خیر کثیر کو شیئر کرتا ہے، جو اللہ نے انسان کو دیا ہے۔

ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی میں بنیادی فرق ایلوپیتھک میں تحقیق، تردد، محنت اور بے شمار تحقیقات اور ان کے نتائج کا ہے۔ صرف الیگزینڈر فلیمنگ کی پنسلین بارہ سال کی محنت کے بعد سامنے آئی۔ خدائی علوم اور میڈیکل سائنسز میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ ہم

ان سے اختلاف کرتے ہیں کہ حکمت اور میڈیکل سائنس بغیر کسی مقصد اور منزل کے تعین کے آگے بڑھ رہی ہے بلکہ وہ بعض مسائل جیسے کینسر اور ہیپاٹائٹس وغیرہ پر زیادہ توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ جب اتنی زیادہ سہولتیں موجود ہوں اور انسانی عقل اتنی زیادہ ترقی کر جائے، تو مرض وہ پیدا ہوتے ہیں، جو ناقابلِ علاج ہوں۔ مثلاً اگر ہائپاٹائٹس آ گیا ہے تو میں نے کسی آدمی کو اس کی زد میں آ کر بچتے ہوئے نہیں دیکھا، جب وہ آخری سٹیج میں ہو اور جس کے لیے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جائیں، مرض بھی اپنی جگہ جامد ہو جاتا ہے اور علاج بھی اور وہ بہت آہستہ اور بتدریج سے آگے بڑھتا ہے۔ کچھ ہمارے ڈاکٹروں کی بھی اخلاقی قدریں نہ ہونے یا کمزور ہونے کے باعث، سوائے بہت ہی سپیشلائزڈ میڈیکل شعبوں کے، لوگوں کا اعتبار مذہبی ٹونے ٹوٹکوں پر زیادہ آ گیا ہے۔

سائیکاٹری اور روحانیت

سائیکاٹری تصوف کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس کا آغاز اس بات کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو اپنے آپ کو جانتا ہے وہ دوسرے کو بھی جانتا ہے۔ مگر عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ہاں جتنا کچھ تصوف ہے، وہ اتنا قابلِ فہم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آپ اکثر دیکھیں گے کہ صوفی میں جس چیز کی توقع کی جاتی ہے وہ صوفیا میں نہیں ہے۔ یعنی صوفی کی تمام تر اقدار علم پر مبنی ہوتی ہیں۔ چھوٹے ٹیکنیکل کام کے لیے آپ کو تھوڑی مشق کی ضرورت ہے لیکن جب آپ ریسرچ کو جاتے ہیں، جیسے ایم ایس سی سے پی ایچ ڈی کو اور آپ کو پتہ ہے کہ آپ ایک اعلیٰ ترین قدر تعلیم کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں، جس طرح کسی شخص نے مخلوق سے خالق کو پڑھنا ہو، تو بجا طور پر اس کو اتنی ساری وسعتِ علم اور شناخت چاہیے کہ وہ دینوی علوم سے کچھ قدم آگے جا کر اس بالاتر تفہیم کو پہنچنے کی کوشش کرے، جسے ہم اللہ یا حقیقتِ کبریٰ کہتے ہیں۔

ہمارے پاس اس وقت جو مثالیں نام نہاد صوفیا کی موجود ہیں، وہ زیادہ تر Quakes (مداری) ہیں۔ جیسے سڑک کے کنارے ایک شخص سلاجیت بیچتا ہوا میڈیکل سائنسز کا منہ چڑھا رہا ہوتا ہے، اسی طرح بہت سارے احباب، جو خدا کے نام پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہ توہین مراتب کا باعث بنتے ہیں، کسی کی عزت کا باعث نہیں بنتے۔ کیونکہ صوفیاء میں علم کی قدر کے بغیر خدا

کی شناخت ناممکن ہے اور کسی بھی حال میں ہم کسی بھی صوفی کو لاعلم ہونے کا کریڈٹ نہیں دے سکتے۔

علاج بذریعہ قرآنی آیات

ہر زمانے میں دعاوی تو بہت ہوتے ہیں۔ اس کی مثال میں آپ کو دوں کہ ڈاکٹر اشفاق، جو بےنظیر کے معالج تھے، اس وقت جیتے تھے۔ ان کی بہو کو کینسر کی تکلیف ہو گئی۔ میرے ایک اور عزیز دوست کی بیوی کو بھی کینسر کی تکلیف ہو گئی۔ میں وہاں تھا، انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا، تو میں نے کہا، آپ فوری طور پر آپریشن کرائیں۔ دونوں ایک ہی قسم کے کیس تھے۔ میرے دوست نے ہومیوپیتھی پر انحصار کیا۔ ڈاکٹر اشفاق خود بہت بڑے ہومیو پیتھ تھے۔ اس نے بھی یہ کہا کہ میں اپنی بہو کا علاج ہومیوپیتھی سے کروں گا، لیکن میں نے اسے کہا کہ کبھی بھی ایسا نہ کرنا۔ آپ اس کا آپریشن کرواؤ اور وقت ضائع کیے بغیر فوراً کرواؤ۔ اس نے ایسے ہی کیا۔ ڈاکٹر اشفاق کی بہو اللہ کے فضل و کرم سے بچ گئیں۔ تین سال کے بعد وہ ماشاءاللہ ابھی بھی زندہ ہیں مگر میرے دوست کی بیوی رفتہ رفتہ موت کا شکار ہو گئیں۔

سو اصول یہ ہے کہ جس علم کے پاس تشخص اور شناخت نہیں، وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں علاج کر سکتا ہوں۔ اگر ایک ہومیو پیتھ کو ایلوپیتھک طریقہ تشخیص پر ہی فیصلہ دینا ہے، تو وہ ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ البتہ نارمل چھوٹی چھوٹی چیزیں حکمت میں ہیں، جن سے اب بھی آپ بہتر علاج کر سکتے ہیں۔ اس میں وہ چبھن نہیں ہے، جیسے السر کے ایلوپیتھی طریقہ علاج میں ممکن ہے، جس میں مزید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے معدہ سست پڑ جاتا ہے یا دوائی کے کسی جز سے اس کا معدہ بالکل ہی خراب ہو جائے۔ ایلوپیتھی بھی چھوٹے علاجوں میں بہتر مؤثر ہو سکتی ہے۔ نزلے کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی گولی نے مجھے فوری مدد دی تھی۔ ممکن ہے، ہومیوپیتھی بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں مؤثر ہو سکتی ہو۔ مگر قرآن حکیم میں اللہ کہتا ہے کہ ہم کچھ علوم اکٹھے چلاتے ہیں، جو انسانوں کی بہتری اور فلاح کا باعث ہیں۔ ان کو رکھ لیتے ہیں اور ان کو ترک کر دیتے ہیں، جو فلاح کا باعث نہیں ہیں۔ شروع میں حکمت، ہومیوپیتھی، آیورویدک یہ سب اکٹھے چلتے تھے۔ انہی علوم کی زیادہ عملی اور سائنسی صورت ایلوپیتھی میں آ گئی۔ اب ایلوپیتھی کے ہوتے ہوئے آپ

دوبارہ چھوٹے علوم کو پلٹیں، تو ایسے ہی لگے گا، جیسے ایم۔ اے کرنے کے بعد آپ پانچویں جماعت کی کلاس میں دوبارہ داخلہ لے لیں۔

جوں جوں آبادی بڑھ رہی ہے، لوگوں کے مزاج کے مطابق چھوٹی تکالیف کے لیے آپ ابتدائی علوم کا ضرور آسرا لیں گے۔ مگر جہاں تک پیچیدہ بیماریوں کا تعلق ہے، ان کے لیے میں بالکل تجویز نہیں کروں گا کہ آپ جان بوجھ کر اپنی جان کے دشمن بنیں۔ کسی شخص کو اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

طب نبویؐ کی حیثیت

اس زمانے کے مطابق حضور گرامی مرتبتؐ نے مختلف اوقات میں لوگوں کو کچھ چیزیں تجویز کیں۔ بظاہر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمارے پیغمبر پراگریسو نہیں تھے۔ اب جب پیغمبرؐ فیصلہ دے رہے تھے، تو ان کا اپنا ماحول اور اپنی صورتحال ان کے سامنے تھی۔ وہ اس وقت کے مریض کو بتاتے ہوئے کسی جدید ٹیکنیکل دوائی کا نام استعمال نہیں کر سکتے تھے یا اسی طرح کی کوئی بڑی ٹیکنیکل جزک نیم آف میڈیسن نہیں دے سکتے تھے۔ کلونجی کی آپ نے تعریف فرمائی۔ اسی طرح اور بہت ساری ایسی چیزوں کی، جو اس وقت مستعمل تھیں۔ حضورؐ نے سرجری کروائی ہے۔ پچھنے لگوائے ہیں۔ چنانچہ عمومی جو علم و حکمت ہے، اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے بلکہ حدیث میں آیا ہے جب لوگوں نے کہا، یا رسول اللہؐ پچھلے زمانے میں ہمیں یہ چیز سکون دیا کرتی تھی، تو آپ نے فرمایا، جیسے حکمت انسانیہ ہے، اس پر عمل کرو۔ صرف ایک جگہ پر آپؐ نے ایک شخص کو اسہال پر شہد پینے کی تلقین فرمائی۔ کچھ عرصے بعد اس کا پیٹ اور خراب ہو گیا۔ وہ واپس آیا اور کہا یا رسول اللہؐ! میرا تو مرض اور بڑھ گیا ہے۔ فرمایا، تمہارا پیٹ جھوٹا ہے، اللہ سچا ہے۔ ابھی اس کو استعمال کرتے رہو۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ قریباً وہی بات ORS کے بارے میں ڈاکٹر کہتے ہیں۔ بچے کو جلاب لگے ہوئے ہیں، لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ORS دیتے رہو۔ اس کی کمی نہ آئے۔ چونکہ شہد میں تھوڑا سا انٹی بائیوٹک بھی ہے اور غذائیت بھی، تو آپ کا مطلب تھا کہ شہد دیتے رہو، پیٹ کے فسادات ختم ہونے لگیں گے۔ ORS کی طرح اس زمانے میں آپ نے شہد کے معاملے میں یہی

تلقین فرمائی۔

میڈیسن، روحانیت سے انکار

ایسا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔ میڈیسن لوگوں کے سامنے کیا ہے؟ جب وہ پریکٹیکل چیک کرنے کے لیے جاتے ہیں، تو دیکھتے ہیں، ملتانی بابا یا کوئی جناتی بابا بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اتنے سادہ لوح ہیں۔ جیسے ایک صاحب میرے پاس آئے۔ انہیں پیٹ کی تکلیف تھی۔ کہنے لگے ڈاکٹر سے آرام نہیں آیا۔ میں ایک مرشد گرامی کے پاس گیا۔ انہوں نے زعفران کھانے کو دیا۔ میں نے اسے کہا کہ زعفران کو فوری بند کرو، ہو سکتا ہے کہ تم کہیں بہت ہی آگے نہ نکل جاؤ۔

حقیقت میں جب ہم حقائق کو دیکھتے ہیں، تو میں سائنسدانوں کی سائیڈ پر کھڑا ہوتا ہوں، جو ان تمام ہتھکنڈوں اور وطیروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو یہ مداری مذہب میں استعمال کرتے ہیں۔ ان رجحانات سے لوگوں کے لیے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ Down Syndrom کے بچے، جو بہت کثرت سے ہو رہے ہیں، اس کی بنیاد قطعاً بیماریوں میں نہیں، عورتوں کے رویوں پر ہے، جب بچے پیٹ میں ہوتے ہیں۔ میرے پاس سو فیصد ہسٹری یہ ہے کہ وہ ذہنی دباؤ، پریشانی اور غصے میں ان بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ اپنی سوچ اور پریشان کن خیالات کا اثر ان بچوں پر اس حالت میں پڑ جاتا ہے جو ان کے اندر ہوتی ہے۔

یہ ہسٹری میں نے کنفرم کی ہے کہ جو بچے اس طرح پیدا ہوتے ہیں، ماں کی ذہنی حالت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بعض اوقات کہتے ہیں کہ کزنز کے ساتھ میرج کے باعث کہیں جینٹک ڈسٹربز تو نہیں ہے۔ کزنز میراج تو حضرت آدمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور جہاں کہیں پیچھے کزنز میں سے کسی میں جین کا نقص ہوگا، وہ آگے آئے گا۔ تاہم بے شمار کزنز کی شادیوں میں ایسے مسائل نہیں اٹھتے، لیکن جب ایک فریق میں کوئی نقص آ جائے، تو وہ نقص آگے چلے گا۔ اس کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ کزنز میرج کی وجہ سے ہے۔ بلکہ سلسلہ نسب میں کوئی نقص آ جاتا ہے۔ پھر اگر آپ اس شادی کو محدود تر کرتے جائیں، تو وہ پرابلم بچوں کے لیے مسائل کھڑے کر دیتا ہے۔

خناق کی بیماری اسی لیے نسل سے نسل میں سفر کرتی ہے۔ اپی لیپسی کی بھی یہی صورتحال ہے۔ میرے ایک پرانے دوست کرنل کے دو بچے Down Syndrom کا شکار ہیں۔

ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے منع کیا کہ وہ مزید بچے پیدا کرنے سے باز رہیں۔ وہ مجھے کوئٹہ میں ملے۔ میں نے کہا کہ میں ڈاکٹروں سے اختلاف نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ نقص آپ لوگوں میں ہے۔ میں نے انہیں تسبیح کے لیے کہا۔ تین سال کے بعد وہ ایک اور بچے کے لیے آمادہ ہوئے۔ انہوں نے پھر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ اس کا مشورہ نہیں دیں گے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، میں نے کہا Go ahead اللہ نے انہیں بہت خوبصورت اور نازک بچے سے نوازا۔ ایک عرصہ انہوں نے پوری طرح خدا کی طرف توجہ دی جب وہ ایک اور بچے کی خواہش کرنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ اگر انہوں نے اپنے پچھلے احتساب میں کوئی کمی نہیں کی تو Go ahead جب سات ماہ کا بچہ پیٹ میں ہوا، تو ٹیسٹ پر پتہ چلا کہ سر پھر چھوٹا آ رہا ہے۔ سیریبرم کا ڈایاگرام چھوٹا ہے۔ وہ بڑے گھبرا گئے کہ شاید تیسرا بچہ بھی معذور ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ پہلے جتنی تسبیح کرتے تھے اس سے بہت زیادہ کر لیں اور یہ نہ بھولیں کہ صرف اللہ ہی اس نقص کو دور کر سکتا ہے۔ وہ نقص آٹھویں مہینے کے شروع تک آیا۔ اس کے بعد الحمدللہ دور ہوا اور انہیں اللہ نے بہت صحت مند بچی عطا کی۔

یہ سچ ہے کہ بہت سے امراض جنہیں ڈاکٹر زیا ریسرچرز نے پرکھا ہے، بس صحیح ہیں، لیکن ان کا حل بھی تو کسی کے پاس ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا ہے کہ میں مرض دیتا ہوں اور میں ہی شفا دیتا ہوں۔ بعض اوقات جیسے حضرت زکریاؑ تین سو برس کی عمر میں خدا کی طرف سے ملائکہ نے آواز دی کہ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے، تجھے بچہ ملے گا۔ انہوں نے حیرت سے کہا کہ پروردگار یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ خدا نے جواب میں کہا، زکریا تجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے۔ تجھے تو یہ کہنا چاہیے کہ میرا رب جو چاہے کر سکتا ہے۔ تمام عقیدہ اللہ مکمل اور فائنل اتھارٹی کو ماننے میں مضمر ہے اور اس میں مرض کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ چاہے، تو آپ کی زندگی کم کر سکتا ہے، بڑھا سکتا ہے۔ بلکہ حضور گرامی مرتبت کی حدیث مبارک ہے کہ ممکن ہے دنیا کی عمر آدھا دن اور بڑھ جائے۔ پوچھا گیا، آدھا دن کتنا؟ فرمایا، پانچ سو برس۔ جو اوپر بیٹھا ہوا ہے، وہ زندگی کی پوری سکیم کو پانچ سو برس بڑھا سکتا ہے۔ کتنی بے شمار نسلیں پانچ سو برسوں میں آئیں گی۔ کتنے ان کے بندوبست ہوں گے۔ ان کے لیے رزق چاہیے۔ روٹی پانی سارا کچھ چاہیے۔ اس کے لیے یہ چیزیں کتنی معمولی ہیں۔

پیغمبروں نے جو معجزے دکھائے ہیں۔ خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے اس طرح کے معجزے نہیں ہیں۔ وہ صرف طاقت کا مظاہر ہیں۔ ان سے لوگوں کو Hard- Basis حل ملتا ہے۔ مثلاً آج آپ کو Diffusion اور Fusion پر پہنچنے کے لیے کھربوں روپے کے کمپلیکسز چاہئیں۔ تب کہیں جا کر آپ ایک دھات کو الیکٹرانکس کو شعاعی وجود میں تبدیل کر کے کسی دوسری جگہ لے جائیں گے۔ مگر ایک وہ شخص ہے، جس کو سپر کمپیوٹر کی چابی حاصل تھی۔ جس کو اسم اعظم کہتے ہیں۔ جس کو کتاب کا علم حاصل تھا کہ وہ زبان سے دو لفظ ادا کرتا ہے اور تختِ سبا Diffuse ہو کر سیکنڈ کے اٹھارویں ہزار حصے میں وہاں پہنچتا ہے۔ دوبارہ Fuse کر کے اسے تخت کی صورت دی جاتی ہے۔ انسانیت یقیناً اس سٹیج تک پہنچے گی، لیکن اسے بہت ہی مشکل اور سخت مراحل سے گذرنا پڑے گا۔

لوگ کہتے ضرور ہیں کہ ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں، مگر یہ وہ یقین نہیں ہے، جو اللہ کو چاہیے۔ تمام عقیدہ الفاظ سے عملی روپ دھارتا ہے۔ میں ساری زندگی بہت زیادہ سگریٹ نوشی سے ڈرتا رہا ہوں۔ میں نے گیارہویں، بارہویں کلاس سے سگریٹ پینا شروع کیا اور اس میں تقریباً چالیس برس گذر گئے ہیں۔ اس وقت میں ساٹھ برس کا ہوں اور میڈیکل کے اعتبار سے میں نے اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ میں ڈرگز کے باعث بیمار ہونے کی کئی وجوہ کو مانتا ہوں، لیکن میں تمام زندگی اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اس خطرے سے محفوظ رکھنا۔ میں لیکچر میں جاتا ہوں، اس میں مجھے بارہ بارہ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ چھ چھ گھنٹے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ میں کبھی تھکاوٹ سے دو چار نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ وہ میری دیکھ بھال کر رہا ہے اور بعض ایسی چیزوں کے شر سے بھی اللہ بچاتا ہے۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ آگ کی نیچر بدل سکتا ہے، تو جس شخص کو بھی اللہ پہ بہت یقین ہوگا، اعتماد ہوگا، وہ اسی طرح اشیاء کی نیچر کو بدل سکتا ہے۔

جیسے خالد ابن ولیدؓ کے پاس جنگ میں ایک دشمن آیا، کہ حضرت میں اپنے ساتھ زہر ہلاہل لایا ہوں کہ اگر آج صلح نہ ہوتی، تو میں اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے سامنے زہر پھانک لوں گا۔ حضرت خالدؓ ہنس پڑے اور اس سے کہا، دکھانا، وہ زہر کون سا ہے۔ اس نے زہر کی پڑیا نکالی۔ حضرت خالد نے مسکرا کر کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ زہر زندہ نہیں رکھتا ہے، زہر مارتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور آپ نے زہر کی وہ پڑیا کھا

لی۔ وہ دشمن اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ وہ انتظام میں تھا کہ ابھی یہ گریں گے اور مر جائیں گے جبکہ حضرت خالدؓ طویل عرصہ تک زندہ رہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ آخری زندگی حضرت خالدؓ نے جو سخت بیماری اور کرب میں گذاری ہے، خدا نے اس وقت تو زہر کو اپنا اثر دکھانے سے روک دیا تھا، لیکن وہ اسی زہر کی وجہ سے اپنی عمر آخر میں جا کر فوت ہوئے۔

دور کیوں جاتے ہیں۔ افغانستان کی حالت کو دیکھیں کہ ایک عقیدے کا ایک سادہ سا لیول ہے جس نے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی کا مقابلہ کیا۔ بہت ہی سمپل لیول تھا۔ میں نے طالبان کی مذہب کی تعبیر سے کبھی اتفاق نہیں کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے ماحول اور اپنے خیال کے مطابق مذہب کی بنیادی تعبیر کی تھی۔ ٹوپی رکھنا اسلام میں لازم نہیں۔ خواتین پر اپنی بالادستی رکھی اور وہاں کی عورتوں نے اسے اس لیے قبول کر لیا کہ یہ وہاں کا عمومی رویہ ہے۔ میں ان کے نظریاتی سطح کے اس تناظر کی جدوجہد کو Appreciate نہیں کرتا۔ اگر میں طالبان کا عقیدہ اختیار کروں، تو میں اسلام کا دفاع نہیں کر سکتا، اس تمام تنقید کے خلاف جو مغربی اسکالر اسلام کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اسلام اس تنقید کا سامنا کر سکتا ہے۔ مگر طالبان کا عقیدہ اس کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔

اس کے باوجود وہ انتہائی سادہ سا عقیدہ اتنا جارحانہ تھا کہ اس پر اتنے زیادہ ٹیکنالوجیکل حملوں کے باوجود انہوں نے اس کی مزاحمت کی۔ یہی پاور اگر کسی میدانی علاقے میں استعمال ہوتی، تو چند دنوں میں ہر چیز ختم ہو چکی ہوتی۔ مگر وہ لوگ اس کے باوجود کہ انہیں کہیں سے بچاؤ کا امکان نظر نہیں آتا تھا، انہوں نے ایک عرصہ مزاحمت جاری رکھی۔ اس میں خدا کی یہ حکمت بھی ہے کہ ایک بہت بڑی متکبرانہ قوت کا اضمحلال جاری ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس عرصہ بعد امریکہ اندر سے ٹوٹ جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔

کلینیکل ڈیتھ، سہل موت

پہلے تو یہ تعین کرنا پڑے گا کہ کلینیکل ڈیتھ کس کو کہتے ہیں۔ نارمل حرکت قلب بند ہو جانے کے باوجود جب تک دماغ ڈیڈ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر حضرات کلینیکلی کسی کو مردہ ڈیکلیئر نہیں

کرتے۔ اصولاً اس وقت کلینکلی ڈیڈ ڈیکلیئر کرتے ہیں، جب اس کے ذہن میں برقیاتی رو ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے روس میں دل کی موت کے پانچ منٹ کے بعد بھی مختلف طریقوں سے مریض کو دوبارہ زندگی میں لے آیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کلینکلی ڈیتھ اس کو کہتے ہیں، جہاں کسی مریض کا مزید علاج ممکن نہیں، لیکن اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کا مزید علاج ممکن نہیں ہے یا اس کا وقت بھی مقرر کر دے کہ دو چار چھ سال یا دو چار مہینے یا دو چار چھ دنوں کے بعد مریض مر جائے گا۔ مزید اس کا علاج ممکن نہیں، تو یہ صرف انسان اپنی بہترین استعداد کے باوجود اپنی نا اہلیت کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس قسم کے تمام امراض میں جہاں کسی مریض کو ایک لمحہ آخر کی بشارت دیتا ہے وہاں وہ یہ اعتراف بھی کر رہا ہوتا ہے کہ میرے پاس اس سے بہتر علاج یا طریقہ علاج ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم اس کی مزید کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اب جیسے کومے کی صورتحال ہے۔ بعض لوگ کومے میں پندرہ اٹھارہ برس جیتے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ کی بھی مثال موجود ہے۔ عملی طور پر تو وہ آدمی ایک مردہ ہی ہوتا ہے مگر چونکہ زندگی کے آثار اس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کو خوراک مل رہی ہوتی ہے اور وہ زندہ ہوتا ہے اس لیے لوگ اس کو زندگی سے فارغ نہیں کرتے۔

اس میں دو طریقے ہیں۔ جیسے ابھی میرے خیال میں سویڈن میں ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ کیا، یا اجازت دے دی کہ جو لوگ زندگی سے قطعی مایوس ہوں یا ان میں دوبارہ پلٹنے یا احیا کا خیال ہی ختم ہو جائے، تو وہاں ان کو موت کے حوالے جان بوجھ کر کرنا اس کے زندگی کی طرف سے اس کا علاج کرنے سے بہتر ہے۔ امریکہ میں بھی ایک ڈاکٹر کو اسی لیے سزا ہوئی ہے کہ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں نے مرنے کو آسان کیا ہے۔ ڈاکٹر کسی بھی صورت میں مرنے کو آسان کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ یہ ان کے ضابطہ اخلاق میں شامل نہیں ہوتا۔ جہاں وہ دکھ، درد اور عذاب کو سہل کرتے ہیں اور شدید ترین تکلیف میں مریض کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں ان کے طبی مقاصد میں شاید شروع سے لے کر اب تک یہ قانون شامل نہیں ہے کہ موت کو سہل کیا جائے۔

فرض کریں ایک شخص کی موت نظر آ رہی ہے تو جو صاحب یقین ہے جس کو اللہ پر

اعتبار ہے، وہ اس ایک نکتے کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ خدا جب چاہے کسی کو دوبارہ احیا پذیر کر سکتا ہے۔ زندگی کی طرف لا سکتا ہے۔ اب اس میں دیکھا بھی گیا ہے کہ بعض اوقات ایک آدمی دس سال کے قومہ کے بعد ٹھیک ہو گیا ہے۔ سال یا مہینے کے بعد درست ہو گیا۔ مدتوں کا بڑھنا یا کم ہونا کوئی ایسا یقینی عمل نہیں ہے، جس پر کوئی میڈیکل سائنس فیصلہ دے سکے۔ سو میرے خیال میں انسان اگر علاج سے بے بس بھی ہو جائے، تو بھی ایک امید کو جو اللہ کے ساتھ ہے، منقطع کرنا کسی ڈاکٹر کی خوبی کا باعث نہیں ہو سکتا۔

میڈیسن سے زندگی کا اختتام

کم از کم انسان کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا میں زندگی کا خالق ہوں یا مالک ہوں؟ جیسے پیدائش کے وقت اسقاطِ حمل کو سختی سے مذہب ممنوع قرار دیتا ہے۔ اسے قتل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے، جس میں زندگی بھی اپنی فارم طے نہیں کر چکی ہوتی۔ ایک پراپر فارمیشن میں نہیں آئی ہوتی۔ اس کے باوجود پروردگارِ عالم قرآنِ حکیم میں کہتے ہیں کہ اولاد کو رزق یا کسی اور خوف سے مارنا قتل کے مترادف ہے۔

اسی طرح فرض کریں ایک شخص کی بیماری یا قومہ یا اس کا موت کے قریب پہنچنا اس کے خاندان یا لواحقین کے لیے ایک قابل آزمائش عرصہ ہے۔ ایک ایسا وقت ہے، جس میں بہن، بھائی، بچے سب آزمائے جا رہے ہیں، اسی ایک موت کی وجہ سے یا قریب المرگ حیثیت کی وجہ سے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کے ان اعمال کی نفی کر رہے ہیں، جو دوسروں کے لیے اس نے مرتب کیے ہیں۔

کوئی بندہ اس وقت تک دنیا نہیں چھوڑتا، جب تک اس کی وجہ سے لوگوں کی آزمائش نہیں ہو جاتی اور اس کی اپنی آزمائش پوری نہیں ہوتی۔ سو یہ عرصہ حیات چاہے صحت یا بیماری کا ہو۔ مرگ کا ہو، ایک ایک لمحہ مخلوقات کے آپس میں جڑے ہوئے جذبات کی آزمائشوں کا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر بسترِ مرگ پر پڑا ہے اور وہ مرنے والا ہے، اس کے مرنے کا پورا یقین بھی ہے، تو اس کے ساتھ جو دوسرے زندہ لوگوں کی قرابت ہے، وہ آزمائی جا رہی ہے۔

فرض کریں، ایک شخص ماں کی زندہ لاش لیے بیٹھا ہے۔ اس کو ایک آس ہے کہ یہ شاید بچ جائے اور جب تک زندگی کی وہ معمولی ترین آس موجود ہے، وہ اپنی ماں کی خدمت کر رہا ہے۔ چنانچہ اس آدمی کے ثواب وعذاب کا راستہ آپ نہیں روک سکتے۔ اس لیے کسی بھی حال میں مریض

کو مارنا مذہبی یا عملاً ایک انتہائی غلط قدم ہے۔ یہ ایک ایسی بے حسی سائنٹفک دنیا میں ممکن ہے جہاں آپ آبادی کے ذخائر اور آبادی گن رہے ہیں اور آپ کو لگتا یہ ہے کہ اگر ایک ہزار سے بارہ سو لوگ ہو جائیں گے، تو زندگی تنگ ہو جائے گی۔ چنانچہ دو سو لوگوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ یہ ذخائر اور آبادی کے اس تناسب کو کم کرنے کے مشینی طریقے آزمائے جائیں گے۔ اس کے بعد یہ بوڑھے اور بیڈ پر پڑے مریضوں کی خصوصیت نہیں رہے گی۔ اس ایک بات کی اجازت دے دیں تو پھر مجھے پوری امید ہے کہ دنیا میں اپنی فالتو آبادی کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے ڈھونڈیں گی۔ اس سے جرمنی کی گیس چیمبرز کی داستانیں بھی فرسودہ ہو جائیں گی۔

از خود زندگی کا خاتمہ

بالکل نہیں۔ جنگ بدر کا واقعہ ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اصحاب نے کہا کہ وہ بہت شدید جنگ کے بعد زخمی ہے۔ وہ تو جنتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بلکہ جہنمی ہے۔ اصحاب نے فرمایا، یا رسول اللہؐ! ہم نے اس کو دیکھا ہے، اس نے اتنے سارے کافروں کو قتل کیا ہے اور وہ بڑی دلیری سے لڑا ہے۔ ہمیں تو گمان ہے، وہ جنتی ہے۔ فرمایا، نہیں جہنمی ہے۔ اصحاب تجسس میں اس شخص کے پاس گئے۔ اس نے درد کی تاب نہ لا کر تیر سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ خودکشی کر گیا۔ اس کے باعث حضورؐ نے اسے جہنمی قرار دیا۔

یہ اتنی واضح حدیث ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے، وہ دو اسباب کے تحت کرتا ہے۔ ایک تو اللہ سے قطعی مایوسی ہے۔ وہ حقائق کو اپنی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس حقیقت کے تحت اس کا صبر کم ہو گیا ہے۔ وہ اللہ پر کوئی امید نہیں رکھتا کہ اللہ اس کے درد یا تکلیف کو کم کرے گا۔ اس لیے خودکشی کرتا ہے اور چونکہ قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے کہ اللہ سے مایوسی کفر ہے، تو وہ بندہ اس وقت حالت کفر میں چلا جاتا ہے جب وہ اپنی زندگی کو خدا کے بغیر خود ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا ایک طریقہ وہ پاگل پن ہے، جیسے کوئی Psychosis یا Neurosis ہے۔ جہاں ذہن مفلوج ہو جائے، وہاں اس پر ویسے ہی شرعی گرفت اٹھ جاتی ہے۔ اس مرحلے کے بارے میں تو کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ باہوش و حواس اپنی زندگی ختم کرنا صریحاً کفر ہے۔

برصغیر کی تقسیم نامناسب

مجھے کوئی شخص برا نہیں لگتا۔ کوئی ہستی ایسی نہیں، جس کے ساتھ میں گذر بسر نہ کر سکوں۔ مگر بد قسمتی دیکھیے کہ اس ذہنی سطح پر مجھے ہندو قطعی طور پر نا قابل برداشت لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہندو اور ہندو مت کو شرف انسانیت کی تذلیل سمجھتا ہوں۔ مجھے محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے دو بلین سال پرانا ثقافتی رویہ ان مہذب لوگوں کے باطن میں چھپا ہوا ہے۔ ان کی رجعت اتنی کڑی اور اتنی شدید ہے کہ آج بھی آپ ان کا کلچر دیکھیں، تو پتھر کے بتوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس قدر ذہنی ایج اور کلچر کے باوجود ان کی بنیاد قطعی بے لوچ، پست اور اتنی غیر عقلی ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان نہیں لا پاتے۔ اس صورتحال میں وہ مسلمان کے لیے کس قدر فراخدل ہو سکتے تھے یا ہو سکتے ہیں؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ان کا وہ رویہ ابھی تک سلامت ہے تو ہم کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

دوسری بات یہ کہ انگریز جان بوجھ کر ایسی کمپلیکس قوم چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ ہندو بڑی آسانی سے اس پر قابو پا لے۔ انگریز کی نظر میں ہندو زیادہ تصنع والا تھا اور یہ ان کا فراڈ تھا کہ وہ اپنی جبلت کو بڑی نفاست کے ساتھ نئے رویوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ آج بھی ان کا وہی رویہ ہے۔ جو کچھ ہم ان کے بارے میں ٹی وی پر دیکھتے ہیں، حیران کن نہیں ہے۔ They are over conscious of the fact that they have no religion. Hindusim is no religion.

(وہ اس حقیقت پر بہت حساس ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہیں۔ ہندومت کسی مذہب کا نام نہیں)

مگر ہندو یہ بات کہنا نہیں چاہتا۔ وہ رسم و رواج اور ممنوعات سے اپنی آشنائی کو آپ پر مسلط کرنا ضرور چاہتا ہے۔ مثلاً پوچھیے کہ تم بت کیوں پوجتے ہو تو کہے گا، علامت ہے، ورنہ پوجتے تو ہم اسی خدائے واحد کو ہیں۔ اب اس صورتحال میں ہم تو قطعاً ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ پاکستان اجماع امت کے نتیجے میں بنا ہے۔ یہ سائنس دانوں یا فلاسفروں کے کہنے پر نہیں بنا۔ اجماع، حضور اکرم کی حدیث ہے کہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اور یہ دیکھیے کہ تمام علماء نے اس وقت پاکستان کی مخالفت کی۔ یہ واحد امت ہے کہ جس کی امت درست سوچتی ہے اور اس کا عالم غلط سوچتا ہے۔ اجماع امت کے نتیجے میں چھبیس کروڑ انڈیا اور دس کروڑ جو بنگلہ دیش میں مسلمان نظر آتا ہے، نے پاکستان بنایا ہے۔ اجماع امت یہ تھا کہ چاہے ہم انڈیا میں رہیں، لیکن ایک خطہ ایسا ہونا چاہیے اب ہم کہتے ہیں کہ ہم نے ایک کی بجائے دو مسلم ممالک بنا لیے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مسلمان ممالک نہیں ہیں۔ مسلہ یہ ہے کہ جس دن پاکستان بنا ہے اسی دن ہم نے اس کمٹمنٹ سے غداری کی اور فرار اختیار کیا ہے، جس کا نعرہ تھا، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ!

ہمارے پاس دو حل ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک مولوی کا اسلام ہے، جو خوفناک ہے۔ دوسرا سیکولرازم ہے، جو اسلام کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ پچاس سال کے دوران عوام کو ذرہ برابر چانس نہیں ملا کہ وہ کوئی کردار ادا کر سکیں۔ اگرچہ موجودہ نظام سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔ تاہم ایک لوکل سسٹم میں جان بوجھ کر میں نے حصہ لیا۔ صرف اس غرض سے کہ میں کم از کم ایک اسلامی ادارے کی ابتدا کر جاؤں۔ میں نے ان کے سامنے کمٹمنٹ کی کہ میں اپنی یونین کونسل میں صدقات کا اجرا کروں گا۔ جس روز میرا کزن انتخابات میں کامیاب ہوا، ہم نے اسلامی صدقات کی ابتدا کی۔ اس صدقات فنڈ میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ ہم روزگار کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ سات ہینڈ پمپ لگا بیٹھے ہیں۔ بجلی کے بے شمار پول نصب کروا چکے ہیں۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہیں اور ہم نے اسی فیصد وعدے پورے کر لیے ہیں۔ اس علاقے میں میرا ایک اسسٹنٹ کمشنر دوست آ گیا۔ وہ بھی مجھ سے ایک ٹیچر اور اللہ سے بندگی کی حیثیت میں کمیٹڈ تھا۔ یہ شہر کھنڈر تھا۔ ہم دونوں نے شہر کا دورہ کیا۔ گورنمنٹ کی جانب سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملی۔ آپ اس شہر کا چکر لگا کر دیکھیں،

آپ کو ہر جگہ مضبوط سڑکیں نظر آئیں گی۔ آپ کو ترقی کا لوگوں تک پہنچتا ہوا اثر محسوس ہو گا۔

سچ یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم بنیادی مسئلے کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے محلوں میں نوجوان کثرات سے تسبیح پڑھتے نظر آئیں گے۔ یہ بھی غلط ہے ہمارے پاس ان کے لیے کوئی نوکریاں نہیں ہیں مگر ان کو صبر کی کیفیت تو حاصل ہے۔ ہم انہیں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو اللہ کے فضل سے ایک اتحاد تخلیق کر کے ضرور بتاؤں گا، جسے آپ دینی تحریک کہہ سکیں۔ اس میں مولوی کا نہیں، اللہ کی رحمت کا اثر ضرور نظر آئے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم گریز کرتے بہت دور چلے گئے ہیں۔ پاکستان بننے کا فیصلہ صحیح تھا۔ پاکستان کو خراب کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد نہیں ہوتی، اس کے مولوی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بڑے لوگوں اور رہنماؤں پر ہے۔ اس کی کرپٹ لیڈر شپ پر ہے۔

پاکستان، راہِ فرار

اگر آپ کی بات کو ٹیکسٹ کے حساب سے لیا جائے، تو بات سو فیصد درست ہے مگر اسلام یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا کو فتح کرو، اس پر قبضہ کرو، جہاد بنیادی طور پر ایک ایسا دفاع ہے جس میں آپ چھوٹی سی جگہ میں اپنا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کو محفوظ نہیں پاتے۔ اس کے خلاف مسلسل جارحیت ہو رہی ہے، تو آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ اس جارحیت کا مقابلہ کریں، ان کے ساتھ لڑیں۔ اس میں بھی اللہ میاں نے کہا کہ لڑو، مگر اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔ اسلام میں دارالامن اور دارالحرب کا کانسپٹ ہے۔ وہ لوگ انڈیا سے ادھر نہیں آئے، لیکن پاکستان بنانے پر ان کے دل آمادہ تھے۔ اس پر ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے لحاظ سے وہاں ٹھہرنا زیادہ بہتر خیال کیا۔ پھر اتنے زیادہ اخراج عوام کی ایک نئی جگہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ بہت سارے مسلم لیڈر یہ خیال کر رہے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا، تو ایک سائیڈ کے دارالامن کی وجہ سے ہمارے پاس ہر وقت ایک Way out رہے گا کہ پاکستان جا سکیں۔

دوسرا ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح اگر ہم سارے لوگ یکجا رہے، تو اکثریت غلبہ حاصل کر کے اقلیت کو بالکل ختم کر دے گی۔ جیسے اب ہماری دو ریاستیں پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں بن گئی ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ انڈیا میں کچھ ہوتا ہے، تو اس کا جواب پاکستان اور بنگلہ

دیش باہر دے سکے گا۔ اس طرح انہیں اپنی حفاظت کے لیے ایک مضبوط لیوریج مل گیا ہے۔ انڈیا میں ذرا سی گڑبڑ ہوتی ہے، تو حکومت پاکستان اور حکومت بنگلہ دیش اس پر احتجاج کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں سے سیاسی اظہارات و بیانات سے انہیں امن قائم کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہندووانہ فلاسفی تو مکمل فنا کی قائل ہے۔ اس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جتنی بھی مذہبی تحریکیں ہندوستان میں اٹھی ہیں، وہ مکمل طور پر ختم ہوگئی ہیں۔ چاہے وہ جس فرقہ یا مذہب کی تھیں، کوئی مذہب سوائے اسلام کے ہندومت میں پھل پھول نہیں سکا۔

اسلام صرف اپنے واحدانی نظریے کی وجہ سے زندہ رہ گیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی خدا کے تصور پر مصالحت اختیار نہیں کرتا۔ دو خداؤں کا تصور اسلام میں نہیں۔ یہ اتنا سائنٹیفک کانسپٹ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے لیے خوب جم کر لڑائی کی، اس کا دفاع کیا۔ ایک ہزار سال کے تصادم کے باوجود اسلام ان کے قبضے سے بچ نکلا۔ آپ آئیڈیل ازم کو کسی موقع پر بھی الزام نہیں دے سکتے۔ آپ کو اپنے آپ کو موردالزام ٹھہرانا چاہیے۔ آپ اپنے وعدے سے مکر گئے ہیں۔ آپ کو نظریے نے کوئی فریب نہیں دیا۔ یہ نقص میرا، آپ کا اور ہر اس بندے کا ہے، جس نے اپنے عہد کے ساتھ کمٹ کیا تھا، لیکن اسے پورا نہیں کیا۔ آج بھی ہم اتنے منافق اور جذباتی لوگ ہیں کہ ہمارا سیکولر حکمران بھی اوپر چڑھ کر یہی کچھ کہتا ہے۔

ہمیں زندگی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ خیال کی حد تک ہم کسی چیز سے کمیٹڈ ہیں۔ اگر ہم اپنے مذہب سے کمیٹڈ اور نظریاتی تشخص سے متفق نہیں ہیں، تو اس میں کس کا قصور ہے؟ اس میں آئیڈیا کا نہ ملک کا قصور ہے۔ اسرائیلیوں کو دیکھ لیں، وہ اپنے جیوش لینڈ کے ساتھ کس قدر کمیٹڈ ہیں کہ بیسیوں مسلمان ملکوں کو انہوں نے نکر پر رکھا ہوا ہے۔ ان کے بالمقابل مسلمان ممالک کو بمشکل قوم پرستی سے باہر نکلے ہیں۔ کون بچائے گا، تو اس نے کہا امریکہ۔ یہ نہیں کہا، ہمیں خدا بچائے گا۔ یہ ہمارے اپنے ایمان کی بات ہے۔ خداوند کریم نے جب وعدہ کیا ہے کہ ولا تھنو کہ سستی نہ کرنا میرے بارے میں ولا تحزنو اور غم نہ کرنا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین مجھے اپنے عزت وجلال کی قسم ہے، تم ہی غالب رہو گے، اگر ایمان والے ہوئے تو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مومنین نہیں ہیں۔ ہمیں بلا تکلف یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم میں مومنین سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہم وہ ایمان ظاہر نہیں کر رہے ہیں، جس سے خدا ہمیں انفرادی یا اجتماعی طور پر برکت اور عزت

دے۔ مجھے یہ سو فیصد یقین ہے کہ اگر ہماری ترجیحات درست ہو جائیں، تو کوئی طاقت پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ ہم اسلامی دنیا کی قیادت کرنے کے پابند ہیں۔

پاکستان کا مسئلہ

پاکستان کا مسئلہ بدعہدی، غداری اور خدا کے دین سے بھاگنا ہے۔ پاکستان سے اللہ بالکل خوش نہیں۔ بنی اسرائیل کے ضمن میں اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے مجھ سے کہا کیا، نبھایا، بخش دیا۔ انہیں اپنی سرزمین پر اتارا اور ان کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں چلائیں۔ مگر جب یہ پلٹ گئے، تو میں پلٹ گیا۔ جب آپ کو مصیبت تھی، عذاب تھا، ہندوؤں اور انگریز کی غلامی سے نکلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ وجوہات اور بھی تھیں۔ آپ کے پاس نوکریاں اور رزق کم تھا۔ آپ کے اکابر کے لباس آپ کے چپڑاسی پہن رہے تھے۔ آپ کو روز ذلت و رسوائی سے روشناسی دی جا رہی تھی۔ آپ کا کوئی نعرہ اتنا موثر نہیں تھا کہ آپ کو جمع کر سکتا۔ پھر سب نے مل کر نعرہ مارا،

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

اس وقت شیخ العرب والعجم اور شیخ الہند اور از خود بڑے بڑے خطاب یافتہ لوگ موجود تھے۔ برصغیر میں بہت تھے۔ تو مرا حاجی بگو من ترا ملا بگو۔ ایک دوسرے کی تعریف میں صفحے کالے کر رہے تھے۔ بڑے بڑے علماء ظاہر و باطن موجود تھے مگر ایک شخص جو نہ بکنے والا تھا، ان میں کوئی نہ تھا۔ مکر و فریب کا جال تانا اور بنا ہوا تھا۔ موہن داس کرم چند، اپنے وقت کا ناپ انٹلکچوئل گنا جاتا تھا۔ تمام امرائے اسلام اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتے تھے۔ یہ لوگ اس قابل نہیں تھے کہ خدا ان کی طرف، جو آج بڑے بڑے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، آنکھ بھی اٹھا کر دیکھتا۔

اس کے برعکس جس کی ظاہری زندگی میں بظاہر کوئی اسلام نہ تھا۔ جو مغربی ماحول میں پلا بڑھا اس نے شاید سور بھی کھایا ہو، شراب بھی پی ہو، اس کی زندگی میں کوئی ایسا قرینہ نظر نہیں آتا تھا کہ اس کے باطن میں چھپا ہوا ایک کٹر ترین اور اپنے موقف پر اڑا ہوا سخت ترین مومن موجود ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا، قائداعظم، یہ تو اتنی محنت جو کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے؟ اس نے کہا، میں صرف ایک کام کے لیے کر رہا ہوں۔ میں مرنے کے بعد اللہ کے پاس جاتا ہوں، تو مجھے اللہ یہ کہے کہ Well done Mr.Jinnah! اس کی جوابدہی صرف اللہ کے ساتھ تھی۔ وہ کسی اور کو

جوابدہ سمجھتا نہیں تھا۔ لارڈ ویول نے جب اسے کہا

Muhammad Ali One can become the Lieutenant Governor of India, why cannot another be? (محمد علی اگر ایک ہندوستان کا گورنر بن سکتا ہے، تو ایک اور کیوں نہیں ہم آپ کو لیفٹیننٹ گورنر بناتے ہیں۔) انہوں نے ٹوپی اٹھائی اور دوڑ لگا دی۔ وہ پیچھے پیچھے بھاگا، مسٹر جناح، مسٹر جناح۔ انہوں نے کہا،

Your Lordship, I have not come to bargain on my national interest, (جناب میں اپنے قومی مفادات پر سودے بازی کے لیے نہیں آیا)

پھر اللہ نے انہیں اٹھا لیا کہ جو اس کا کام تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ شاید بنانے کے بعد وہ سارے پیٹرن کو چلا نہ پاتا کہ وہ اسلام سے اتنا واقف نہ تھا۔ قانونِ اسلام سے واقف ضرور تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ دنیا میں اپنا کیس بہت اچھی طرح پیش کر کے رخصت ہو گیا۔ آنے والوں نے نہ صرف اس سے اور پاکستان سے غداری کی، بلکہ ملک اسلام سے غداری کی۔ اب خدا کہتا ہے کہ مجھ سے پلٹ جاؤ گے، تو میں پلٹا ہوا ہوں۔ جب تم میری طرف لوٹو گے، تو میں بھی تمہاری طرف لوٹ آؤں گا۔

برصغیر میں دو بڑے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے۔ ایک سیکولر، دوسرا مولوی۔ مولوی نے اتنے بڑے مابعدالطبیعیات مذہب کو انتہائی پست درجہ خیال میں قید کر دیا۔ جدھر چلے جاؤ، رسم و رواج کے سوا اسلام کہیں نظر نہیں آتا۔ اسلام کی نفیس ترین قدر جستجوئے پروردگارِ حق ہے۔ وہ اس وقت سرے سے غائب ہے۔ اب خدا کی بجائے سکولوں (مکاتبِ فکر) کی پرستش کی جاتی ہے۔ خداوند کریم بڑی وضاحت سے کہتا ہے۔ ان الذین فرقوا دینھم...... جن لوگوں نے اپنے اپنے دین کے پیٹرن بنا لیے۔ فرق کیا، وکانو شیعاً اور گروہ بنا لیے، لست منھم فی شیٔ، اے پیغمبر! تو ان میں سے کسی میں بھی نہیں۔ نہ پیغمبر دیوبند میں ہے نہ بریلوی میں ہے۔ پیغمبر تو اجماعِ امت کے سینے میں ہے۔ جو بظاہر گناہگار اور کمزور لگتے ہیں، مگر آج بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔ اسی کے بارے میں اقبال نے کہا کہ شیطان مولویوں سے نہیں ڈرتا۔ سیاستدانوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ البتہ وہ اس فاقہ کش سے ڈرتا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

یہ وہ سادہ سا آدمی ہے، جو گلی کوچے میں ایک سادہ سا ایمان لیے پھرتا ہے۔ وہ فلسفہ خداوند سے آگاہ نہیں ہے۔ مگر وہ روح محمدؐ سے سرشار ضرور ہے۔

پاکستان، تعمیر میں خرابی

یہ بھی اللہ کا اصول ہے، آپ کا نہیں ہے۔ جب بنی اسرائیل سے نجات کا وعدہ کیا گیا اور عسکائیل نبی کے زمانے میں ان کے بڑے لوگ اکٹھے ہوئے، تو انہوں نے ہیکل سلیمانی میں جا کر بت رکھے اور وہ اس پر بحث کر رہے تھے۔ ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں۔ خدا نے جبرائیل امین کو عسکائیل نبی کے پاس بھیجا، جو قوم کی جگہ معافیاں مانگ رہے تھے۔ ان کو اٹھایا کہ چلو، ہیکل کے اندر جا کے دیکھو۔ تم جن کے لیے معافیاں مانگ رہے ہو، وہ کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے جا کے دیکھا کہ وہ بتوں کی جگہیں بنا رہے تھے، اور بحث و مباحثے میں مصروف تھے کہ کس کا گولڈ اور کس کی چاندی فکس کرنی ہے۔ ممکن ہے، اب بتوں کے نام تبدیل ہو گئے ہوں۔ اب ہمارے بت ذرا مختلف قسم کے ہوں۔ اس کے نتیجے میں ان پر بڑی طویل غلامی آئی اور پھر حضرت دانیالؑ نے ان کو احیاءِ نو بخشی۔

آپ غور کریں کہ ہم نے ایک وعدہ کیا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس ملازمتیں اور کام نہیں تھے۔ ہمیں بڑی ذلت نصیب ہو رہی تھی۔ انگریز ہمیں ہر حال میں رسوا کر رہا تھا۔ مالی طور پر ہم بڑے پریشان حال تھے۔ چپڑاسیوں اور منشیوں کے ہمارے کام تھے۔ لیبر اور جوتے پالش کا کام مسلمان کرتے تھے۔ اس سے لگتا تھا کہ برٹش ایمپائر ایک محارب مسلمان قوت کو رسوا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمارے پاس ایک سو ایک وجوہ برٹش اور ہندو کے خلاف بغاوت کی تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی وجہ بھی امت کو اکٹھا کرنے کا باعث نہ بن سکتی تھی۔ جاب، عزت، حیثیت نہ ہی پارلیمنٹ ان کے اکٹھ کی بنیاد بن سکی۔ جو بات ان کے کام آئی، وہ تھی پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الا اللہ یہ وہ نعرہ تھا، جس نے ہر مسلمان کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ صبح و شام اس کا رولا ہوا۔ جو فرنٹ لائن پر سلوگن آیا اور جس نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا، وہ اسلام تھا۔ اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ یہ اسلام ہے جو ہر دفعہ مسلمانوں کی مدد کو آتا ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اسلام کی مدد نہیں کی۔ اسلام نے ہی ہمیشہ مسلمانوں کی مدد کی۔

جب پاکستان بن گیا، تو سب سے پہلے کوشش ہم نے اپنی کمٹ منٹ سے علیحدگی کی کی۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم پلٹ جاؤ گے، تو میں پلٹ جاؤں گا۔ تو لوٹ آؤ گے، تو میں لوٹ آؤں گا۔ اپنے عہد سے پلٹنے کا یہ نقص ہوا کہ پاکستان کبھی اطمینان میں نہیں پڑا۔ آپ میں سے بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں خدا کے کچھ بندے ہیں، جن کی وجہ سے ملک قائم ہے۔ میں سمجھتا ہوں، پاکستان قائم تھا، ہے اور انشاءاللہ رہے گا بھی، لیکن خدا کی ناراضگی اس سے کبھی بھی نہیں ہٹے گی۔ یہ خدا کی ناراضگی کا ثبوت ہے کہ ہم کبھی امن میں نہیں رہے۔ ہماری معیشت کبھی نہیں سنوری۔ کیونکہ خدا ایسے لوگوں کی پروا نہیں کرتا، جو اس کے ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دیتے ہیں۔ ہم نے بہت بڑا عہد توڑا ہوا ہے۔ اب بھی جب کبھی اسلام کا نام آتا ہے، تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کس کا اسلام؟ دیوبندی، اثنا عشری، وہابی، کس کا اسلام؟ حالانکہ یہ بہت معمولی سوالات ہیں۔ سیکولرسٹ کی نیت یہ ہے کہ مسلمان کبھی یکجا نہ ہوں۔ سیکولرسٹ ہی اس حکومت پر رول کرتا آیا ہے اور وہ بہت ہوشیار ہے۔ آپ کا پورے کا پورا ماحول مل کر بھی ایک ہوشیار سیکولر کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ بہت ہوشیار اور بہت ذہین ہے۔ اگر مذہب میں توازن اور شائستگی نہیں ہے، تو یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔

ایک آدمی اندلس اور ماریشس کے ساحل پر اترتا ہے۔ عرب ہے، اس کی زبان بھی اجنبی ہے۔ اس کا کیا کلچر ہوگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک شہر کو تبدیل کر دیا۔ ملک میں اسلام پھیلا دیا۔ انڈونیشیا میں چار بندے اترتے ہیں اور انہوں نے اترتے ہی سارا انڈونیشیا مسلمان کر دیا۔ ہم میں وہ کلچر نہیں رہا، جو بنیادی اسلامی کلچر ہے۔ اسلامی بندے کو کیا لگے کہ جب وہ قرآن میں **لا اکراہ فی الدین** پڑھ کر باہر کافر کو اس کی آزادی دیتا ہے، لیکن مسلمان بھائی کو نہیں دیتا۔ یہ کیا کلچر ہے، جو اسلامی کری ایٹ کرتا ہے۔

مذہب نے کہیں بھی پگڑ باندھنے کے لیے کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کر رکھا۔ کہیں بھی ننگے سر پر سب وشتم نہیں ہوئی۔ اکثر اصحاب رسول، رسول اللہؐ کے زمانے میں ننگے سر نماز پڑھتے تھے، اور جو واحد حدیث آئی ہے، وہ ننگے سر پر آئی ہے۔ اس کو حدیث مشعر کہتے ہیں۔ اس وقت کنگھ کے بھی بندوبست نہیں تھے۔ جب وہ سجدے میں جاتے تھے، تو ان کے بال آگے پڑتے تھے اور سجدے کے عالم میں ہی انہیں سنوارنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ معشر کو چھوڑ دو، مشعر کو چھوڑ

نے فرمائی کہ فراست مومن سے ڈرو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ہم یہاں کس کے پاس فراست مومن یا علم کہہ سکتے ہیں؟ کس کو کہیں گے کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے؟ ہمارے علماء کرام الا ماشاء اللہ اکیڈیمک سے آگے سوچتے ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھ کر ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ میں کہتا ہوں، ان کا بھی طرز فکر ٹھیک ہے مگر وہ پرائمری کلاس سے آگے جانے کے قابل نہیں۔ آپ ان کی مدد سے اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھا سکتے ہیں۔

پاکستان، ایک نیشن سٹیٹ

حقیقت میں ہمارے ہاں زمین سے تعلق کا مذہب میں کوئی تصور نہیں۔ بلکہ آپ اگر ایک مشہور مثال دیکھیں کہ طارق بن زیاد جب اندلس کی سرزمین پر اترا، جسے اقبال نے بڑے مشہور اشعال میں لکھا۔

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است

کہ یہ کیا آپ نے بے عقلی کی، کہ اب ہم واپس پلٹنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، کیا کیا کہ ساری کشتیاں جلا دیں۔ تو اس کا جواب تھا۔

دوریم از سواد وطن باز چوں رسم
ترک سبب ز روح شریعت کجا رواست
خندید دست برد بہ شمشیر خویش، گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

بالعموم مسلمان کا نظریہ یہی رہا ہے کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔ تازہ ترین ریسرچ کے حوالے سے دیکھیں کہ ہمارے جینز کس سے جا کر ملتی ہیں؟ ہم سب کا یہاں Survivalists arrival ہے۔ جب ایک بہت بڑے عالم دین نے یہ کہا تھا کہ ملتیں اوطان سے بنتی ہیں، تو اقبال نے اسلام کے فلاسفر کے طور پر اس پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

بہ مصطفےٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کبھی نیشنلسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ایک زمین اس لیے بے پناہ عزیز ہو سکتی ہے کہ خدا نے ہمیں یہ زمین اپنے اپنے مسلک اور خیال کی تائید کے لیے دی ہے۔ اس لیے ہم اس زمین کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کا پورا پورا دفاع کر رہے ہیں۔ ہم زمین کے اس تختے کے لیے اس لیے جان دیں گے کہ یہ ہماری نہیں، بلکہ یہ خدا کا انعام ہے، جو اس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ اس ملک سے ہماری وابستگی اور محبت بڑی لازم ہے، لیکن جب میں اسلام کے حوالے سے مسلمان کو دیکھتا ہوں، تو پاتا ہوں کہ ہم اچھی طرح تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ہر وہ کوشش جو اسلام کو مزید کمزور کر دے، ناقص ہے اور اس چیز کو ہم کبھی بھی اسلامی رویہ نہیں سمجھ سکتے۔ پوری اسلامی دنیا میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا کہ ہمیں اتنا طاقتور ضرور ہونا چاہیے کہ ہم مغرب کی بالادستی کے مقابلے میں ڈٹ سکیں۔

(افغانستان کے حوالے سے) ہماری حکومت نے جو فیصلہ کیا، اس میں حکومت غلط تھی، مگر اجماع کی نمائندگی ہو گئی۔ ہم کسی بھی جنگ کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ہمارے پاس پناہ گاہیں نہیں تھیں۔ ہم تو چٹیل میدان میں بیٹھے ہیں۔ ذرا سی تند و تیز ہوا بھی پورے ملک کو بہا لے جا سکتی ہے۔ ہماری حکومت سمیت مسلم ملکوں کی حکومتوں نے مغرب کو برابری کی سطح پر جواب دینے کا کبھی نہیں سوچا۔ پاکستان واحد ملک ہے، جسے اس پوزیشن میں آنے کے لیے کہ وہ مغرب کو جواب دے سکے، کم از کم تین سے پانچ سال چاہئیں۔ اس میں اتنی ذہانت اور گنجائش ہے کہ اگر آپ 35 سو میل تک مار کرنے والا میزائل بنا سکتے ہیں، تو آپ انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک میزائل بھی بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں، تو ہم پاکستانیوں نے ابھی کیا ہی کچھ نہیں۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری مسلم دنیا کے لیے قربانی دیتے آ رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بھوکا رکھا۔ ہزاروں مسائل سہے اور ہم نے ایک ایسی سمت میں پیش رفت کی ہے، جس میں کسی اور مسلم ملک نے پیش رفت نہیں کی۔

لوگوں کو اس بات کا شعور نہیں دیا گیا کہ ہم اتنی بڑی قربانی کس لیے دے رہے ہیں۔ جب ہم دوسرے مسلمان ملکوں کے حالات دیکھتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے کہ انہیں بھی احساس نہیں

ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے، جس میں کبھی بھی قوم پرستی اتنی مضبوط نہیں ہوئی کہ ہم اسلام کو بھول گئے ہوں۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کے جذبات بڑے خالص اور صاف ستھرے ہیں۔ مگر علم کی کمی کی وجہ سے ہم نیچے آئے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں پر ذلتیں اور پڑنے والی ماریں غلط نہیں ہیں۔ اب عراق بھی عمومی اسلامی تصور کی طرف پلٹا ہے۔ اس سے پہلے تو صرف بعث کمیونسٹ پارٹی تھی۔ اس نے تبدیل ہو کر اسلامی تشخص اختیار کیا ہے۔ اس تمام بحرانی عرصے میں کس نے اس کی مدد کی ہے؟ پاکستان اس کی ادویات اور دیگر ضروریات کے حوالے سے ہر ممکنہ طریقہ سے امداد کر رہا ہے۔ کیونکہ پاکستان میں جو کچھ بھی ہے، ایک خالص اسلام ضرور ہے۔ مذہب کے لیے جو جذبات پاکستان میں ہیں، کسی عرب میں نہیں ہیں۔ مثلاً اسلام سعودی عرب کا قبائلی مذہب ہے۔ مذہب ان کے ایک قبیلے کی اقتدار میں رہنے میں مدد کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اتنی بے پناہ دولت ہے کہ ایک انگریز نے کہا تھا، جہاں تیل ہے، وہاں مسلمان ہیں اور جہاں مسلمان ہیں، وہاں تیل ہے۔

ان تمام ابتدائی ممالک میں اگر کوئی بھوکا ننگا پھرتا ہے، تو وہ پاکستان ہے۔ ہم کیوں مغرب کی جانب دیکھیں؟ ہم پر بہت دباؤ آ گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ہمیں جو مسلسل ذلتیں مل رہی ہیں، وہ ہمیں اکٹھا ہونے کی سوچ پر مجبور کر رہی ہیں۔ امید ہے، چند ماہ کے اندر مسلمان کم از کم ایک ملک کو اتنا سپورٹ کریں گے اسے مضبوط بنائیں گے کہ وہ جواب دینے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد حدیث مبارک کے مطابق اسرائیل کا نام و نشان مٹ جائے گا اور دجال سے براہ راست لڑائی بھی ہو گی۔ میں نے اپنی ایک تقریر ''فتنہ آخر زماں'' میں کہا تھا 2005ء میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو جائے گی اور 2002ء میں ایک دو ایسے بڑے واقعات ہوں گے کہ اس کی بنیاد پڑ جائے گی۔

پاکستان میں اسلام

آپ کسی بھی گروپ میں چلے جائیں، وہ بالآخر ایک بڑے گروپ کا حصہ بن جاتا ہے۔ میں بڑی سختی سے اس موقف پر قائم ہوں کہ میری زندگی صرف ایک شناخت پر آئے کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ اس سے آگے میں کسی بھی قسم کی گروہی مناسبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں انھی

خطوط پر کام کر رہا ہوں۔ تنظیم میں تو لوگ گنے جاتے ہیں۔ میں الحمد للہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے احباب گنے نہیں جاتے اور مجھے یقین ہے کہ جتنی بڑی تعداد میں لوگ تبدیل ہو رہے ہیں، سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جو اپنے معاشروں اور سیاسی نظاموں میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بہت بڑھ گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بڑی بڑی کامیابیاں بخشی ہیں مگر (1) میں بطور استاد بہت زیادہ ہجوم میں گھر گیا ہوں۔ (2) میرے ساتھ عام آدمی وابستہ ہے۔ (3) میں منتظم نہیں ہوں۔ میں ابھی تک اسی طرح ہوں، جیسے میں نے آغاز کیا تھا۔ (4) میرے پاس ہر قسم کے فنڈز اور اشیاء کی کمی ہے۔ سوائے، اس کے کہ خدا مجھے مہمان نوازی کا خرچ دے، میں عام طور پر ٹیلیفون بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود میرا اپنا یہ یقین ہے کہ مجھ سے خدا نے اتنی عنایت فرمائی کہ لاکھوں لوگ میرے ساتھ وابستہ ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ تبدیل ہو رہے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہیں وہ آرمی میں ہیں، چاہے سول سروس کے لوگ ہیں۔ کوئی ایک ٹیچر ایسا نہیں ہے، جس کے ساتھ اتنا ایلیٹ وابستہ ہو۔ فوج کے تقریباً پچاس فیصد افسر، اسی طرح پچاس فیصد سے زائد سول سرونٹ اور پچاس فیصد سے زائد پولیس آفیسر میرے ساتھ وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر بے شمار ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مجھے تقویت دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ترجیحات کو نئے سرے سے سیٹ کر رہے ہیں۔ یہ انقلاب کا نہیں، تدریج کا سلسلہ ہے۔ اس کے مقابلے میں تمام مذہبی لوگ، جو پہلے سے موجود ہیں، ایک ایسا انقلاب ملک میں لانا چاہتے ہیں، جس کی خدا کبھی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی انقلاب کے تمام داعی ایک بات بھولتے ہیں کہ کوئی انقلاب اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں آ سکتا اور اللہ کی مرضی ان کے ساتھ شامل حال نہیں۔

یہ ایک مسئلہ ہے جو کبھی بھی اسلامی جماعتوں نے نہیں سمجھا۔ طاقت کا نشان سب کے ساتھ وائرس کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ یہ اس بات کو سمجھتے نہیں کہ طاقت کے نشے والے کو خدا کبھی اقتدار نہیں دیتا۔ پھر وہ اپنی اتنی بڑی امانت ان کے سپرد کیسے کر سکتا ہے۔ یہ تو اس کو دوسرے دن تہ و بالا کر کے ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیں۔ یہ ساتھ (افغانستان میں) اسلام آیا، قبائلی نظام اور مذہب کو اسلام کے نام پر پیش کیا جاتا رہا۔ ہاں میں یہ کہوں گا کہ کچھ قبائلی لوگوں نے اپنے سسٹم میں دو چار اسلامی شقیں شامل کیں۔ کون کہتا ہے کہ اسلام پگڑی باندھنے پر زور دیتا ہے۔ تعلیم نسواں کو روکتا ہے یا بند کرتا ہے؟ کون کہتا ہے کہ اسلام نے اتنا سخت پردہ رکھا ہوا ہے کہ تم باہر

ہی نہیں نکل سکتے؟ یا بوڑھیوں پر اللہ نے پردہ رکھا ہوا ہے؟ جیسے چاہیں چلیں، وہ ماں کہ چادریں سنبھالتی پھریں۔

دوسرا ایک طبقہ ہے، جن کو انسان میں ٹھوڑی کے اگے ہوئے چند بالوں کے ساتھ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر وہ بال اگے ہوئے ہیں، تو آپ کو صحیح مانتے ہیں۔ اگر نہیں ہیں، تو تم جو چاہے کرلو، تم مسلمان نہیں ہو۔ محمد رسول اللہؐ نے ایک بدتمیز ترین کلاس اٹھائی۔ وحشی، بے تمدن، جاہل مطلق، رنج دینے والے، آزاد پیشہ اور جنگلی۔ ایسی بدتمیز کلاس پہلے کسی استاد کو نہیں ملی اور ایسا خوبصورت، حسن مروت والا استاد بھی پہلے کسی کو نہیں ملا۔ بائیس برس تعلیم دی اور بدترین لوگوں کو کائنات کے بہترین انسان بنا کر ابھارا۔ یہ استاد ہوتا ہے۔ یہ استادی ہے۔ چھڑی ماری نہ گالی دی۔ سرزنش کی زبان پر کوئی بوجھ ڈالا۔ بس محبت ہی محبت بانٹی اور ان وحشیوں کو ایسا متمدن اور خوبصورت کر دیا کہ کہاں وہ ابوجہل اور کہاں اصحاب رسول۔ یہ معجزہ تعلیم ہے۔

اور اب کلاشنکوفوں سے گھیرنے، مارنے اور تعصّبات گہرے کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ مسلمان کو تعصب سے کیا غرض۔ جو آغاز ہی لا اکراہ فی الدین سے کرتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں، وہ کہاں سے تعصب پالے گا؟ اسلام کہتا ہے کہ جس نے مسلمان بھائی کو مارا، قتل کیا، وہ دونوں جہنمی ہیں۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہ! مقتول کیوں؟ فرمایا کہ اس کے بس میں ہوتا، تو وہ بھی اس کو قتل کر دیتا۔ کیا ان کو سادہ سی حدیث کا نہیں پتہ، جو نعرے مارتے ہوئے کلاشنکوفیں لے کر باہر نکلتے ہیں اور بندے مار دیتے ہیں؟

پاکستان کا مستقبل

حضورؐ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی۔ فرمایا، جب زمین پر ایک بھی شخص اللہ اللہ کرنے والا نہ رہےگا۔ پاکستان ابھی خوش قسمت ہے کہ یہاں ابھی بہت سارے لوگ اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ اس لیے اس پر قیامت نہیں ٹوٹے گی۔